مضامین طنزومزاح وانشائیے

شب نوردیاں

کلیات شب انصاری

www.urduchannel.in

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

نام کتاب	:	شب نوردیاں (کلیات شب انصاری)
موضوع	:	مضامین طنزومزاح اانشائیے
مصنف	:	شب انصاری
اصل نام	:	انصاری شہزاد بخت خورشید احمد انجینئر
ایڈیشن	:	اول
پتہ	:	۲۳۸ معاملے دارگلی نیو وارڈ، مالیگاؤں
کمپوزنگ	:	شہباز بخت، مالیگاؤں
صفحات	:	۴۶۴
تعداد	:	پانچ سو
سن اشاعت	:	۲۰۱۸ء
طباعت	:	پرنٹ ورلڈ آفسیٹ پریس، مالیگاؤں
قیمت	:	/روپئے

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے"

رابطہ مصنف : شہزاد بخت خورشید احمد انجینئر (شب انصاری)
۲۳۸، نیو وارڈ، معاملے دار گلی، مالیگاوں، پن کوڈ ۴۲۳۲۰۳ ضلع ناسک۔ مہاراشٹر

شبؔ انصاری کی تصنیفات پر

جناب شبیر آصفؔ کا تبصرہ

شب انصاری نے اپنی تینوں تصنیفات ''ہوئے جی کے ہم جو رسوا''، ''نمک پاشیاں'' اور ''ایک تبسم کے لئے'' مجھے مرحمت فرمائیں۔ ؎ کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا۔

آپ کی کتب کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ یہ طنز و مزاح کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ آپ نے ان میں انشائیے بھی شامل کئے ہیں ان میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی آمیزش ہے۔ اس طرح آپ کے اس مجموعۂ مضامین کا عنوان اسم با مسمی ہے۔ مالیگاؤں میں نثر لکھنے والے زیادہ نہیں ہیں اور مزاح لکھنے والے تو اور بھی کم ہیں۔ یہی صورت حال All Over ادب کی ہے۔ رتن ناتھ شرسارؔ سے مجتبیٰ حسین تک ہم کتنے نام جٹا سکتے ہیں؟ مالیگاؤں کے معدودے چند مزاح نگاروں میں ایک آپ ہی ہیں جن کی ''نمک پاشیوں'' کو میں نے بالاستیعاب اور بہ طیب خاطر پڑھا ہے۔

آپ میں طنز و مزاح لکھنے کا Talent ہے اور آپ کا طرز تحریر بھی رواں دواں ہے۔ میرے خیال میں ایک دردمند دل اور مہذب دماغ ہی مزاح نگاری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ یہ اوصاف ماشاءاللہ آپ میں ہیں۔ لہذا آپ اپنی سعی مشکور کو جاری رکھیں۔ مسلسل مشق و مزاولت، مطالعے و مشاہدے سے آپ کے طرز تحریر کو جلا ملے گی اور اس میں مزید پختگی آتی جائے گی۔ میرے خیال میں آپ کے بیشتر مضامین علم نافع کے حامل ہیں۔ جن کا ثواب آپ کے بعد بھی آپ کو ملتا رہے گا۔ لہذا کوشش کیجئے کہ یہ مفید خلائق تحریر زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچے۔

آپ نے مذکورہ عنوانات پر کمال کمال کے اشعار بھی شامل تحریر کئے ہیں جن کی

www.urduchannel.in

بدولت آپ کے بیان کو مزید وسعتیں ملتیں ہیں۔ غالبؔ سے آپ نے کافی استفادہ کیا ہے۔ آپ کے مضامین کے بیشتر عنوانات غالب کے مصرعوں سے ماخوذ ہیں۔ بین السطور میں آپ نے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں لیکن افسوس کہ بیشتر اشعار میں غلطیاں در آئی ہیں۔ شعر کا معاملہ تو یوں ہے کہ زیر، زبر کے فرق سے بھی سب زیر و زبر ہو جاتا ہے۔

؎ مصرعوں کے انتخاب نے رسوا کیا ہمیں۔

''ہوئے جی کے ہم جو رسوا''، ''نمک پاشیاں'' اور ''ایک تبسم کے لئے'' مزاحیہ ادب کی بلا شبہ اہم دستاویز ہیں۔ جن میں آپ نے صدق دل اور اخلاص نیت سے ہمارے معاشرے کی کمیوں اور خامیوں کو نہ صرف یہ کہ اجاگر کیا بلکہ اس کی دکھتی رگوں پر نشتر زنی بھی کی ہے کہ ''فاسد مادے'' خارج ہو جائیں اور فساد خون کا خاتمہ بالخیر ہو جائے۔

فقط آپ کا۔۔۔۔۔۔۔ شبیر آصفؔ، مالیگاؤں

شہزاد بخت (شبؔ) انصاری
کی مزاح نگاری وانشا پردازی

مبصر: محمد ارشد محوی، مالیگاؤں

(مؤظف استاذ، مالیگاؤں جونیئر کالج، مالیگاؤں) رابطہ:9226958499:

شہزاد بخت (شبؔ) انصاری پیشے سے ٹیکسٹائل انجینئر اور اردو ادب سے اتنا گہرا لگاؤ۔ شب انصاری کی تحریروں کو پڑھ کر ایک خوش گوار حیرت کا احساس ہوا۔ بے شک طنز و مزاح اور ظرافت زندگی کی علامت کے ساتھ ساتھ کسی زبان کی نشونما و ترقی کے لئے ازحد ضروری ہے۔ مزاح نگار باتوں باتوں میں لطیف طنز و چٹکیوں کی مدد سے اپنا مدعا نہایت آسانی سے بیان کرتا ہے۔ اور اصلاحی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہوئے معاشرے کی اصلاح کرتا ہے۔ یہ ایک مشکل امر ہے کہ کسی کی خامیاں بیان کر کے اس انداز میں اصلاح کرنا۔ گویا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

قبل ازیں میں نے کہا کہ شب انصاری سائنس کے طالب علم رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی تحریروں میں سائنسی تحقیق اور منطقی انداز کا عنصر بھی شامل ہے۔ آپ کتاب کے عناوین سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کا تجزیہ بڑے عمدہ انداز میں کیا ہے۔ قصے کہانیوں، فرضی واقعات نیز کرداروں کا سہارا نہ لیتے ہوئے اپنی تحریر کو انہوں نے حقیقی و منطقی انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ مزاح نگار اپنے ماحول، حالات واقعات، خرابیوں اور برائیوں کا تجزیہ اپنی شگفتہ بیانی اور لطیف طنز و مزاح کے نشتر چلا کر ماحول کی شگفتگی کو قائم رکھتا ہے۔ شاید یہی مصنف کا اعجاز تحریر ہے۔

www.urduchannel.in

مزاح نگاری میں مخالف کی کردارکشی، دلآزاری، تذلیل و توہین، تحقیر و ہجو اور دشنام طرازی سے ادب کا معیار و سطح پست ہو جاتے ہیں۔ شب انصاری نے ان علتوں سے پرہیز کرتے ہوئے ایک شائستہ و شگفتہ ادب کا معیار قائم کیا ہے۔

علاوہ ازیں ان کی تحریروں میں سلاست، روانی، زبان پر مکمل عبور، حالات حاضرہ پر چابک دستی سے تبصرہ سماج و معاشرے کی خامیوں پر ہلکے تیر و نشتر اور طنز و مزاح سے اشارہ یہ تمام باتیں ان کی تحریر کا خاصہ ہیں۔ طنز و مزاح ان کی فکری پرواز میں رچ بس گیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک کامیاب مزاح نگار کی شناخت رکھتے ہیں۔ اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ۔ ان کلمات کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔اللہ حافظ

فقط دعا گو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد ارشد محوی

ایک تبصرہ۔۔۔بذریعۂ پوسٹ کارڈ

کسی مداح نے یوں بھی کرم فرمائی کہ کام تو خوب کیا مگر نام مخفی رکھا۔ایسے بھی منکسرالمزاج حضرات ہیں جو آئندہ برسوں میں آپ کو صرف موزیم میں نظر آئیں گے۔پوسٹ کارڈ پر درج ذیل تحریر بتاریخ ۱۶رفروری ۲۰۱۰ کے روز احقر کو روانہ کی۔جس کے لئے میں سراپا سپاس گذار ہوں۔

جناب انصاری صاحب!۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم!!

فروری ۲۰۱۰ کے ماہنامہ 'بیباک' میں آپ کا مضمون ''ہوئے جی کے ہم جورسوا''بہت ہی خوب اور آج کل آنکھوں دیکھے واقعات پر مبنی بہت ہی دلچسپ اور مزاح سے بھر پور ہے۔جس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ویسے آج کل خاص کر جو Shopping Malls اور Fast Food Culture کی جو بھرمار اکثر شہروں میں ہوگئی ہے۔نتیجہ ظاہر ہے ایک ایک نت نئے واقعات ومشاہدات دیکھنے میں آرہے ہیں۔جو کہ آپ نے بہت ہی اچھے اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔اب کیا کریں؟ آج کل کا معاشرہ ہی کچھ ایسی ہی چیزوں کا عادی ہوگیا ہے۔ویسے خاوند کا رول ہوتا ہے بڑا ہی نازک اور غیر یقینی حالات میں بہت ہی صبر آزما اور درد ناک ہوتا ہے۔جسے ہمارے حیدرآباد میں ''زندہ طلسمات''جس کو ہر مرض کی دوا کہا اور مانا جاتا ہے۔اس طرح ہر درد کے تانے بانے سہنے اور برداشت کرنے کی شہ کو آپ نے 'شوہر' سے موسوم کیا ہے۔آپ کے لئے یہ کہوں گا کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

فقط۔آپ کے مضمون کا مداح

www.urduchannel.in

ہوئے جی کے ہم جورسوا

پیش لفظ

آپ نے اکثر میلوں کی سیر کے دوران ایک دوکان ''شیشہ گھر'' ضرور دیکھی ہوگی۔ جہاں مقعر ومحدب آئینوں کے امتزاج سے ایسے آئینے نصب ہوتے ہیں جن میں ناظرین کو اپنا عکس کبھی موٹا دبلا ٹیڑھا میڑھا، بدہیئت اور مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ جن سے چہروں پر تبسم اور کھلکھلاہٹ پھوٹ پڑتی ہے۔ زیرنظر کتاب بھی قارئین کی تفریح طبع کی ایسی ہی ادنی کوشش ہے جس میں انسان کی عادات واطوار، فطری جبلت اور رجحانات ومیلانات کے مختلف پہلوؤں کی پرمزاح عکاسی کی گئی ہے۔ بیانیہ میں جا بجا طنز کے نشتر بھی احساس پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔ مشمولات میں طنز و مزاح کے مضامین کے ساتھ انشائیے بھی شریک ہیں۔

آج کے پرفتن دور کی گہماگہمی میں ایک مقابل جاتی اژدھام کی شکل اختیار کرلی ہے۔ انسانی مشینی دور سے زیادہ ہمہ اقسام کی کشمکش کے سبب ذہنی طور پر نفسیاتی دباؤ کے حصار میں ہے۔ انسان کے چہرے سے خوشی چھین لی گئی ہے پھر بھی شاعر نے رہنمائی کردی کہ

کیا ہوا، گر خوشی نہیں بس میں
مسکرانا تو اختیار میں ہے

زیرنظر کتاب قاری کو کچھ دیر آزاد ہوا میں سانسیں لے کر شگفتہ پرمزاح اور لطیف تحریروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرے گی۔ معروف شاعر شبیر حسن جوش ملیح آبادی

غنچے تری سادگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا!

www.urduchannel.in

فنی اعتبار سے مضامین طنز ومزاح میں نشانہ یا تو اکثر وبیشتر مصنف کی اپنی ذات ہوتی ہے یا کوئی اہل خانہ، شناسا یا کوئی فرضی کردار کے گرد واقعیت کے تانے بانے سے شگفتہ تحریریں بُنی جاتی رہی ہیں۔ میں نے واقعیت کے زینے کو پھلانگ کر اپنے احساسات، جذبات، رجحانات و میلانات کو تجربات ومشاہدات کی کسوٹی کی رسی پر معلق رہ کر اگلے منزلے پر جست لگانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ میں اپنی مساعی اور تجربات میں کس قدر کامیاب یا ناکام ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ میں جملہ قارئین، مبصرین، ناقدین، سامعین، اور ارباب حل وعقد اور اصحاب نقد ونظر کے سپرد کرتا ہوں۔ امید کہ اپنی بیش قیمتی آرا سے مستفید فرما کے ممنون فرمائیں گے۔

اخیر میں اس کتاب کی ترتیب وتدوین، کتابت وطباعت اور پیشکش کے سلسلے میں سب سے پہلے میں اپنے معبود وخالق حقیقی کی بارگاہ عزوجل میں سجدۂ شُکر وامتنان بجالاتا ہوں۔ اس کے بعد میں استاد محترم کا احسان مند ہوں جنہوں نے لڑکھڑاتے قدموں کو سوئے منزل گامزن کیا اور مجھے اپنے منتشر الفاظ کو معنویت کے جامے پہنانے کا شعور سکھایا۔ میں مقامی طور پر تہہ دل سے ممنون ہوں صدر وارا کین ادارۂ نثری ادب، انٹرنیشنل افسانچہ فاونڈیشن، انجمن محبان ادب، بزم سخن، انجمن ترقی پسند مصنفین، انجمن ارتقائے ادب، ادارہ ادب اسلامی، انجمن ناموس ادب، اسکس لائبریری، اردو لائبریری، فنکار اکیڈمی وغیرہ کا جنہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع عنایت فرمایا اور خاطر خواہ پذیرائی کی۔ ان کی حوصلہ افزائی نے مجھے بال وپر عطا کئے۔

مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کی اشاعت کے سلسلے میں ماہنامہ بیباک (مالیگاؤں)، سہ ماہی بین الاقوامی صدا (کشمیر)، سہ ماہی عالمی کارواں (کشمیر)، دو ماہی فنون (اورنگ آباد)، سہ ماہی طنز ومزاح (بنگلور)، ماہنامہ ۔۔۔(۔۔۔) ان کے علاوہ مقامی ہفت روزہ اخبارات

ترجمان اردو، ہفت روزہ بیباک، ہفت روزہ محاذ مالیگاؤں، روزانہ تیسرا محاذ ہفت روزہ عوامی آواز اور ڈیلی ڈسپلن کا ممنون ہوں جنہوں نے میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو شائع کر کے مجھے اعتبار بخشا۔ میں ذاتی طور پر اپنے مخلص دوست ڈاکٹر یوسف خاں صابر اور ڈاکٹر ابو اسامہ (ابن آدم) اور ممتاز ادیب و شاعر و مزاح نگار جناب آصف بختیار سعید صاحب کا بھی سراپا ممنون ہوں۔

اس کتاب کی آرائش و زیبائش، کمپوزنگ اور ڈیزائیننگ کے فرائض ادا کرنے میں محمد عمران صاحب (الفردوس کمپیوٹرس) اور سرورق کی دیدہ زیب نگارش کے لئے پینٹر عبدالرشید آرٹسٹ صاحب کا بھی شکرگذار ہوں۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے میں جناب محمد یوسف نورالہدیٰ صاحب مالک ہفت روزہ ترجمان اردو، نور پبلکشنز، ہدیٰ پبلکشنز، الہدیٰ آفسیٹ پریس کا بھی ممنون ہوں جن کی مساعی جمیلہ کے طفیل یہ کتاب آپ کے ہم دست ہوسکی ہے۔

احقر

شہزاد بخت (شبؔ) انصاری

۲۳۸/نیو وارڈ، معاملتدار گلی، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳، ضلع ناسک مہاراشٹر

09326595753

www.urduchannel.in

ا۔ مجھکو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

ہم نے قدیم داستانوں میں عمر عیار کی زنبیل، جام جمشید، الہ دین کا چراغ، اور ہر قوت پر یکساں قادر جن، ساحروں کے طلسمی گولے اور اڑن کھٹولے جیسی خیالی و تصوراتی داستانیں تو خوب پڑھی تھیں۔ مگر اس کی نظیر ایک طلسمی آلے کی ایجاد کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اس کا تو ہمارے فرشتوں کو بھی وہم و گمان نہ تھا۔ یہ طلسمی آلی موبائل فون چشم زدن میں اقصائے عالم میں ظہور پذیر حالات و واقعات کو تحریر، کلام، آواز کے ساتھ ساکن و متحرک تصاویر کی شکل میں نشر کرنے کا مجاز ہے۔ موبائل فون بیک وقت کبوتروں، نامہ بروں، خطوط کو ریئر، ٹیلی گراف، ٹیلیگرام، ٹیلیفون اور بعض وقت سوئفٹ مسیج جیسے جدید ذرائع ابلاغ کا واحد متبادل ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی کشش، ضرورت، اور ہنگامہ خیزیوں نے ہر خاص و عام کو اپنے حصار میں قید کر رکھا ہے۔ عارفوں، عابدوں، زاہدوں کو توبہ شکنی پر مجبور کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ پردہ نشیں خواتین بھی اس کے سحر سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ماضی بعید میں کسی کو گمان بھی نہ گذرا تھا کہ دور دراز ممالک کے فاصلے یوں سمٹ جائیں گے۔ بری و بحری رکاوٹیں موبائل کی سحر آفرین لہروں سے ختم ہو جائیں گی۔ ہم اپنے پیغامات دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک اس قدر آسانی سے پہنچا سکیں گے۔

عزیزان من! ہمارا مقصد نہ تو موبائل کی قصیدہ خوانی ہے نہ ہی تجارت، صنعت و حرفت، میں اس کی اہمیت و افادیت پر بحث کرنا ہے۔ نہ ہی اس کی سرعت عمل سے سروکار ہے۔ نہ ہی اس کے جملہ اوصاف سے انکار۔ عاجز نے موبائل فون کے ادنیٰ سے مخفی استعمال پر اپنی حقیر و معمولی رائے کا اظہار کیا ہے۔ موبائل نے عاشق و معشوق کے مابین حائل تمام واسطوں کو ختم کر کے بلا واسطہ تعلق استوار کیا۔

کیوں عاشق ومعشوق میں حائل رہیں پردے
بس فون پر معشوق کے نمبر کو لگا دو

موبائل فون پر جہاں سارے دنیا سچے جھوٹے قول سے استفادہ کرتی وہاں اگر عشاق نے بھی اس سے فیض اٹھایا تو آخر کیا گناہ کیا؟ عہد قدیم میں کبوتروں کو نامہ بر کی تربیت دی جاتی تھی۔ تاکہ نامۂ عاشق ومعشوق تک رزاداری سے پہنچایا جاسکے۔ مگر معصوم پرندے سے خطا بھی تو ممکن تھی۔ یوں بھی ہمسکتا تھا راستے میں ہی رقیب روسیاہ سیٹیاں بجا کر کبوتروں کو اپنی چھت پر اتار لے اور نامۂ عشق پڑھنے کے بعد پھر دوبارہ روانہ کردے۔ تب ہی تو مرزا نوشہ کہتے ہیں۔

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ برعاشق کا نامہ لاتا ہے اکثر کھلا

مگر موبائل فون کی ایجاد نے عشق کو کبوتروں کا منت کش ہونے سے نجات دلا دی ہے۔ موبائل فون پر مخفی و پوشیدہ پیغامات، گفتگو کی آمدورفت کا سلسلہ بڑی رزاداری سے جاری رہتا ہے۔ جب گفتگو مقصود ہوئی مس کال کر کے اُدھر کی خیریت کا احوال معلوم کرلیا۔ اگر ماحول سازگار اور رازداری کا تیقن رہا تو سلسلۂ رومان جواں ہوا اٹھتا ہے۔ موبائل فون سے مس کال اور سابقہ گفتگو کی تفاصیل ختم بھی کی جاسکتی ہیں تاکہ پارسائی کا بھرم قائم رہ سکے۔ عہد قدیم میں عاشق بڑی محنت وجاں فشانی سے محبت نامے تحریر کیا کرتے تھے۔ پھر ان کی درمعشوق تک رسائی بصد رازداری سے ہوجائے۔ کسی طرح دل مضطرب کا حال معشوق کو جلد از جلد معلوم ہوجائے۔ اسی تگ ودو میں مصروف رہتے تھے۔ بعض اوقات بے قراری اس قدر حاوی ہوجاتی کہ نامہ بر کے ساتھ قدم باقدم ہی چل پڑتے تھے۔ مبادا کہ نامہ بر کی کوتاہی محبت نامے کی رعنائی خیال کو مفقود کردے۔ گویا

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

www.urduchannel.in

یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

عصر حاضر میں موبائل نے عاشق کی ان مشکلات کو یکسر آسان کردیا ہے۔ جتنے وقفے میں چراغ سے جن برآمد ہوتا ہے، حکم آقا اس کی سماعت، فہم وفراست سے عمل کے مرحلے تک گذرتا ہے۔ اس سے قبل ہی ایک سحر آفرین دلربا موسیقی کی دھن معشوق کو مسرت سے سرشار کردیتی ہے کہ پیام عشق کی آمد آمد ہے۔ گویا

؎ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج

۔ادھر پیام عشق فضا میں محبت سے معمور سحر آفرین لہروں کے دوش پر محو پرواز معشوق کو مستعد کردیتا ہے۔ گویا

گھنٹیاں بجنے لگیں ہجر کے سناٹے سے
گنگناتا ہوا ایسے میں، اگر تو آئے

ادھر موبائل فون پر پیام عشق کے نزول کی نوید معشوق کو مسرور کردیتی ہے۔ گوشۂ عافیت کی تلاش میں نگاہ ناز مضطرب ہوجاتی ہے۔ جوں ہی محفوظ گوشہ میسر ہوتا ہے۔ کمال بیباکی سے عشق کی حشر سامانیاں اپنی معراج کو پہنچتی ہیں، جہاں حال دل کے تبادلے، رومانی جذبات کا اظہا، رشکایت و حکایت کے بعد از سر نو عہد و پیماں کے ساتھ ساتھ بالمشافہ ملاقات کے منصوبے بھی ترتیب دئے جاتے ہیں۔ مجوزہ مقام کی نشان دہی بھی بہانے اشارے کنائے میں بڑی صراحت کے ساتھ طے کرلئے جاتے ہیں۔ موبائل فون کی اسی صلاحیت پر مرزا غالبؔ کا شعر منطبق ہوتا ہے۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے، پیام وعدۂ دیدار دوست

موبائل فون نے خصوصاً پردہ نشین و برقع پوش معشوق کو تمام ذلتوں اور رسوائیوں سے محفوظ ومامون

کر دیا ہے۔ محفل ہو یا تنہائی وہ اپنے عاشق سے برابر رابطے میں ہوتا ہے۔ محفل میں مخاطب کی جنس تبدیل کے اور تنہائی میں حسب حال، راستہ ہو یا دفتر ہو، گھر ہو یا بستر ہر جگہ اب گفتگوئے عشق کا لطف اٹھایا جاتا ہے۔

پردہ نشینوں کے والدین کی تشویش اپنی بیٹیوں کے لئے اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ان کی نور نظر، لخت جگر کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ یہ جاننے کے لئے موبائل فون انہیں سونپ دیتے ہیں تا کہ بچوں کے حقوق میں کوئی کمی نہ واقع ہو۔ مگر یہ بات ان کے فہم وادراک سے بالاتر ہے کہ منزل عشق کے راستے خواہ وہ میکہ ہو یا سسرال اسی محافظ آلے سے ہو کر گذرتے ہیں۔ عشق کو پروان چڑھانے میں یہی ننھا سا آلہ معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اسی ننھے سے آلے کی مدد سے وہ اپنے والدین کو غلط خبر دے کر گمراہ کرتی ہیں۔ موبائل کمپنیوں نے TRP میں اضافے کی مقابلہ آرائی میں اپنے صارفین کو بے پناہ ارزاں، مفید اور برق رفتار سہولتیں مہیا کی ہیں۔ عاشق و معشوق سے گفتگو کے سلسلے میں کہیں رقم کے اصراف کا خیال نہ ستائے۔

موبائل فون پر نصف ملاقات سے ہر وہ لذت کشید کی جائے جو ممکن ہو۔ ہر چند کہ نہ اب وہ نامۂ معشوق کی لذت، محبت آمیز آداب والقابات باقی ہے، نہ انتظار کا وہ اضطراب، نہ وہ جان لیوا اندیشے، نہ وہ محبت کی شدت، نہ جذبات کی حدت، نہ طرز تکلم میں جدت، نہ آواز میں وہ الفت، نہ اقرار کی لذت اور نہ انکار کی خفت۔ وہ جذبے جو ملاقات کے طویل عرصوں اور فاصلوں کی لذت فراہم کرتے تھے۔ اب بسیار گوئی کی نذ ہو گئے ہیں جو ہر ارزاں شہ کی طرح جذبات اور احساسات کو ارزاں کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کی تپش کو بھی ارزانی کی حد تک سرد کر چکی ہے۔ محض چند پیسوں کی کال کے فاصلے پر میسر معشوق تک رسائی بالکل آسان اور عاشق کی دسترس میں ہے۔

اب عاشق و معشوق کہیں آہٹ پر کان لگائے بیٹھے نظر آتے ہیں؟ اب کہیں مینا و ساغر سے

www.urduchannel.in

سامان ہجر و بتاں کیا جاتا ہے؟ اب کہیں داغ فراق، صحبت شب کی جلی ہوئی شمع خ موش نظر آتی ہے؟ کیا اب کوئی کہتا نظر آتا ہے کہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب؟

کیا اب کسی عاشق کو زنداں میں صحرا نوردی کا خیال آتا ہے؟ موبائل فون کی سرکش لہروں نے سارے جذبات و احساسات کی لطافت کو تہہ آب کر دیا ہے۔

۲۔زن مریدی

شادی کے لڈو کی کشش ہی لاجواب ہے۔جو کھائے وہ پچھتائے، جو نہ کھائے للچائے۔شادی کا نرم و میٹھا لڈو بعض اوقات گلے کی ہڈی بن جاتا ہے۔نہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔ نکاح کی مقدس تقریب میں ایجاب و قبول کے مراحل میں نوشہ میاں کو مہر معجل یا مہر موجل کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ معصومانہ انداز میں قطعی غیر محسوس طور پر اپنی آزادی، خودسری اور آوارگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔نئی نویلی ازدواجی زندگی میں نئی نویلی دلہن جس ساعت سعید سے خوشیوں کا پیغام لے کر وارد ہوتی ہے۔گویا

؎دن گنے جاتے ہیں اس دن کے لئے

اسی ساعت جلیلہ سے زن مریدی کی ریشمی ڈوریاں نوشہ میاں کے پایۂ خجستہ میں یوں محبت سے ڈال دیتی ہے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ پہلے پہل تو نوشہ میاں دلہن کے گرد اس کی خواہشات کے محور پر گھومتے نظر آتے ہیں۔مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ دلہن انہیں کبھی انگلیوں کے اشارے پر تو کبھی صرف خم ابرو کے اشاروں پر نچا رہی ہیں۔ یہاں تک مرحلہ فریقین کے درمیان بلا حیل وحجت جاری رہے تو حیات پر لطف ہوتی ہے۔

بعض اوقات افراد خانہ کی روایتی رخنہ اندازی یا فریقین کی انا جہاں درمیان میں حائل ہوتی ہے، جو معمول سے زیادہ عادت اور خصلت کا شاخسانہ ہوتی ہیں۔بس یہیں سے خانہ جنگی اور خانہ خرابی کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ظاہر ہے جب معاملہ اس نوعیت کا ہو کہ تو بھی رانی میں بھی رانی، کون بھرے پنگھٹ سے پانی تو پھر یہی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔اس کا واحد سونے سے بھی قیمتی مگر بالکل مفت حل ہے زن مریدی۔اگر بیوی کو رام کرنا ہو تو اس کی جملہ کمزوریوں

www.urduchannel.in

سے خوب فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔دوسرا سب سے بڑا یہ فائدہ کہ انا کی شکست جیسی ہزیمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی۔دو آسان حل ہیں اگر بیوی منہ پھلا کر خاموش ہو تو میاں کو بیوی کے حسن و ادا، عادات و اطوار کے ساتھ پکوان کی تعریف کرنا چاہئے۔جب بات بنتی نظر نہ آئے تو اس کے مائیکے کی تعریف کرنا چاہئے۔جس سے چھیڑ چھاڑ کا لطف اور گفتگو کے آغاز کی سبیل برآمد ہو جاتی ہے۔بیوی بالفرض ٹسوے بہائے تو یہ جانتے ہوئے کہ یہ مگر مچھ کے آنسو ہیں۔اس کی فراخ دلی سے ہمدردی اور معذرت کے ساتھ منا لینے کی کوشش کرنا چاہئے۔خوش کرنے کے لئے آئندہ غلطی نہ دہرانے کا عہد و پیمان بھی کر لینا چاہئے۔چوں کہ ٹیڑھی پسلی کا علاج زن مریدی کے مکھن سے ہی ممکن ہے۔ورنہ پسلی توڑ بیٹھنے، یوسف بے کارواں پھرنے، خانہ خرابی و خانہ جنگی سے لے کر خانا بربادی تک کا سفر درپیش ہوتا ہے۔لہذا مرد کو اپنی زبان سے نہ سہی بزبان غالب ہی اقرار کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

دراصل زن مریدی مرد کے خمیر کا جزو ہے یا ازدواجی مجبوری، رشتوں کی کمزوری یا مردانگی کو چیلنج۔یہ نکتہ ابھی زیر تحقیق ہے۔بعض ماہرین نفسیات کے لئے دردسر اور مسئلہ بنا ہوا ہے۔جسے وہ غریب بھی سمجھنے سمجھانے سے عاجز ہیں۔جب خود معالج بھی بے چارگی کا شکار ہو جائے تو صورتحال یوں پیدا ہو جاتی ہے کہ اس درد لا علاج کی کیونکر دوا کروں؟

بہرحال ناتجربہ کاروں کے لئے یہ شادی کے بعد انسان کے سر پر پڑنے والے عذابوں میں سب سے جان لیوا ہے۔جو شادی سے پہلے بہت بھلا اور شادی کے بعد اتنا ہی برا معلوم ہوتا ہے۔البتہ ہمارے خاندان کے بزرگ زن مریدی جیسے وصف خاص کو بغض و عناد کی عینک سے دیکھتے ہیں۔مگر اس کے یکسر برعکس زن مریدی کا وصف سسرال یا بیوی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھی

جائے تو سیدھے پن، شرافت، اور انسانیت نوازی کی سند پاتی نظر آتی ہے۔ ہر انفرادی تجربے اور اجتماعی تناظر سے قطع نظر حتمی فیصلہ یہی ہے کہ اگر گھر کو پُر امن اور جنت نشاں بنانا ہو تو اس کے آنگن میں زن مریدی کا پودا ضرور ہونا چاہئے۔ کامیاب اور ہنستی کھیلتی ازدواجی زندگی کے لئے اس کی آبیاری و نگہداشت کو معمول بنالینا چاہئے۔

عالمی پیمانے پر مردوں کو یوں بھی ظلم وستم، جبر وقہر سہہ کر مسکرانے کی جمہوری عادت میسر ہے۔ جس میں تصنع ان کی مجبوری ہے مگر ان میں تعلیم یافتہ، مردوں کی بردباری نہیں اپنی انا قربان کر دینے کا فن بلآخر سکھا ہی دیتی ہے۔ لہذا اپنی ہی شریک حیات کے غمزے، عشوے، ادائیں و ناز برداریاں اٹھانے میں بھلا کیوں کر قباحت ہو سکتی ہے۔ مگر مرد عموماً انا کا غلام ہوتا ہے۔ جو بیوی کا غلام بننے کے خبط میں فریقین کے ساتھ ساتھ اہل خانہ سسرالیوں اور ہمسایوں کی اذیت رسانی سے باز نہیں رہتا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھال کے تین پات۔ اس طرح سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بیوی اور سسرال والے خائف ہو کر اس کی منت وسماجت، ظاہر داری اور پذیرائی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ مگر پس پشت اسے بھی القابات لعنت و ملامت نوازے جاتے ہیں۔ بہر کیف مرد کا ظرف نسبتاً بلند و اعلیٰ ہوتا ہے۔ جس میں زن مریدی کے عناصر اپنی گنجائش یوں پیدا کر لیتے ہیں جیسے کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں نووارد مسافر اپنا مقام بنا ہی لیتے ہیں۔

زن مرید حضرات بڑی خندہ پیشانی سے 'لیڈیز فرسٹ' کہہ کر خواتین کو اولیت دیتے ہیں۔ بھوپال کے نوابوں نے حد کر دی۔ ساری سلطنت کو بیگمات کے حوالے کر کے جذبۂ زن مریدی کو بارہ توپوں کی گرجدار سلامی پیش کی تھی۔ یہی نہیں زن مریدی کی صفات بابرکات نے ہی ہمیں تاج محل جیسی بے نظیر و خوبصورت یادگار عطا کی ہے۔ شہر حیدرآباد جو بیگم حیدر محل کے نام

www.urduchannel.in

معنون و موسوم ہے یا قدیم نام بھاگیہ نگر جو رانی بھاگمتی (معشوقہ قلی قطب شاہ) کے نام موسوم تھا۔ کملا نہرو پارک، رانی باغ، اندرا گاندھی کے نام سے موسوم تمام ادارے و اسکیمات، وکٹوریہ ٹرمینس، جیسے تاریخی اثاثے بھی زن مریدی کی دین ہیں۔ زن مریدی کے جذبے کے تحت مقتدر اعلیٰ کی شریک حیات کو خاتون اول کہلانے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ گو ان کا حکومت میں راست کوئی عمل دخل یا حصہ نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی وہ ہر سرکاری اندرون ملک و بیرون ملک کے دوروں میں موصوف کا ساتھ ضرور دیتی ہیں تا کہ موصوف ان کی ناز برداریاں اٹھا سکیں اور ان کا ذہنی توازن بھی نکیل مہار کی طرح تھامے رکھے تا کہ وہ اپنے زلف گرہ گیر سے موصوف کے کردار اور ان کے منصب جلیلہ کی محافظت کر سکیں۔ اس طرح وہ سیاسی پارٹیوں کی طرح حکومت کو بیرونی اعانت فراہم کرتی ہیں تا کہ حکومت ڈھے جانے سے محفوظ و مامون رہ جائے۔ اس کی سیاسی منصب کے تفصیل سرکاری خرچ پر مزید سیر و سیاحت اور شاپنگ کا لطف بھی آجائے۔

زن مریدی جب تک گھر کی دہلیز میں ہوتی ہے تو اس کی نوعیت خانگی ہوتی ہے۔ مگر جوں ہی گھر کی حدود سے باہر نکل جاتی ہے تو نت نئے گل کھلاتی ہے۔ ہر بڑے آدمی سے اپنے مصرف کا کام نکالنے کا ایک تیر بہدف حل زن مریدی کی جلو میں موجود ہے۔ ان کی ایسی کمزوری پروار کرنا کہ انکا کی گنجائش ہی نہ رہے۔ ان کی بیگمات کو ہیرے موتی سونا چاندی کے نیکلیس جڑاؤ ہار نولکھا ہار اور ڈائمنڈ سیٹ کے نادر و نایاب تحائف پیش کئے جائیں تا کہ موصوف کا نرم گوشہ جذبۂ زن مریدی سے موجزن ہو کر آپ کے مطلوبہ مقصد کی طرف راغب ہو۔ نتیجے میں آپ نہال ہو جائیں۔ حال ہی میں ملک عبداللہ والیٔ سعودی عرب نے امریکی صدر بارک اوبامہ کی شریک حیات کو ڈھائی لاکھ ڈالر کی مالیت کا تحفہ عنایت کر کے اس روایت کو حیات نو بخشی۔ دیگر ممالک کے سربراہوں کو بھی اپنی صوابدید کے مطابق پیش رفت کرنی چاہئے تا کہ عالمی

امن کو یقینی بنا سکیں۔

بیوی کی نزاکت اور حسن و ادا پر شوہر تو مہربان ہو جاتے ہیں۔ مگر شوہروں کو علم ہونا چاہئے کہ عورت جسے سات پردوں کی اوٹ سے جنگ کروانے میں مہارت حاصل ہے۔ وہ طنز کے نشتر سے ہیرے کا جگر کاٹنے کی دھار دار صلاحیت رکھتی ہے۔ مرد ناداں کے کلام نازک (صلواتیں) سنا سنا کر بے اثر کرنے کے حربے سے بھی واقفیت رکھتی ہے۔ لہذا زن مریدی جہاں میاں بیوی کے مابین شکر رنجی کے مسئلے کا حل زن مریدی ہی ہے۔ وہیں مرد کو بھی اپنی عزت و وقار کی حفاظت کا خوبصورت بہانہ بھی بہترین ذریعہ ہے۔ بہت سے افراد زن مریدی کی تلخ حقیقت سے روگردانی کرتے ہیں یا تو وہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں یا غیر اطمینان بخش ازدواجی زندگی کی مار جھیل رہے ہوتے ہیں۔ مگر اس سے بھی تلخ حقیقت یہ ہے کہ زن مریدی سے انکار پر آفتیں ٹوٹتی ہیں۔ اقرار پر انا مجروح ہوتی ہے۔ لہذا ذہین افراد خاموشی سے اسے روبہ عمل لا کر اس مقولے کے مصداق مطمئن ہوتے ہیں۔ گویا آفت جب گڑ سے مرجائے تو زہر کیوں دے؟ لہذا شجر ممنوعہ سے بھی خطرناک ہے۔ مگر بغیر کھائے چارہ بھی نہیں ہے۔ گویا

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے تو کلیسا مرے آگے

www.urduchannel.in

۳۔ دال کا تڑکا

اردو ادب میں دال کا عمل و دخل خاصہ قدیم اور مستحکم ہے۔ اردو ادب میں دال سے جو رشتۂ وفا استوار کیا ہے وہ اٹوٹ ہے۔ جس کی نظیر ہمارے ہاں گھر داماد جیسی ہے۔ جس کے گھر میں وارد ہونے کا تیقن تو ہوتا ہے مگر گھر سے جانے کا تعین نہیں ہوتا۔ اردو ادب بھی دال کا مرہن منت ہے۔ چونکہ اردو ادب میں دال کا استعمال کل دو مرتبہ آتا ہے۔ لفظ اردو کے رکن سوم اور ادب کے رکن دوم کی حیثیت سے چونکہ دال کا حروف تہجی کا معروف رکن بھی ہے۔ خیال کی پختگی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ داماد بھی دال سے شروع ہو کر دال پر ہی ختم ہوتا ہے۔ مگر دال کی کافرمائی محض بطور رکن حروف تہجی ہی موقوف نہیں ہوتی بلکہ اردو ادب کو دال نے متعدد محاورے بطور زیور عطا کئے ہیں۔

وقتاً فوقتاً اردو ادب کے جیالوں نے بھی دال سے ہی دیرینہ رشتہ قائم کر کے میراث بحال رکھی ہے۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی معروف نظم ایک لڑکی نے دال پکائی۔ شاید اس بے چاری بچی کو عصر حاضر کی لذت کام و دہن کی حشر سامانیوں کا علم نہ ہو جہاں افراط زر کے باعث لذیذ پکوانوں نے دال پر عرصۂ قبل اپنی سبقت درج کر لی ہے یا پھر وہ زمانے ہی سادہ لوح، قناعت پسند، خدا ترس بندوں کا تھا جن کے ہاں دال بھی غنیمت تھی۔ حتیٰ کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ بھی دال کے سحر میں گرفتار رہے۔ وہ جن کو تاحیات آٹے دال کا بھاؤ معلوم نہ ہو سکا۔ بس اس مدعا پر تکیہ رہا کہ 'مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟' کبھی کبھی یہ تشویش بھی پریشان کرتی ہے۔ ؎

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں گے تو کھائیں گے کیا؟ البتہ بہادر شاہ ظفر کے ہاں سے آئی ہوئی دال پر تکیہ کرنے کا افتخار انہیں بخوبی حاصل رہا ہے۔ لہذا قصیدہ خعوانی میں بھی دال کی مدح میں

علمی فنکاری کا اثر یہ ہوا کہ دال کے چار مختلف مفاہیم کا حق کس خوبی سے ادا کر دیا کہ

بھیج دی ہے مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال ہے لطف وعنایت شہنشاہ پہ دال
ہے شاہ پسند دال نے بحث وجدال ہے دولت ودین ودانش وداد کی دال

اس عاجز کی رائے میں دسترخوان ہو یا بامحاورہ کلام دال کے بغیر بے کیف وہوتا ہے۔خواہ وہ امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا زن، بچے ہوں یا ضعیف، مریض ہوں یا تندرست وتوانا سب ہی نزدیک دال کی لذت واہمیت وافادیت سے مسلمہ حقیقت یکساں ہے۔جب امرا کے ہاں مختلف انواع واقسام کے مرغن پکوانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔وہیں دال میں مختلف قسم کے تڑکے مکھن ڈالڈا اور دیسی گھی سے لگائے جاتے ہیں۔غربا دال کو ابال کر گھوٹ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔المیہ تو یہ ہے کہ ہر شخص کو گوشت مرغ یا مچھلی کے مرغن پکوان تو مرغوب ہوتے ہیں۔ان کی بانسبت دال تو ثانوی حیثیت رکھتی ہے یا سرے سے غربا کی علامت جان کر اسے منہ بھی نہیں لگایا جاتا ہے۔عوام تو درکنار عارف، عابد وزاہد حضرات بھی مرغن غذا اور لذت کام ودہن کی تلاش میں دال سے پہلوتہی کرتے نظر آتے ہیں۔

شیخ نے دال جہاں پر لائے وہیں لاحول زباں پر
کھا کر بولے مرغ مسلم صلی اللہ علیہ وسلم

مگر دال کی مختلف مصنوعات جیسے پکوڑے، دال باٹی، دہی بڑے اور پاپڑوں پر بھی رال ٹپک ہی جاتی ہے۔اس امر سے حضرت انسان کی طوطا چشمی بھی جگ ظاہر ہے۔گویا ۔ گڑ کھانا اور گلگلے سے پرہیز کرنا۔

اوائل شباب سے اکثر عزیز واقارب کے انتقال پر تجہیز وتکفین ومابعد تدفین کے مرحوم کے پسماندگان کو متواتر تین روز تک طعام کا ذمہ اقارب کے سپرد کر دینے کا رواج کافی قدیم

www.urduchannel.in

ہے۔اس پرسوز و پرسوگ ماحول میں عوام کی دال چاول سے مانوسیت بھی روایتی ہے۔لوح زباں پر حرف مکرر کے مصداق ذائقے کی یکسانیت گراں نہ گذرے۔لہذا جا بجا کھٹائی تو کبھی تڑکے کے استعمال سے لذت تبدیل کی جاتی ہے۔بھلا ہو افراط زر کا کہ اب ایسے مواقع پر دال کی جاگیر پر پلاؤ، دالچے، قورمے و دیگر مرغن پکوانوں کا قبضہ ہوا چاہتا ہے۔چونکہ شاعر بڑی دوررس نگاہیں۔شاید اسی لئے اکبر الہ آبادی نے پہلے ہی پیشن گوئی کر دی تھی کہ

کوئی بتلائے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

موجودہ دور میں مرحوم کے پسماندگان عزیز ان گرامی اور ہمسایوں کی تعداد میں اچانک خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہے۔اس مغالطے کا غماز ہے کہ مرحوم کے ہر دلعزیز، نیک سیرت، فرشتہ صفت اور مقبولیت کے حامل شخصیت کے مالک تھے۔دراصل اس اضافی تعداد کا محرک وہ پرتکلف مزہ ہے۔جو تین دنوں تک سوگواروں کر ہر نت نئے لذت کام ودہن سے آشنا کرتا ہے۔بلکہ قابل ستائش ہجوم بھی اکٹھا کر لیتا ہے۔

دال کی کثرت استعمال کے سبب ہمارا دال سے رشتہ خاصہ بے تکلف ہو چکا ہے۔بنی نوع انسان نے حسب عادت جا بجا شخصی قباحتوں اور حالات وواقعات کے اظہار کے لئے دال کا دامن استعارتاً پردہ از خود طے کر لیا ہے۔اس پر ستم بالائے ستم ہمہ وقت دال کی مٹی پلید کرنے کے مواقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔بات بات پر طعن وتشنیع اور جملہ زنی کے لئے دال کا وسیلہ درکار ہوتا ہے۔گھر کی مرغی دال برابر۔

جوں ہی حضرت انسان کی نیت میں فتور آجائے تو آنکھوں میں سور کا بال اتر آئے تو ہم دال میں کالا کہہ کر فوراً دال کو مورد الزام ٹھہرا دیتے ہیں۔بدنظمی، اراتفری اور افراطیت کا استعارہ ہے جوتوں میں دال بانٹنا۔یہ ساری باتیں دال پر ہی کیوں موقف ہیں؟ وہ بھی جوتوں کے ساتھ

ہائے ذلت کیا دیگر اشیائے خورد ونوش کو ہدف نہیں بنایا جا سکتا تھا؟ جب کوئی ادنیٰ شخص اعلیٰ عزائم کے لئے حوصلہ مجتمع کرے تو 'یہ منہ میاں مسور کی دال' کہہ کر مسور کی دال کو بھی اس کے ساتھ ذلیل وخوار کر دیتے ہیں 'دال روٹی میں مست ہونا'

اس عالم رنگ و بو میں بے شمار مظاہر جلوؤں سے مست ہوا جا سکتا ہے۔ دال کا روٹی کا استعمال محض مفلسی کی غمازی کرتا ہے۔ صحت کی خرابی کے دو واضح اسباب ہیں۔ ایک تو موسم کا اثر یا پھر ہماری بے اعتدالی مگر 'دال پتلی ہونا' کہہ کر دال اپنی لطیف ترین ہئیت میں موجب گناہ قرار پاتی ہے۔ جبکہ خدا راستی تو یوں ہے کہ علالت کے دوران سارے مرغن پکوان درکنار رہ جاتے ہیں۔ مریضوں کی دگر دوں حالت کو دال ہی غذائیت فراہم کرتی ہے۔ 'دال نہ گلنا' جب کسی شخص کی متوقع پذیرائی نہ ہو یا صحبت ناہم جنس سے پالہ پڑ جائے تو دال نہ گلنے کا شکوہ زبان زد عام وخاص رہتا ہے۔ یوں بھی دال کے بے شمار احسانات ہیں۔ بنی نوع انسان پر۔ نومولود بچے کو دال کا پانی پلایا جاتا ہے۔ ضعیف حضرات کو دال کی زود ہضمی راس آتی ہے۔ چاند میں داغوں کی تعبیر کے دال سے اکثر و بیشتر گیس ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ 'جبل گردک جبلت نہ گردک' کے مصداوق بنی نوع انسان اقتدار کی بقا کے لئے اپنے ہی معاشرے پر ظلم ڈھاتا ہے جسے عموماً سینے پر مونگ دلنا' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کسی کو تنگ کرنے کی ایسی ظالمانہ نظیر شاید ہی کہیں اور میسر ہو۔ بہر حال ظالم تو بیرنگ چھوٹ جاتا ہے، مگر ساری بلا معصوم مونگ کے سر آجاتی ہے۔ ایک اور ضرب المثل ہے نا کو چنے چبانا' اولاً یہ فعل سرے سے ہی ناممکن اور غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ ناک کے خواص حسن و وجاہت، قوت شامہ اور عمل تنفس کی سبیل ہیں۔ لہذا اس سے چنے چبانے کا عمل خاصہ ثقیل ہے۔ کسی کو مشکل ترین مرحلے سے گذرانے کو اس بے رحمی سے چنے چبانے کی تشبیہہ دی جاتی ہے کہ دالوں کی جملہ انجمن ہی تلملا اٹھے۔

www.urduchannel.in

خانساماؤں نے اپنی شہرت اور ہوٹل کے مالکان نے ارتکاز دولت کے لئے دال کی نت نئی مصنوعات پیش کی ہیں۔ مثلاً دال شاہی، دال مکھانی دال شاہجہانی وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس عمل کی تحریک دال کی خدمات کے اعتراف کے اظہار کی سبیل نہیں۔ یہ تو مال وزر کی حرص وطمع کی تحریک کا باعث ہے۔ دال کے اس قدر استحصال اور بے جا برتاؤ سے دال کی انا کو ٹھیس پہنچی۔ جذبات مجروح ہوئے تو دال نے انتقاماً علم بغاوت بلند کر دیا۔ دال نے بنی نوع انسان کو مفلسی اور ناگفتہ بہ صحت پر رحم وکرم کیا۔ مگر ہم بنیادی طور پر ناشکرے اور احسان ناشناس ہیں۔ جا بجا احسانات تو درکنار، ہم اس کی ارزانی کے گلے شکوے ہی کرتے نظر آتے تھے۔ اپنی جملہ قباحتوں کو دال کے پاک دامن پردے میں پوشیدہ رکھنے، نیز نام بنام بدنام کرنے سے دال بھی تنگ آ کر اپنی ذات پر اتر آئی ہے۔ لہذا دال نے نہ صرف انتقام بلکہ اپنی اہمیت درج کروانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

کل سودا سلف خریدنے کی غرض سے فضلو چچا کی دکان پر پہنچا تو چچا نے بتایا کہ میاں تور کی دال دوسو روپیہ فی کلو ہو چکے ہیں۔ میرے ذہن میں فوراً تقابلی مطالعہ شروع ہو گیا۔ مچھلی گائے کا گوشت اور برائلر مرغ تو اسی روپئے فی کلو ہیں مگر روٹھی ہوئی دال نے ان تمام اشیائے خوردنی پر سبقت لے کر دوسو روپیہ فی کلو کا تمغہ جیتا ہے۔ آخرش قوت برداشت اور استحصال کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ اب تک ہم دال کو تڑکا لگاتے رہے، مگر اب دال ہمیں تڑکا لگا رہی ہے۔

۴۔قربانی کا بکرا

جمعرات کی شب تادیر محفل یاراں میں گذاری۔لذت خواب سحر میں غرق تھا کہ محترمہ بیگم صاحبہ کی کرخت آواز کانوں میں پڑی کہ نیند کا طلسم چھن سے ٹوٹ گیا۔حقیقت کی دنیا کی رانی کہہ رہی تھی۔''خیرُ ن کے ہاں ایک صحت مند تگڑا بیل اور نسرین کے ہاں دو اونچے موٹے تازے بکرے آچکے ہیں۔عید قرباں سر پر ہے۔سارے ہمسائے مجھ سے پوچھ رہے ہیں کیا تمہارے ہاں قربانی ہوگی؟''

جی میں آیا کہہ دوں۔''ہاں میری قربانی ہونی ہے۔''مگر میں بے قصور شوہر بدستور خاموش رہا۔
بیگم جھنجھلا گئیں۔''نہ جانے کہاں کہاں اس شخص کی وجہ سے ذلتیں اٹھانی پڑیں گی۔بچوں نے صبح سے پریشان کر رکھا ہے امی ہمارا بکرا کب آئے گا؟ آپ تو شب و روز گردن جھکائے نہ جانے کیا کیا فضولیات لکھتے رہتے ہیں۔بھلا دنیا جہاں کی بھی فکر ہے آپ کو؟''
اس لمبی چوڑی تقریر نے حواس باختہ کر دیئے۔بیگم صبح سے شامت بن کر سر پر کھڑی تھیں۔لہذا فوراً سے پیشتر بستر چھوڑا جنگی پیمانے پر اپنی حاجت اور غسل سے فارغ ہوا۔بیگم کو کچن میں نہ پا کر تھرماس سے کپ میں چائے انڈیل کر پینے پر اکتفا کیا۔چونکہ دروان ناشتہ دھواں دھار کمنٹری برداشت کرنے کی تاب مجھ میں ہرگز نہیں تھی۔چپکے سے سفید کرتا پاجامہ زیب تن کر کے گھر سے روانہ ہوا تو بچوں نے باہر آتے ہی گھیر لیا۔''ابا جی! ہم بھی بکرا لینے ساتھ چلیں گے۔''
میں نے دونوں بچوں کو دونوں بازوؤں کی طرف بطور ڈھال لیا اور اپنی منزل کارزار کی طرف روانہ ہوگیا۔شہر عزیز کی مویشیوں کی منڈی کو نیلام گھر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔میں جب وہاں پہنچا تو تا حدنظر بکروں اور بکرا فروشوں کا ہجوم بے کراں تھا۔البتہ مجھے بکروں کی فربہی راس نہیں آئی۔نہ

وزن، نہ جاذبیت، نہ خوبصورتی ان کی قحط زدگی، نقاہت اور لاغر پن صومالیہ کے باشندوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔میں نے جن اعلیٰ ذوق کے بکروں کا تصور باندھا اور تلاش کا قصد کیا تھا وہ ہنوز تصور ہی ثابت ہو رہا تھا۔وہاں کوئی بھی بکرا میری ادنیٰ سی پسند یا معیار انتخاب کو متاثر نہ کر سکا۔

سوئے اتفاق میرے پرانی پڑوسی اور قصاب فاروق سے ملاقات ہوگئی۔جب میں نے فاروق سے بکروں کی تشویش ناک صحت پر تبصرہ کیا تو فاروق نے کمال بے اعتنائی سے اس راز سے پردہ اٹھایا۔''یہ سارے دیہاتی بکرے ہیں۔جو خود رو جنگلی گھاس پھوس کھاتے ہیں، میلوں چلتے ہیں۔ان میں وہ فربہی اور صحت کہاں ہوگی؟''
فاروق نے یہ کہہ کر مجھے مدعو کیا۔''شام ساڑھے چار بجے تک پرانی بکرا منڈی میں آجاؤ۔ایسے خوبصورت، فربہ اور تندرست بکرے آئے ہیں کہ آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔''

فاروق نے مجھے یوں راغب کیا تھا گویا سارے بکرے تنہا میری ہی خاطر منڈی میں اتارے گئے ہوں۔لہذا فاروق سے ساڑھے چار بجے پانی بکرا منڈی میں ملاقات طے پائی۔البتہ اب میرے پاس کافی وقت تھا لیکن نیلام گھر سے خالی ہاتھ گھر لوٹنے کا یارا مجھ میں نہیں تھا۔جب تمام راستے بند ہو جائیں تو ایک ہی راستہ کھلا ہوتا ہے۔وہ ہے خدا سے رجوع کا تو میں نے بھی مسجد کا رخ کرنے میں ہی عافیت جانی۔نماز جمعہ کا فریضہ ادا کرنا بھی تو ضروری تھا۔مولوی صاحب کا قربانی کے موضوع پر بصیرت افروز خطاب سن کر اب دل میں خون بہانے کا اشتیاق بھی پیدا ہوگیا، ارمان کروٹ لینے لگے بلکہ ہوک سی اٹھنے لگی۔البتہ نماز جمعہ سے فارغ ہوا تو چار و نہ چار خالی ہاتھ گھر لوٹنا پڑا۔دل میں یہ مصرعہ گدگدیاں نما ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔

ے ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے

بیگم کا غصہ ہیجان کی حدود میں داخل ہوا چاہتا تھا۔تجربات و حوادث سے یہ سمجھ شریف میں آگیا تھا

www.urduchannel.in

کہ سنگین اور ناگفتہ بہ حالات اور اہم موضوعات پر تساہل بلکہ تجاہل عارفانہ برتنے سے خون کا دباؤ قابو میں رہتا ہے اور انسان کے سر سے بے وقت حرکت قلب بند ہونے کے سبب موت کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ میں نے راست خاموشی سے دسترخوان کا رخ کیا۔ میری یہ اس شریفانہ حرکت نے بیگم کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ برافروختہ ہوگئیں۔ جھٹ سے دسترخوان سے ہانڈی ہی اچک لی اور تنک کر کہنے لگیں۔ ''جب تک بکرا گھر نہیں آئے گا۔ آپ کو کھانا نہیں ملے گا۔''

صبح ناشتہ نہ ہونے کے سبب بھوک کی شدت عروج پر تھی۔ پیٹ میں انتڑیاں قل ھو اللہ کہہ رہی تھیں۔ کچھ میں نے منت سماجت کی، مکھن لگایا، کچھ میرے معصوم بچوں کی گواہی نے راہیں ہموار کر دیں تو بیگم کا رویہ کچھ نرم پڑا۔ بصد ناراضگی و رنجش ہی سہی ساتھ کھانے پر رضامند ہوگئیں۔ حسب معمول میں نے جوں ہی بغرض قیلولہ پیٹھ زمین سے ٹکائی تھی کہ منکر نکیر کی نظیر بیگم سر پر آن کھڑی ہوئیں۔ گویا

؎ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

صبح کا سارا روح فرسا منظر نگاہوں میں یکبارگی گھوم گیا۔ میں نے اٹھ کر چل دینے میں جان کی عافیت اور عزت کی خیر جانی۔ مگر جاتے جاتے چھیڑ خوانی کا لطف بھی مقصود تھا۔ لہٰذا بیگم کو بلند آواز میں کہہ دیا۔ ''بچوں سے زیادہ ضد تو آپ خود کر رہی ہیں۔''

یہ سننا تھا بیگم چراغ پا ہو کر پیر پٹختے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔ مگر جاتے جاتے تلملا کر کہا۔ ''آپ کو کیا ہے؟ مجھے چار لوگوں کو منہ دکھانا پڑتا ہے۔''

میں نے بڑے پیار سے سمجھایا اور یقین دلایا۔ ''فکر نہ کرو۔ آج میں ضرور بہ ضرور بکری لے آؤں گا۔''

وہ کچن سے تیزی سے پلٹ کر ہاتھ میں کفگیر تھامے نمودار ہوئیں۔ جسے وہ شاید دھو رہی ہوں گی۔ مجھے یہ خطرہ لاحق کہ کہیں اپنی دھلائی ہی نہ ہو جائے۔ غصے سے چیخ کر سوال کیا۔ ''آخر بکری کیوں؟

www.urduchannel.in

بکرا کیوں نہیں؟''

میرے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ لہٰذا ہونقوں کی طرح خاموش کھڑا رہا۔ ٹیڑھی پسلی نے فطین دماغ سے نیا فتنہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ ''یہاں بھی تانیث کو ترجیح؟ مردوں کی ذات ہی ہرجائی ہوتی ہے۔ ان کی سوچ کا محور ہی عورت ہے۔ وہ بھی اگر دوسرے کی ہو۔''

میں نے سفید کرتے پر عطر پاشی کی تو بیگم نے چبھتے ہوئے لہجے میں فقرہ کسا۔ ''کیا آج نوشہ بن کر دلہن لانے چلے ہیں؟ اپنے ساتھ دو گواہوں اور مہر کی رقم علٰحدہ لیتے جائیں۔''

؎ ہم ہنس دئے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ ترا

میں نے خاموشی سے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ گھر سے کوچ کرنے کی ٹھانی۔ جب میں پرانی بکرا منڈی پہنچا تو میری آمد شاید قبل وقت تھی۔ جس کا سبب احساس ذمہ داری سے زیادہ بیگم کی لعن طعن اور جلی کٹی سے فرار تھا۔ بے حسی بے سبب نہیں غالبؔ۔ پرانی بکرا منڈی میں بکروں اور بکرا فروشوں کا ہجوم تھا بکروں کی فربہی، جسامت، خوبصورتی، اور جاذبیت قابل تحسین تھی۔ چار بکرے جو قدرے فربہ اور دراز قامت تھے پلنگ پر آرستہ گدوں پر شہزادوں کی طرح جلوہ افروز تھے۔ ان کی وجاہت، شباہت اور صحت بھی دیگر بکروں کی بانسبت قابل توجہ تھی۔ ان کے آگے شیشے کی طشتریوں میں تقریباً ڈیڑھ کلو بادام پیش کئے گئے تھے۔ جسے وہ شان بے نیازی کھا رہے تھے اور جگالی میں مصروف تھے۔ میں نے ان بکروں پر حسرت بھری نگاہ ڈالی کہ ملکوں ملکوں کی دشت نوردی کے بعد درہم و دینار، لیرا، و ڈالر کمانے کے بعد بھی ایسی پر تعیش حیات تو احقر کو بھی نصیب نہ ہو سکی تھی۔ مجھے ان بکروں کے معیار حیات پر رشک آ گیا۔ ایک قصاب جو شاید میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے قریب کھسک کر کانوں میں سرگوشی کی۔ ''جناب! یہ بکرا تو چائے کی فاضل پتیاں کھا کر فربہ ہوا ہے۔ یہ بادام تو نمائشی ہیں۔''

تب دل کو قرار آیا۔ رشک جاتا رہا مگر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہاں بھی پیشہ ورانہ سوچ کارفرما ہے۔ اگر کاروباری چشمک کے باعث یہ راز عیاں نہ ہوتا تو میں بے شک وشبہ تا عمر خود تو احساس کمتری کا شکار ہوتا اور بکرے کے فوق البشر ہونے پر ایمان لے آتا۔

ذہن کے کسی گوشے سے یہ سوال کلبلا اٹھا کہ بادام کی خوراک کا تعلق راست یاد داشت یا ذہانت سے ہے۔ بکروں کے دماغ کو ان باداموں سے بھلا کیا نشاستہ کشید کر سکتے ہیں؟ نہ تو بکروں کو انجینئرنگ، میڈیکل سائنس، ایجادات اور تحقیق سے واسطہ ہے۔ نہ ان کی نسل ہی ذہین وفطین ہو جانی ہے کہ وکالت کی جرح مقصود ہو۔ نہ ہی خلا میں متحرک سیاروں وستاروں سے ان کا علاقہ ہے۔ درحقیقت بادام کی خوراک ان بکرا فروشوں کو درکار ہے جنہوں نے انتہائے محبت میں اسرار خودی کے ہیرو شریف النفس بکروں بگڑے ہوئے نواب بننے کی ترغیب دے رکھی ہے۔ چند مرکھنے بکروں کے سوائے آپ بلا تامل تمام بکروں کو شریف النفس مخلوق کے زمرے میں شمار کر سکتے ہیں۔ البتہ چند مرکھنی بکریوں کی تشبیہہ محترمہ بیگم صاحبہ سے ناجائز بھی نہ ہوگی۔ ہاں اگر بکرا فروش اتنی محنت، نگہداشت اور توجہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر مرکوز کرتے تو یقیناً نسل نو کا نقشہ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

ایک صحت مند دراز قامت بکرا سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ ماشااللہ باریش، چہرے پر تدبر تفکر کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ میری دانست میں وہ بکرا یقیناً شاعر تھا۔ جس کا کوئی شعر کا یا تو قافیہ تنگ یا ردیف باغی یا بحر سے خارج ہو گیا ہوگا یا کوئی مصرعہ بری طرح اٹک گیا ہوگا۔ وہ غریق مشق شاعری تھا۔ فکر سخن میں غلطاں و پیچاں بحروں میں غوطہ زن تھا۔ مجھے اس کی شاعرانہ فطرت، سنجیدگی، بردباری اور مستقل مزاجی نے بڑا متاثر کیا۔ میرا چھوٹا بیٹا حد سے زیادہ شرارتی ہے اس نے اس بزرگ بکرے کی کمر پر ہتھڑ جمائے تو بکرے نے ذراسی کمر لچکا کر اپنے آپ کو

www.urduchannel.in

سنبھال لیا مگر چہرے کے تاثرات اور نرد بھاؤ تبدیل نہیں ہونے دئے۔ میں نے اس بکرے کے مالک بڑے میاں سے بکرے کے دام دریافت کئے تو انہوں نے مجھے درخور اعتنا نہیں جانا بدستور بیڑی کے لمبے لمبے کش کھینچ کر ان سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں نے دوبارہ سوال کا اعادہ کیا تو دام بتانے کی بجائے بکرے کے جائے پیدائش، طرز افزائش، حسب نسب، عمر وقامت کا ایسا دلربا منظر کھینچا جیسے مجھے بکرے کو دفتر میں ملازم یا خدانخواستہ داماد بنانا ہے۔ اس بکرے کے نیک چال چلن، ایماندار، محنتی اور خاموش طبع ہونے کے ساتھ ساتھ عادات واطوار کا مستقبل میں کوئی خاطر خواہ فائدہ متوقع ہو۔

میں نے جب تیسری مرتبہ دام دریافت کئے تو ٹکا سا جواب ملا۔ ’’پورے آٹھ ہزار روپئے نہ کم نہ زیادہ۔‘‘

میں حیران وششدر رہ گیا۔ بڑے میاں میرے سراپے کا جائزہ لے کر مجھے نظروں سے تول رہے تھے گویا ذبح کرنے سے پہلے قصاب بکرے کو دیکھتا ہے۔

میں نے گرہ لگائی۔ ’’حضرت میں نے ایک بکرے کا دام پوچھا ہے۔‘‘

وہ بھی تلملا گئے اور کہا۔ ’’میں نے بھی آپ کو دو بکروں کا دام نہیں بتایا ہے۔‘‘

میں نے دوبارہ جسارت کی۔ ’’اگر آپ دام کر دیں تو میں خریدنے پر غور کروں گا۔‘‘

بڑے میاں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ’’نکڑ والے وکیل صاحب نے ساڑھے سات ہزار کا مانگ لیا ہے۔ اگر میں اسے دیونار مارکیٹ (ممبئی) لے جاؤں تو پندرہ بیس ہزار سے کم دام نہیں ملیں گے۔‘‘

میں تاسف سے صرف اتنا کہا۔ ’’تب آپ کو اسے دیونار مارکیٹ روانہ کرنا ہی پڑے گا۔‘‘

میں گہری سوچ میں غرق ہو گیا کہ ہمارے ہاں شعرا اور ان کے ہاں بکروں کی قیمت میں اس قدر

تفاوت کیوں ہے؟

ایک بہت چاق و چوبند بکری جس کی رسی کافی لمبی تھی۔لہذا وہ بہت اچھل کود مچا رہی تھی۔کبھی چبوتروں پر چڑھ جاتی، قلانچیں مار کر نیچے اتر آتی،کبھی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی۔ مجھے گمان گذرا کہ یہ اضطراب ضرور محبوب کے انتظار کا غماز ہے۔ملاقات کی شدید خواہش نے بے قرار کر رکھا ہے۔اس دھما چوکڑی سے وہ اپنے مضطرب جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔کچھ منچلے بکرے بھی حسرت بھری نگاہوں سے اس کے دام الفت کے اسیر ہوئے جا رہے تھے مگر گلے میں پڑی ہوئی رسیاں مانع ملاقات و راز و نیاز تھیں۔میرا دل مسوس گیا کہ ظالم دنیا کے ہر عاشق و معشوق کو یہی افتاد لاحق ہوتی ہے اور صبر کا امتحان جان توڑ کر دینا ہوتا ہے۔جب میں نے اسی قصاب سے اس چنچل بکری کی بابت دریافت کیا تو وہ اس کو بکری کی پشت پر دھول (تھاپ) جما کر مخاطب ہوا ''یہ تو پٹھیا (باکرہ) ہے''۔

میرا ذہن فوراً اس چنچل بکری کی دوشیزگی کی طرف مبذول ہو گیا۔ہمارے ہاں تو دوشیزاؤں میں پس پردہ نرم خیالات اور گرم جذبات ہوتے ہیں۔مگر اظہار کچھ نہیں ہوتا کہ اقرار یا انکار کا عقدہ کھلے مگر بکری بیچاری رخ زیبا کی پوشش کے تکلف سے آزاد ہے۔اپنے دلی جذبات کے اظہار کے قید و بند سے بھی آزاد ہے۔کچھ ادنیٰ قسم کے لاغر بکرے زمین پر بیٹھے کمال مسکنت کے ساتھ جگالی کر رہے تھے۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بے چارے اپنے کسی عزیز کے چہلم میں شریک ہوں۔جہاں قرآں خوانی کے بعد بغرض ایصال ثواب کھانا کھلایا جاتا ہو۔ چہروں سے سوگ ٹپک رہا تھا۔۔پلنگ و بستروں پر براجمان بگڑے نوابوں کی جھوٹن بھی ان بے چاروں کو گاہے بہ گاہے میسر آجاتی تھی۔یہاں بھی طبقاتی فرق اور نسل پرستی کے عناصر یک دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ بنی نوع انسان نے معصوم جانوروں میں بھی عصبیت اور طبقاتی سطحوں اور ان

www.urduchannel.in

کے نمایاں فرق کو روا رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

چشم زدن میں منظر نامہ تبدیل ہوا زاویۂ نگاہ نے دوسرا منظر پیش کیا۔جہاں پلنگ بستروں پر ایستادہ بکرے سیاسی تحریکوں کے لیڈروں کے مقام پر کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ زمین پر بیٹھے ادنیٰ بکرے وہ احتجاجی کارندے معلوم ہو رہے تھے،جنہیں دہاڑی (روزانہ تنخواہ) پر اکثر ہانک کر یا خرید کر جلسہ گاہ میں لایا جاتا ہے۔متحرک چنچل بکری اس فعال لیڈر کی ترجمانی کر رہی تھی جو نعرہ زنی کر کے بھیڑ اکٹھی کرتا ہے۔

اچانک میرے شانے پر بوجھ محسوس ہوا۔جب میں نے مڑ کر دیکھا فاروق میرے عقب میں کھڑا تھا۔میں نے اپنی پسند اور مختص بجٹ کا ذکر کیا تو اس نے محو رقص بکری کی نا صرف وکالت کی بلکہ اسے بجٹ میں ہی دلا بھی دیا۔دام تھے چار ہزار روپئے۔میرے بچے بھی خوشی خوشی اپنے نئے مہمان کی آمد پر دوڑے۔جب ہمارا کاروں گھر پہنچا تو میں نے کھڑکی میں بیگم کو منتظر پایا۔وہ مسکرا کر ہمارا استقبال کر رہی تھیں۔ان کی امید جو بر آئی تھی۔میں نے چٹکی لیتے ہوئے کہا ''ایک محرم سالی ہی تھی بازار میں جسے میں محترمہ کی تنہائی کا خیال کر کے لے آیا ہوں۔اسے دوپٹہ بدل بہن بنالیں تو خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔بیگم شرما گئیں۔

۵۔ در پردہ نظر آئیں۔۔۔۔۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں　　اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

شہنشاہ ظرافت اکبر الہٰ آبادی کو بے پردہ بیبیوں کے پس پردہ عقل مرداں پر پردے نظر آئے۔ بھلا کیوں نہ ہو؟ مردوں کی ذات کو اللہ نے قوام مقرر فرمایا ہے۔ یہ علحدہ بات ہے کہ بے چارے مرد بقول غالبؔ

؎ خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟

کے پیش نظر ہر کس و ناکس ناز و ادا پر آفرین کہنے کے شوقین کم اور مجبور زیادہ ہیں۔ یوں تو پردے کا مقصد صنف نازک کے رخ زیبا کی پوشش کے علاوہ سارے جسم کا پردہ ہے تاکہ اغیار کی آوارہ و آلودہ نگاہیں ناوک انداز نہ ہوں۔ نسوانی جسم کے خطوط پوشیدہ رہیں تاکہ بوالہوسوں کو طبع آزمائی کا موقع نہ ملے۔ اس دور آگہی میں ہر شئے جہاں اختراع و ایجاد کے مراحل سے گذر رہی ہے۔ وہاں بھلا پردہ کیونکر پیچھے رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ برقعوں میں ہر جدید تراش خراش جا بجا کشیدہ کاریاں و گلکاریاں، نقوش و نگار اس قدر خوبصورت اور جاذب نظر ہوتے ہیں کہ فنون لطیفہ سے متعلق افراد انگشت بدنداں ہو کر برقعوں کے نقوش میں کھو جاتے ہیں۔ ان کی یہ بے ساختگی ناظرین پر گراں گذرتی ہے۔ فوراً ان کے دلوں میں گناہ کی کونپل پھوٹ پڑتی ہے۔ موصوف پردے میں پوشیدہ مال کا نگاہ آوارہ سے جائزہ لے رہے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ وہ ماہر فن دیکھ رہا ہے کہ

؎ ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار

مغربی معاشرے میں پردہ بیزاری اب گویا لباس بیزاری کی سبیل بن گئی ہے۔ حسن و

www.urduchannel.in

ادا، زیب و زینت اور پرکشش نظر آنے کی مقابلہ آرائی، ازلی خواہش اور باہم جذبہ رقابت نے لباس کو مختصر سے مختصر بلکہ چند چیتھڑوں پر مشتمل کر دیا ہے۔ جہاں پہلے صنف نازک کے جسم کے خطوط عیاں نظر آنے پر اختلاج و الجھن کا احساس ہوتا تھا۔ اب اسی صنف نازک نے لذت نمائش اور مردوں کی خاموش پذیرائی کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔

؎ حسن بیتاب ہے خود جلوہ دکھانے کے لئے

نازک اندام صنف نازک کی ذات میں حریص حسن حضرات کی نظر اپنا مطلوبہ نشاستہ تلاش کر لیتی ہے۔ ایسے مواقع پر صنف ناز کا تجاہل عارفانہ قابل دید ہی نہیں قابل عید بھی ہوتا ہے۔ یعنی جب سراپا حسن ہی سامان نمائش ہو جائے تو دیکھنے والوں کے بسمل ہونے پر یہ واویلا کیوں؟ یہ بھی سچ ہے کہ معصوم حسن کو احساس جرم کہاں ہوتا ہے؟ اس نئے رجحان کی آبیاری مشرق میں خیر سگالی کے جذبے کے تحت مغرب میں بے پردہ رہ کر تو مشرق میں در پردہ رہ کر فروغ پا رہی ہے۔ بعض قارئین کو ہماری نیت میں شکوک اور نظر ئیے میں بوالہوسی کے عناصر بھی نظر آجائیں۔ جنہیں یوں بھی عیب جوئی اور انگشت نمائی میں ملکہ حاصل ہے تو ہمارا عندیہ بھی اٹل ہے۔

؎ کچھ تو لوگ کہیں گے لوگوں کا کام ہے کہنا

ہم انہیں باور کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ہم بنی نوع آدم ہیں اور شجر ممنوعہ سے ہماری رغبت قطعی طور پر فطری ہے۔ باوا آدم کی اسی وراثت نے حیات دوام حاصل کی ہے۔

عصر حاضر میں برقعوں کی جدیدیت (فیشن) کے نام پر ایسے چست لباس وضع کئے گئے ہیں دو یا تھیلوں میں اناج بھرا ہوا ہو۔ نو آموز بچے جن کے کچے ذہن ابھی نسوانی جسم کے خطوط سے نا آشنا تھے۔ اب نت نئے فہم و ادراک سے باز یاب اور قبل از وقت بالغ النظر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان حقائق کا قبل از وقت انکشاف معصوم ذہنوں کو بالیدہ کرنے میں خاصہ معاون و مددگار

ثابت ہو رہا ہے۔ ازلی طور پر برقعوں کا رنگ گہرا سیاہ اور یکساں تھا۔ جس سے انفرادیت کی تخصیص دشوار تھی۔ مگر اب نت نئے رنگوں ڈیزائنوں، کشیدہ کاریوں، تراش خراش اور ہر سال ایک نئے تجربات (ماڈل) کی ایجاد کی گلکاریوں نے ایسے گل کھلائے کہ برقع پوش خاتون کی شناخت چنداں مسئلہ نہیں، بلکہ بعض اوقات مسائل کا حل بھی ہے کہ فلاں پرچونئے کی بیوی ہے، فلاں مرزا صاحب کی دختر نیک اختر ہے۔ فائدہ ہوا تو چھیڑ خوانی کرنے والوں کا۔ وہ اس طرح کہ انہیں چلتے پھرتے زنانہ اشتہار سے وہ خطرہ لاحق نہیں۔ ورنہ بوالہوس بھی خواتین کو چھیڑتے ہوئے خوف کھاتے تھے کہ برقع میں کہیں گھر کا مال ہی برآمد نہ ہو جائے اور خفگی وخشونت اٹھانی پڑ جائے۔

چمبل کے ڈاکوؤں نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی خاطر ناک پر کپڑا باندھ کر لوٹ مار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ تاکہ وہ بعد میں عوام یا پولس کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ یہ علحدہ بات ہے کہ برقع پوش خواتین بھی دلوں پر ڈاکہ زنی سے کب باز رہتی ہیں جس کا کسی تھانے میں چالان بھی قبول نہیں کیا جاتا۔ البتہ زمانہ ساز درزیوں (فیشن ڈیزائنروں) کو ڈاکوؤں کی ادائے کافرانہ خوب بھائی۔ جب مردوں پر اس طرح کے فیشن کا اطلاق محال نظر آیا تو ناقص العقل خواتین کو قائل کر کے ایسی بدعات کو رواج دے دیا ہے کہ بے چارے چمبل کے ڈاکوؤں کو اپنا شعار ترک کرنا پڑ رہا ہے۔ تاکہ کوئی انہیں نسوانی شباہت وعادات کا طعنہ نہ دے دے۔

خدائے بزرگ و برتر نے صنف نازک کو مخصوص جذبات ودیعت فرمائے ہیں۔ جیسے خود نمائی جس سے آئینے کی صنعت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

جب وہ کمال دل فروز صورت مہر نیم روز آپ ہی ہو نظارۂ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

چہرے کے عیوب کی تلافی اور کم عمر نظر آنے کی کاوش بذریعۂ ملمع کاری (میک اپ) کی جملہ مصنوعات کے کارخانے نہ صرف فروغ پا رہے ہیں بلکہ ان کی ہجرت مغرب تا مشرق بڑی سرعت

www.urduchannel.in

سے ہو رہی ہے۔ جسے ہم معاشی ترقی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مردوں کی خاطر حجاموں کے سیلون کا رواج تھا۔ خواتین نے اپنی آرائش وزیبائش کے لئے بیوٹی پارلر کی ابتدا کر کے بقدر ذوق کی تسکین حاصل کر لی ہے۔ دوسری قابل ذکر صفت ہے حسد ورقابت۔ ہر عورت دوسری عورت پر اپنی فوقیت کا سکہ جمانے کی خاطر ہر مرحلے سے ضرور گذرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ خواہ وزیب و زینت کی مصنوعات ہوں جیسے کپڑے گہنے و دیگر اشیائے آرائش وزیبائش ہوں۔ ان کے کاروباریوں کو ذریعۂ معاش کی سبیل قدرت نے بہم پہنچا دی ہے۔ جہاں وہ نباض کاروباری بھی ہر خاتون کو آپا جان، باجی، بہن جی کہہ کر کم منافع کمانے کی بجائے میڈم کہہ کر زیادہ منافع جیسے دوگنے چوگنے دام کشید کر لیتے ہیں۔ الغرض اس معرکۂ لالہ رخاں نے ایک مقابلہ جای اژدھام کی شکل اختیار کر لی ہے۔ خدا خیر کرے۔

بقول خواتین کے مردوں کی ذات جو روز اول سے ہرجائی، روباہ مزاج، مفاد پرست اور استحصال میں ماہر ہے۔ خواتین کی نادانی سے فائدہ کشید کر کے منفعت کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ وہ خود تو سر تا پہ سوٹ میں ملبوس اور بظاہر شریف ہوتا ہے۔ رہی ہی کسر جوتوں عینک ٹوپی وغیرہ سے ڈھک کر پوری کر لیتا ہے۔ مگر نیم عریاں خواتین کو اشتہارات، ٹی وی، میڈیا، ماڈلنگ اور کال سینٹر اور فرنٹ آفس اسٹاف، پرسنل سیکٹری یا سیلز گرل کے طور پر اپنے کاروبار کا لازمہ بنا چکا ہے کہ موسم کا حال اگر مرد بتائے تو سر میں نہیں سماتا مگر وی موسم کا حال صنف نازک سمجھائے تو چہرے پر فہمائش اور سر ہلا کر تائید کے آثار بھی نظر آجاتے ہیں۔ نتیجتاً مرد اپنے کاروبار سے نہ صرف مال و دولت کماتا ہے بلکہ صنف نازک کا طرح طرح سے استحصال کرنے سے بھی باز نہیں رہتا۔ یاں بھی حسن کی خود فراموشی اور بے نیازی قابل ذکر ہے۔ گویا

وا کر دئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

۶۔ہوتا ہے شب و روز۔۔۔۔

دنیا تو مملکت خداداد ہے۔ پھر بھی ہم بہت ساری مادی وغیر مادی اشیا کی ملکیت کے مجاز ہوتے ہیں۔اس کلیہ کے اعتبار سے کتابوں کے جملہ حقوق محفوظ کر لینا بھی مصنف کا آئینی حق اور اخلاقی فرض ہے یوں بھی شاعر و ادیب کے پاس صرف اپنا کلام ہی ہوتا ہے جس پر وہ اتراتا پھرتا ہے۔ورنہ زندگی کے اکثر گوشے تاریکی کی نذر ہو جاتے ہیں۔۔کچھ زمانہ ساز، دیدۂ گرگ باراں حضرات جن کی تعریف میں شہر عزیز کے شاعر ارشد نظر رطب اللسان یوں ہوتے تھے کہ

سرقہ چربہ ہے استفادہ ہے　　تیری اوقات سے زیادہ ہے
اس کے اُس کے قلم کی پیدائش　　تیرا فن تو حرام زادہ ہے

بعض اوقات ساری کتاب اور کبھی کبھی اقتباسات کا سرقہ، چربہ، استفادہ اور استحصال کے علاوہ ناجائز طور پر بلا اجازت برتنے میں عار محسوس نہیں کرتے تو شعرا و ادبا کے پاس یہی حربہ بچ رہتا ہے کہ کسی طرح اپنے کلام کے جملہ حقوق اپنے حق میں محفوظ کر لیں۔

عام طور پر زور دیا جاتا ہے کہ قارئین اردو مصنفین کی کتب، اخبارات و رسائل بعوض قیمت خرید کر پڑھیں۔جس سے مصنفوں، خوشنویسوں، پرنٹروں، پبلشروں کے ساتھ کتب فروشوں کو بھی مالی منفعت کا وظیفہ ملتا رہے اور اردو کی بقا، نشر و اشاعت و استحکام کی اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپا جا سکے۔ ہر چند کہ کتاب نویسی یا کتب سازی بالخصوص اردو طبقے میں آمدنی کا کوئی بہت مؤثر ذریعہ تو نہیں ہے۔ پھر بھی اس فلک بوس شرح بے روزگاری میں چار افراد کی کفالت کا وسیلہ بن جائے تو غنیمت ہے۔ورنہ اس ٹکنالوجی کے دور آگہی میں کمپیوٹر، ٹی وی، انٹرنیٹ، الکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا وغیرہ نے مذکورہ بالا پیشہ ور اافراد کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔فی زمانہ ان

www.urduchannel.in

پیشہ وروں کا شغل جہاد عظیم سے ہرگز کم نہیں۔جو کتاب بیزار معاشرے میں کتب سازی و کتب فروشی کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔گویا اندھوں کے شہر میں آئینہ فروشی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جنہیں جنون شوق میں نہ اپنی دال روٹی عزیز ہوتی ہے اور نہ اپنے اہل و عیال سے ہمدردی ہی ہوتی ہے۔گویا

؎ جو نہ اپنی آگ میں جل سکے وہ پرائی آگ میں جل گئے

مگر وہ بے چارے شوق کی تکمیل اور اولالعزمی میں اکثر و بیشتر افلاس، تنگ دستی اور مصائب کے سنگلاخ راستوں سے گذر جاتے ہیں۔وہ اس راہ پر خار کے سفر میں یوں خراماں خراماں گذر جاتے ہیں گویا تفریح کی غرض سے ٹہلنے نکلے ہوں۔

اکثر کتب کے جملہ حقوق ایسے اشخاص کے نام معنون ہوتے ہیں۔جن سے مصنف کا یا تو قریبی رشتہ ہوتا ہے یا گہری عقیدت منسوب ہوتی ہے۔اس پایۂ امتیاز کو پہنچنے کے لئے عمر رسیدہ ہونا اگرچہ مشروط نہیں ہے۔البتہ کتاب کی تیاری، ترتیب و تدوین اشاعت اور مقبولیت کے بعد اشاعت ثانیہ کا زمانہ آتے آتے موصوف کی عمر عزیز وفا کرنہ کرے۔

؎ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اکثر صاحبان جملہ حقوق اس وقت تک مرحومین کی فہرست میں شمار ہو جاتے ہیں۔عمر عزیز میں میسر نہ ہونے والی خوشیوں میں سے ایک خوشی کا موقع گنوا بیٹھتے ہیں۔اس پر آشوب دور میں جہاں عوام کی کتب بیزاری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔لہٰذا کتاب کی اول اشاعت کی فروختگی ہی خطرے میں ہوتی ہے۔پبلشر کو اپنی رقم لوٹ آنے کا یقین کم اور انتظار زیادہ رہتا ہے۔لہٰذا اشاعت ثانیہ کے لئے مرحوم صاحب جملہ حقوق سے پیشگی اجازت کے لئے ملک عدم کا سفیر ہونا پڑے گا۔اسی طرح رائلٹی ادا کرنے کا واحد طریقہ دعائے مغفرت رہ جاتی ہے۔جسے ان کی حقیقی

اولاد بھی کبھی کبھار ہی انجام دیتی ہے۔

انگریز ہم سے چار جوتا آگے ہیں۔ جنہیں مرنے کا یقین کم اور جینے کا اعتبار اور خوش فہمی زیادہ ہے۔ انگریزی کتابوں میں جملہ حقوق کے ساتھ یہ تنبیہہ بھی درج ہوتی ہے کہ قارئین اس کتاب ہا اس کے مشمولات کی عکسبندی، نقل اور چربہ سازی نہ کریں ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ ان کتابوں کے صاحب جملہ حقوق یا تو پردیس کے باسی ہوتے ہیں یا سورگباسی ہوجاتے ہیں۔ تنبیہہ درج کرنے والوں ذرا بھی اندازہ نہ ہوگا کہ ہماری قوم کے سارق طلبا جنہیں کتاب خریدنے کے سوا ہر قسم کی فضول خرچی اور بسیار خوری پر ملکہ حاصل ہے وہ وقت ضرورت اپنے مطلوبہ اسباق و اقتباسات کی فوٹو کاپی کروا کے اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ جس کی خبر صاحب جملہ حقوق تو کیا ان کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔ اس طرح کتابوں کے انبار تلے دب کر بسمل سبق ہونے سے بچ جاتے ہیں اور ساری کی ساری کتابی تنبیہات دیگر کتابی باتوں کی طرح سر سے بالا بالا ہی گذر جاتی ہیں۔ گویا سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

عصر حاضر میں جہاں علم و ادب کے حصول، ترویج و اشاعت اور بقا سے زیادہ ماحولیات کی بقا اور پیڑ پودوں کی حیات کو عزیز از جان رکھا جارہا ہے۔ اسی نظریئے کی پاداش میں PAPER FREE اور DUST FREE ماحول کی تیاری زوروں پر ہے۔ وہاں مذکورہ بالا پیشہ ور غالباً پتھروں کے دور کے معلوم ہوتے ہیں۔ جو تا دتحریر اسی قدیم روایات کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں اپنا یہ وعدہ یا دعویٰ اپنے ناشرین کی بدولت وفا نہ کر سکا کہ اگر میں کسی کتاب کا مصنف ہوتا (حالانکہ یہ غلطی پے در پے ہوتی رہی) تو اس کے جملہ حقوق آزاد و غیر محفوظ چھوڑ دیتا (ہم بے وفا ہرگز نہ تھے پر ہم وفا کر نہ سکے) بلکہ یہ اعلان رقم کرتا کہ برائے کر جہاں چاہیں، جیسے چاہیں اس کتاب کیا، اقتباسات کیا، تصاویر اور مشمولات کیا سب کی

www.urduchannel.in

فوٹو کاپی اور نقل کریں۔ مگر اس کتاب سے علم حاصل کریں۔ اس کے اقتباسات کو کسی کی طعنہ زنی کا سبب نہ بنائیں۔ نہ ہی ایسے حوالے دیں۔ بلکہ اس کا جائز استعمال کریں مگر ضرور باضرور پڑھیں تا کہ ہم سب مل کر جسٹس راجندر سچر کی رپورٹ کو جھوٹا ثابت کر سکیں۔ موصوف نے اقلیتوں کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔ ہماری عیب جوئی کی اور ہماری گوناگوں خوبیوں سے صرف نظر کر کے خود تو ممتاز ہو گئے۔

یہ بھی بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ مصنف کتاب کی تیاری کے دوران بڑا پر جوش ہوتا ہے۔ جیسے شادی سے قبل نوشہ۔ وہ اپنی نگارش کی ہر ممکن نوک پلک سنوارتا ہے۔ کتاب میں ہر ان روایتی خوبیوں کے اضافے کی تگ و دو شروع کر دیتا ہے۔ نگارشات کے متعدد نسخے بغرض تبصرہ و تجزیہ اکابرین فن حضرات کو روانہ کر دیتا ہے۔ جن کو اپنی خانگی زندگی میں تو وقت ہی وقت میسر ہوتا ہے مگر نسخہ پر نظر ثانی کا وقت ہمیشہ کم پڑ جاتا ہے۔ مصروفیات کے نت نئے بہانے تراشنے نیز پہلو تہی کی سبیل تلاش کرنے میں ماہرین فن ماہر ہوتے ہیں۔ کوئی صاحب عقیدتاً دیباچہ یا پیش لفظ یا اپنی بات تحریر کر کے روانہ بھی کر دیتے ہیں۔ مگر کوئی بقدر استعداد مصنف کے سوانحی خاکے کا خلاصہ لکھ بھیجتا ہے تو کوئی کتاب کی ظاہری ہیئت، سرورق تا تمت بالخیر، معیار طباعت، اور اوراق کی جنس پر اپنی آرا اور ارمان بھی خلوص سے ظاہر کر دیتا ہے۔ کسی کو اپنی علمیت کا بخار نکالنے کے ساتھ مصنف کی ذاتیات پر رقیق حملے کر کے اسے شفقت و محبت کے عنوان تلے پیش کرتا ہے۔ کسی کو مصنف کے تئیں مضحکہ خیز بے تکلف داستان کہنے پر دسترس ہوتی ہے۔ بعض اوقات مذکورہ مصنف کا تقابل جائزہ یا ایسے ادیبوں کے کلام کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے یا ایسے خام قسم کے ادیبوں سے کر دئے جاتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا محال ہو جاتا ہے کہ وہ توقیر ہے یا تحقیر۔ جن کی وقعت اس مصنف کی نگاہ میں دو کوڑی کی بھی نہ ہو۔ خون نقطۂ جوش کو پہنچ کر شریانوں میں کہرام مچا دیتا ہے مگر از راہ تعلقات و

پاس ولحاظ نقطۂ انجماد کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔ دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔ ترکش یاراں سے نکلے ہوئے تیر راست مصنف کے دل پر ناوک انداز ہوتے ہیں۔ گہرے گھاؤ پر مرہم کے پھاہے رکھنے کا احساس چند رسمی سے تصنع آمیز تعریفی و توصیفی کلمات کی ادائیگی سے رسماً انجام پاتا ہے۔ کچھ تبصراتی خطوط سے مداوے کی حاجت روی ممکن ہو جاتی ہے۔ گویا آبیل مجھے مار کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ الغرض

؎ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

البتہ ذوق کی تشفی ابھی کہاں نصیب! پبلشر کے اصرار اور جزوی مالی تعاون کی ایما پر رسم اجرا کا اہتمام ہوتا ہے۔ پبلشر کا تجارتی نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ کتاب کو شہرت، مقبولیت، ملے ہاتھوں ہاتھ لیجائیں۔ خواب خرگوش میں ڈوبی قوم کے خوابیدہ کانوں تک اس خبر کی آواز جرس تو پہنچے کہ کوئی نئی تصنیف بھی منظر عام پر قدم رنجہ ہوا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مشہور و معروف اخبارات میں مراسلے، تبصرے اور اشتہار کے تشہیری ہتھکنڈے بھی روبہ عمل لائے جاتے ہیں۔ پھر منصب صدارت کی خاطر کسی صاحب عقل و دانش کی بجائے صاحب مال و زر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جو اعزازیہ (کئی گنا زائد) قیمتیں ادا کر کے خرید سکتے ہوں۔ جس سے وہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ مصنف کو بھی رہین منت بنالیتے ہوں۔ خواہ کتاب خوانی یا اس میں شامل مشمولات سے انہیں دور کا علاقہ بھی نہیں ہوتا۔ انہیں بھی بھاری رقومات کے اصراف کے عوض 'سخن نواز'، 'ادب پرور' اور 'محسن ادب' کہلا کر مکھن لگوانے کی روایت بڑی عزیز ہوتی ہے۔ حقیقی فن شناس، قدرداں، شائقین عام سامعین کی صف میں کھڑے مصنف اور کتاب کی بن رہی درگت پر تالیاں بجاتے رہ جاتے ہیں۔ جیسے قوال پارٹیوں کے ہمنوا اپنے خاص قوال کی اتباع میں تالیاں بجا بجا کر خوش ہوتے ہیں۔

بعض مقررین تو قرار واقعی کتاب میں موجود محاسن، فن کی باریکیوں اور منفرد انداز سخن کی تعریف و ستائش کا برملا تذکرہ کر کے مصنف کا سینہ گز بھر کا کر دیتے ہیں۔ بعض مبصرین بے موقع بے محل نہ صرف روئے سخن اپنی جانب پھیر لینے میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ اپنی فوقیت اور مصنف کی خامیوں کی ایسی دردانگیز تنقیدیں کرتے ہیں کہ مصنف اپنی نشست پر بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا ہوتا ہے، اپنے کئے پر پچھتا رہا ہوتا ہے۔ مگر چہرے پر وہی نمائشی تبسم اور تائید میں سر ہلا کر میزبانی کا فریضہ انجام دینا گویا کلیجے پر پتھر کی بھاری سل رکھ لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ بعض مقررین حسن ظن کی رو میں بہہ کر کتاب کی ایسی ایسی خوبیوں کا ذکر کر بیٹھتے ہیں جن کا خواب و خیال بھی مصنف کو کبھی نہ گذرا ہو۔ بلکہ مصنف کے فہم و ادراک کی رسائی ابھی ان مقامات تک نہ ہو سکی ہو۔ آخر میں رندھے ہوئے گلے اور کھٹے میٹھے جذبات سے مغلوب ہو کر مصنف گلا صاف کر کے یوں اپنی نشست سے اٹھتا ہے۔

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

جیسے الیکشن میں جیت ہوا لیڈر اٹھتا ہے پھر وہ صدر نشست، پبلشر، پرنٹر، خوشنویسوں کے ساتھ ادب نواز سامعین اور دوست احباب کی شرکت کا شکریہ ادا کرتا ہے بعض اوقات ان کی آرا کے ردعمل میں اپنی ترجیحات، توجیہات اور وضاحت پیش کر کے رہی سہی نقد بھڑاس نکال لینے کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

ہماری عقل ناقص میں یہ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا کہ آخر اس سارے ادبی ہنگامے کا ماحصل کیا ہوا؟ عصر حاضر کے مادی دور میں ہر شئے کا نتیجہ خیز ہونا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ورنہ یہ ادبی ہنگامہ بیک وقت محنت، وسائل، وقت اور فن کا زیاں قرار پاتا ہے۔ اب

www.urduchannel.in

اگراس مرحلے میں کہیں بھی محاسن اوراصلاح کا پہلو سوجھے تو احقر کو ضرور باضرور مطلع فرمائیں تاکہ مصنفوں کو اس روایتی خواری کی عادت سے نجات دلائی جاسکے۔ان کی ادبی کاوشات کی حقیقی توقیر اورتوصیف کی کوئی سبیل تو نکلے۔

۷۔ مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

جب جوانی کا سورج عمر کے نصف النہار سے زوال پذیر ہوکر ضعیفی کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو انسان کی زندگی میں عجیب وغریب تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔جیسے نفسیاتی کیفیات، عادات واطوار،فکروتدبر،نقل وحرکت،گفتاروکردار،آواز و پرواز میں بھی بالیدگی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ضعیفی اپنے ساتھ جانے کتنے حیلے بہانے،عذر وراہ فرار کے حربے ساتھ لے کر رونما ہوتی ہے۔جہاں عفوودرگذر کا مادہ کم ہوتا ہے وہیں توقعات اورطلب احترام کا پیمانہ بھی بڑھ جاتا ہے۔توقعات وقت سے پہلے جوان ہوکر رشتوں کا نہ صرف امتحان لیتی ہیں۔جہاں ضعیفوں کو خواہشات یا اقوال کو نظرانداز کیا جائے تو ان کی ناک کی نوک سے غصہ پھسل کر زبان کی نوک پر آجاتا ہے اور آتش بازی کی ابتدا ہوجاتی ہے۔نسل نو اپنی ان غلطیوں کی پاداش میں زبانی خمیازہ بھگتنا پڑ جاتا ہے جس کی سنگینی سے ان کی واقفیت بھی نہیں ہوتی ہے۔نسلی فاصلہ رفتہ رفتہ ہر رشتے میں فاصلے کا سبب بن جاتا ہے۔جوانی کی خرمستیاں بڑھاپے کی دہلیز تک آتے آتے اختلاج کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔جہاں دیدہ، برگزیدہ،سن رسیدہ ہونے کے باوجود مطلوبہ قدرومنزلت سے محرومی،اختیارات کے اختصار کے باعث ضعیف حضرات کی جھلاہٹ طوفان کی طرح اپنے اخراج کے لئے اپنا راستہ ازخود تلاش کرلیتی ہے۔جسے نسل نو زیرلب 'بڈھا کھوسٹ' یا 'بڈھا سٹھیا گیا ہے' سے تعبیر کرتی ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

یوں تو سب سے کامیاب بڑھاپا وہ ہے جس میں احسن تربیت کے نتیجے میں کماؤ پوت موصوف کی ناز برداریاں اٹھاتے ہوں۔والدین کے ہر حکم کے پابند ہوں۔مگر آج کے پرفتن دور میں

www.urduchannel.in

جہاں خود غرضی، ابن الوقتی، مصروفیات، باہم مقابل آرائی، اخلاقی پستی نے رشتوں کے معیار کو بھی خالصتاً غرض سے وابستہ کر کے خلوص و محبت سے عاری کر دیا ہے۔ وہیں رشتوں کے معیار بھی یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ لہذا بڑھاپا ان خواتین و حضرات کے لئے مزید مشکل اور صبر آزما ہو چکا ہے بالخصوص جن کو پینشن یا ذاتی املاک کی سہولت میسر نہ ہوں۔ تیزی سے تغیر پذیر اقدار نے نسل نو سے تمام مشرقی آداب و اطوار اور جذبۂ خدمات گویا چھین لیا ہے۔ اب تو بزرگ موصوف خود خانماں برباد ہوتے ہیں۔ ان کے اندرون خانہ کا منظر نامہ یوں ہوتا ہے کہ بیٹے کی وفاداری کی لگام بجائے والدین کے سسرال کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ والدین سے زیادہ بیوی کے خوشیاں عزیز ہوتی ہیں۔ بیوی کے تابع فرماں بردار ہونے کا پیمانہ زن مریدی کے زمرے میں شمار کئے جانے کی حدود میں ہوتا ہے۔ اکثر گھروں میں تنخواہ زدہ، برسر روزگار بہو کے سر پر تاج حکمرانی آراستہ ہوتا ہے۔ بزرگ نگاہ نیچی کئے، بھیگی بلی بنے بیٹھے، اپنی عزت نفس کی الامان الحفیظ کے تسبیح خواں ہوتے ہیں۔ اس کے بجائے بزرگ حضرات 'یا شیخ اپنی اپنی دیکھ' کی بجائے اپنی بیٹیوں کی سسرال میں نظریں گاڑ کر بیٹھ کر جاتے ہیں۔

بزرگوں کو دن رات یہ فکر، اندیشہ اور تشویش زیر آتش پا رکھتی ہے کہ ان کی نازوں پلی بیٹیاں اپنی سسرال میں کیسے لامتناہی عذاب میں مبتلا ہیں۔ بیچاری ملازمت بھی کرتی ہیں، امور خانہ داری کی ذمہ داریوں کے بچوں کی پرورش اور اس پر ہٹلر نما شوہر کے احکامات کی پابند بھی ہوتی ہیں۔ مرے پر سو درے کے مصداق دور اور قریب کے دیگر سسرالی رشتہ داروں کی ناز برداریوں اور آئے دن میزبانی کی شمشیر برہنہ بھی ہمیشہ سر پر لٹکتی محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے بلکہ ''جو مضمون ادھر ہے وہ مضمون ادھر بھی''۔ دراصل ان بیٹیاں بھی اپنی سسرال میں تخت نشینی کا بھرپور لطف لیتی ہیں۔ وہاں بھی ان کا سکہ ہی رائج ہوتا ہے۔

www.urduchannel.in

اس کو کہتے ہیں کہ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، دوسروں کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے۔ بلفظ دیگر 'چراغ تلے اندھیرا' ہوتا ہے۔

ضعیف العمری کا یہ تقاضہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیشہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے گھر بھرا ہوا ہو۔ ان سے والہانہ محبت، شفقت اور لاڈ و پیار کا اظہار کریں۔ البتہ یہ نسل جدید ہے۔ وہ بزرگوں کی ضعیفی کے احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شوخیاں، حتیٰ کے بدتمیزیاں بھی کر بیٹھتے ہیں۔ بے جا ضد، شرارتوں اور اٹکھیلیوں کے ان کی جیب میں جو چند سکے بچ رہتے ہیں ان پر بھی اپنے حصۂ اسراف کا دعوی ٹھونک دیتے ہیں۔ مگر اس ستم بھی وہ ہنستے ہنستے نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ خوش بھی ہوتے ہیں۔

ضعیفی کا دشوار ترین تقاضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بڑے میاں اس سوچ میں گم ہوتے ہیں۔ بڑی توقعات یہ باندھتے ہیں کہ ان کی اہلیہ چوبیسوں گھنٹے ان کی خدمت عالیہ میں حاضر اور منتظر احکامات رہیں۔ نہ جانے کب حضور اعلیٰ کو کون سے حاجت، ضرورت درپیش ہو۔ ادھر زبان سے ادا ہوئیں کہ آن کی آن میں تکمیل کو پہنچ جائیں۔ حضرت یہ نہ سمجھتے ہیں نہ سمجھنے تو تیار ہوتے ہیں کہ اگر خود ساٹھ باسٹھ (سٹھیانے کی عمر) کے ہو گئے ہیں تو ان کی اہلیہ محترمہ بھی تو انسٹھ ساٹھ کی ضرور ہوں گی۔ اگر عمر کا تناب معکوس ہوا تو چونسٹھ پینسٹھ برس کی بھی ہو سکتی ہیں۔ تب سٹھیانے اختیار ان کو بھی ملنا چاہئے۔ البتہ یہ بات درست ہے بڑھاپا مخبوط الحواسی کی منزل سے گذرتا ہے۔ لہذا یوں بھی اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ ادھر تیر کمان پر چڑھے اور ادھر توپ سے گولے داغنے کی تیاری پہلے سے مکمل ہو چکی ہو۔ نتیجہ یوں ہوتا ہے کہ میدان کارزار گرم ہو جاتا ہے۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

ہر چند کہ اہلیہ کی باتیں، حکایتیں، شکایتیں خار مغیلاں کی طرح دل میں چبھتی ہوئی محسوس

ہوتی ہیں ۔اکثر درد وآلام کا دفتر کھل جاتا ہے ۔بہوؤں کی شکایات اور بیٹوں کی عدم توجہی کے گلے شکوے ہی موضوع سخن ہوتے ہیں ۔لہذا بزرگ کو لامحالہ یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بزرگ جب فارغ الاوقات بیٹھتے ہیں تو اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے چہروں، حرکات وسکنات میں اپنے بیٹے بیٹیوں کے شکل وصورت، شباہت ومماثلت، عادات واطوار کے علاوہ فطری خصائل بھی تلاش کر کے مسرور ہوتے ہیں گویا وہ متاع گم گشتہ ہوں ۔ان کی نشان دہی اور اس پر تبادلۂ خیال کر کے خوش ہوتے ہیں ۔بعض اوقات انہیں اباواجداد کی شباہت سے بھی منسوب کر کے انہیں بھی یاد کرتے ہیں ۔اپنے موجودہ مراتب کو فراموش کر کے نسل نو کی خوشنودی کے لئے عجیب وغریب حرکات سکنات، شکلیں بگاڑ کر آواز اور لہجہ تبدیل کر کے اپنے اندر نہ صرف بچکانہ عناصر پیدا کرتے ہیں بلکہ انہیں کھٹی میٹھی کہانیوں اور لطیفوں کے ذریعئے لطف انداز کر کے ان کے چہرے پر بکھرے معصوم تبسم اور کھلکھلاہٹ سے حظ اٹھا سکیں ۔لہذا بارہا ان میں بچپن اور پچپن کا فرق مٹتا ہوا نظر آتا ہے ۔ان بچوں میں اکثر اپنے بچپن کی محرومیوں اور نارسائیوں کی حتی الامکان کوشش کرتے نظر آتے ہیں ۔بچکانہ طرز گفتگو، لب ولہجہ، طفلانہ ذہنی سطح اختیار کر کے ان کی ہر خوشی کی تکمیل کی سعی کرتے ہیں تا کہ نسل نو پھولے پھلے، سلسلۂ نسب پروان چڑھے، ان وارثین کے توسط سے ان کا اپنا نام بھی بعز از وفات قائم ودائم رہے ۔چونکہ ہمیشہ سود بہر حال اصل سے پیارا ہوتا ہے ۔پھر بھی ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس فرزاں ہوتا ہے کہ

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا

بعض اوقات نسل نو بزرگوں کو اپنے سلوگ، گفتار، تاثرات، حرکات وسکنات سے یہ باور کروانے کی کوشش کرتی ہیں کہ اب آپ اپنی عمر جی چکے ہیں یا اپنی حیات مستعار کے سفر کے

www.urduchannel.in

اخیر پڑاؤ پر ہیں ۔اب نہ تو آپ کے اعضاو جوارح میں وہ قوت، شدت، حدت اور گرفت باقی ہے ۔نہ آپ کے دور کے فرسودہ قوانین اور اصول ہمارے زمانے میں رائج ہیں ۔بلفظ دیگر ہمیں نہ آپ کے تجربات سے سروکار ہیں اور نہ نصیحات سے علاقہ ۔نہ اب وہ ارزانی ہی ہے جو قصۂ پارینہ بن چکی ہے ۔لہذا اپنی سنہری یادیں اور اپنے کہنہ فکر رائے مشورے اپنے پاس رکھیں ۔نسل نو کو جدید دور کے تقاضوں مقابل آرائی اور رفتار کے شانہ باشانہ ہمقدم ہونے کا موقع فراہم کریں ۔ہر بات پر اپنے سابقہ تجربات کا دفتر لے کر دخل اندازی سے نسل نو کو معاف رکھیں ۔بلا وجہ روک ٹوک، قیل وقال سے گریز کریں بلکہ فراخ دلی سے نسل نو کی کامیابیوں کو قبول کریں، خوبیوں کا سراہیں ۔خامیوں، ناکامیوں اور غلطیوں پر لعن طعن اور طنز وتشنیع کی بجائے مشفقانہ نشاندہی اور اتلاف وتلافی کی ہدایات کریں ۔اپنے ماضی کے فخریہ حوالوں سے تو ان کے وقت کا زیاں، اور اپنی کم مائیگی کے احساس میں اضافے کا احتمال ہے تو بزرگ بھلے ظاہر نہ کریں مگر ان کے جذبات یہی ہوتے ہیں کہ

دنیا نے چھین لیں مرے چہرے کی رونقیں اب گھر کا آئینہ مجھے پہچانتا نہیں

کبھی کبھی ان کی اس سرکشی پر بزرگوں کو جلال بھی آجاتا ہے ۔وہ جذبات میں بے قابو بھی ہو جاتے ہیں ۔جہاں ان کے جہاں دیدہ تجربات، مشاہدات محسوسات اور نظریات کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے ۔تب وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ

جو چاہئے نہیں ہے مری قدر ومنزلت میں یوسفؑ بقیمت اول خریدہ ہوں

بعض بزرگوں کے ہاں جب نسل نو کی بیباک حرکتیں ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں تب عمر کے اس آخری پڑاؤ پر گھر کیا دنیا ومافیہا سے برگشتہ ہو کر ملا کی دوڑ مسجد تک کے عامل ہو رہتے ہیں ۔سادہ لباس، باریش اور سنجیدہ وبردبار صوم وصلواۃ کی پابند شخصیت مذہبی رجحانات میں گوشۂ

عافیت تلاش کر لیتی ہیں۔

جب میکدہ چھٹا تو اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اللہ اللہ کر کے سارا دن گذارتے ہیں۔ مسجد اور اس سے منسلک معمولات سے فراغت کے بعد گھر کے معمولی سودا سلف کی ذمہ داریوں سے بھی نمٹ لیتے ہیں۔ اکثر بیگم صاحبہ کے اعتراضات اور مباحث سے بھی نبرد آزما ہوتے ہیں کبھی بہوؤں سے باز پرس اور جواب دہی کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ بہوئیں بظاہر تو اپنے خسر کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں کرتیں مگر تخلیے میں شوہر کو سرگوشی میں ساری روداد نمک مرچ کی آمیزش کے ساتھ بڑی تفصیل سے پیش کرتی ہیں۔ جب شوہر کی زبان مرچ کے ذائقے سے آہ آہ کرتی ہے تو صبر کا ٹھنڈا پانی بھی خود ہی پیش کرتی ہیں۔ نتیجتاً بیٹے اپنے والد ماجد سے رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر اختیارات اپنے حق میں منتقل کر لیتے ہیں۔ لہذا بزرگوں کا یہ احساس غالب ہوتا کہ

ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے؟

بزرگوں کا ایک گروہ اہل مشرق کی قدیم روایات کے طفیل نہ صرف ضرورت سے زیادہ تنگ نظر، آمرانہ اقدار اور سخت گیر عادات کا حامل ہے۔ وہ اپنوں کی خطائیں تو بخوشی نظر انداز کر دیتا ہے۔ البتہ جہاں کہیں غصے جھلاہٹ یا مزاج کے گرانی کا اخراج مقصود ہو تو پھر انہیں غیروں کی اولاد ایک بہو کی شکل میں اور ایک بیٹا داماد کی شکل میں میسر آجاتا ہے۔ لہذا دامادوں پر زور نہیں چلتا۔ البتہ یہ ان کا واحد مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ وہ دن تمام بہو کی نگرانی، بے جا ڈانٹ ڈپٹ، طعن و تشنیع اور روک ٹوک میں صرف کر دیتے ہیں۔ وہ بہوئیں بھی خاموشی سے سر جھکائے سارے زبانی تیر اپنے کانوں پر کمال خوبی سے جھیلتی ہے۔ مگر وہ بہویں موقع پاتے ہی اپنا سارا بخار تنہائی میں حد درجہ احتیاط سے شوہر کے گوش گذار کر دیتی ہے۔ دل کی بھڑاس اس طرح نکالتی

www.urduchannel.in

ہے کہ خانہ جنگی اور خانہ بربادی کی بجائے گھروں میں دیوار یا گھر علحدہ کر لینے کی راہ ہموار کر لیتی ہے۔ گویا سو سونار اور ایک لوہار کی۔

بعض خانوادوں میں سعادت مند اور فرماں بردار بیٹے بے چارے اپنے جلاد نما والد کے آگے لب کشائی کی جرأت تک نہیں کرتے۔ وہ اپنے والدین کے کروڑوں احسان تلے دبے، خاموشی سے خون کے گھونٹ پی لینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ وہ مثالی بیٹے کے تصور کو زندہ کر کے غیر ارادی طور پر اپنے والد کے نظریئے کو تقویت پہنچا رہتا ہے۔ لہذا سربراہ خانہ بیٹے کو محکوم جان کر بہو پر اپنے مظالم کا سلسلہ دراز رکھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں موقع پرست ساس بھی بہوؤں کو خسر کے تیور سے خوفزدہ کر کے نہ صرف خسر کی جملہ خدمات کرواتی ہے بلکہ گاہے بگاہے اپنا الو بھی سیدھا کر لیتی ہے۔ اس اذیت ناک صورت حال میں بہوؤں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ خدا سے دعا گو ہوں کہ

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

داخلی معاملات میں ذلت و خواری کے بعد بھی بعض بزرگوں کو جب چین میسر نہیں آتا تو وہ اپنے غصے، جھلاہٹ، دل کے غبار کی نکاسی کی تدبیر گھر سے باہر نکالنے تلاش کر لیتے ہیں۔ گھر میں بھلے دو کوڑی کی عزت و توقیر میسر ہو یا نہ ہو۔ مسجد کے موذن صاحب اپنی تنخواہ حلال کر رہے ہیں یا مفت خوری میں مبتلا ہیں۔ یہ تشویش لاحق ہو جاتی ہے۔ صفائی کے لئے معمور کارندہ اپنے فرائض ٹھیک طور پر انجام دے رہا ہے یا ڈھرام ہو گیا ہے۔ اس کی فکر ہو جاتی ہے۔ وہ عوامی مقامات پر خدائی خدمت گار بن کر اس طرح کمزوروں پر اپنا بخار نکالتے نظر آتے ہیں، اپنا غصہ فرو کر کے عارضی تسکین اور وقتی بالادستی کے متقاضی ضعیف العمر حضرات پس پشت تمسخر اور طنز و مزاح کے زمرے میں یاد کئے جاتے ہیں۔ بقول غالبؔ

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اکثر ضعیف العمر حضرات اپنی وضع قطع، خوش پوشی اور زیب و زینت کے معاملے میں بڑے حساس واقع ہوتے ہیں۔ انہیں کم عمر اور جوان کہلانے کا خبط سوار ہوتا ہے۔ لفظ بوڑھا گویا ان کے لئے عیب یا سوہان روح بن جاتا ہے۔ وہ بے چارے وقتاً فوقتاً خضاب یا مہندی سے بالوں کے رنگ و روغن چڑھاتے ہیں تاکہ عمر رفتہ کی رنگینیاں اور سرمستیاں کسی قدر قائم ہوں۔ اعلیٰ اقسام کے چشمے گھڑیاں، سوٹ، ٹوپیاں اور پین وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے پس پشت ذوق کی تسکین سے زیادی عمر کی تخفیف کی نمائش کے شوق کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ ہفتے میں دو تین مرتبہ چہرہ بنوا کر بشرے کو تر و تازہ اور قابل اعتنا بنائے رکھنے کی سعیٔ ناتمام جاری رہتی ہے۔ بالفرض کسی نے مذاقاً یا سنجیدگی سے کم عمر نظر آنے کا موضوع چھیڑ دیا تو فوراً لہک لہک کر بہک بہک کر اور چہک چہک کر اپنی عمر عزیز کی تفصیل پیش کرنے سے نہیں چوکتے۔ سامع حضرات بھی بوڑھی زبان سے خود اپنی ہی تعریف سن کر چٹک چٹک کر چٹخارے لیتے ہیں۔ اشاروں اور کنائیوں میں حوالے بر موقع بر محل فقرے کسنے اور طنزیہ حوالے دے کر مزاح کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جب کہ حقیقت اس بات کی چغلی کھاتی ہے کہ

سلوٹیں یوں ڈال دیں چہروں پہ ظالم وقت نے　　جیسے کوئی ریشمی کپڑے کو مل کر چھوڑ گیا

حیرت سے نہ دیکھو مرے چہرے کی دراڑیں　　میں وقت کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح ہوں

بڑھاپے کے کئی عوامل میں سے ایک ہے اپنے ماضی میں جینا۔ حال پر کسی حال قانع اور شاکر نہیں ہونا اور مستقبل کے تعلق سے بے بنیاد اٹکلیں اور اندیشے قائم کرنا ہوتا ہے۔ کبھی بہت

www.urduchannel.in

تشویش، نہایت فکرمند تو کبھی آئندہ تمام افکار سے آزاد و بے نیاز ہو جاتا ہوتا ہے۔ راتوں کو نیند کم اور بوریت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ دن تمام مختلف عجائب الخلقت ہیجان سر پر سوار ہوتے ہیں۔ کبھی قنوطیت اور مایوسی کے آثار ابھر آتے ہیں۔ یہ پتہ تو ہے کہ بڑا سفر درپیش ہے۔ مگر حب الدنیا، اپنی اولاد، جاگیر، گھر بار اور زندگی کی الفت کے سراب کے پیچھے سرپٹ دوڑنے کی خصلت سے باز نہیں آتا۔ وہ باوجود ہزار کوشش اپنی تسکین کے ابدی عوامل تک نہیں پہنچ پاتا۔ مزاج کا اضطراب اور بے چینی اس بات کی غماز ہوتی ہے کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عوام الناس حعیف حضرات کی بے کلی، اضطراب، غیر معتدل مزاج اور نفسیاتی ہیجان سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ کبھی اپنی عزت نفس کے تحفظ میں کبھی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے۔ زبان بھلے گنگ رہے مگر دل میں یہی خیال آتا ہے کہ 'بڈھا کھوسٹ سٹھیا گیا ہے'، سچ بھی یہی ہے کہ

آخر وقت کیا خاک مسلماں ہوں گے؟

۸۔ بارے جوتوں کے کچھ بیاں ہو جائے۔۔۔۔

اسے ہم اپنی نادانی، کج فہمی یا معصومیت پر محمول کرتے ہیں کہ جوتوں کے ان کثیر المقاصد افعال اور صفات بابرکات سے بے خبر ہم اسے محض پاپوش ہی گردانتے رہے۔ ہماری ناقص عقل میں جوتے راہ پرخار ہو یا راہ پرخطر پیروں کی سنگ ریزوں کی محافظت کے لئے مستعمل ہی تھے۔ مگر رفتہ رفتہ جب جوتوں کے اوصاف حمیدہ اور خواص معنوی پم پر کچھ اس طرح منکشف ہوئے کہ ہمارے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جہاں کہیں افراط وتفریط کے مسائل درپیش ہوں وہاں جوتا دال بانٹنے کا اوزار بن جاتا ہے۔ عمومی طور پر جن کے خانوادے ابھی بھی مشترکہ انداز میں رہتے ہوں جوتوں میں دال دال بانٹنے کے بیچ خواتین کے دست مبارک سے یوں ہوتا ہے کہ ناداں مرد کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

؎ مرد ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر

لہذا اسی امر کے سبب بادی النظر میں بھرا پرا خوشحال خانوادہ نظر بد کا شکار ہو کر بکھراؤ کی نذر ہو جاتا ہے۔ تو سب سے زیادہ مسرت اس خانوادے کے بدخواہوں اور حاسدین کے علاوہ خاندان کی اسی تخم ریز موصوفہ کو ہوتی ہے۔

خوش ہو گئیں وہ، جوتے میں جب دال بٹ گئی مطلب کی تھی ان کی بات فوراً پہ پٹ گئی

خوشامد پرست، حاشیہ بردار حضرات خوشامد پسند امرا و روسا کے علاوہ صاحب اختیار کے پیروں میں سر دے کر ''حضور آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے'' کہہ کر اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں۔ سرعام جوتا مارنا گو بہت اچھا کام نہیں سمجھا جاتا۔ یہ عمل چھپ چھپا کر کرنے میں عافیت ہوتی ہے۔ البتہ شال میں لپیٹ کر جوتا مارنا بھی فنکاری اور کمال تصور کیا جاتا ہے جس میں جوتے کی سائز کا

www.urduchannel.in

دخل کم اور مفعول کے ذوق کا پیمانہ اور صورتحال دیدنی ہوتی ہے۔ اردو ادب میں جوتوں سے متعلق اس محاورے کی ترکیب قدرے شاعرانہ ہے اور فعل بھی شاطرانہ ہے کہ مفعول کے چہرے سے یہ تاثرات پکار اٹھتے ہیں۔

؎ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

بلفظ دیگر اسے ہم نثری شاعری کی نظیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان پر لطف معنویت کے حامل اشعار یا فقروں کو کوئی نکتہ داں یا نکتہ شناس ہی پا سکتا ہے یا وہ فریقین جن کے درمیان باہم جوتم پیزاری کا سلسلہ دراز ہو۔

روزمرہ کے معمولات ومشاہدات میں کسی بے غیت عاشق کا غیرت مند دوشیزہ کی جوتیوں سے پٹ جانا یا کسی نکمے، نالائق شوہر کا اپنی برسر روزگار شریک حیات کی جوتیوں سے تواضع کیا جانا اس قسم کے حادثات اکثر رونما ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف جہاں غیرت کا تقاضہ ہے تو دوسری جانب بے غیرتی سے واسطہ ہے۔ شریف الطبع دوشیزہ ہو یا حلیم و بردبار بیوی جب دونوں کی قوت برداشت کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ لہذا جوتا گھر کے باہر تربیت کا اوزار بن جاتا ہے۔ جب بے غیرت شوہر اور عاشق نامراد اپنے انجام کار کو پہنچ جاتے ہیں تو یہی اوزار مرمت جوتا ان کی اصلاح کرتا نظر آتا ہے۔ تب وہ تلملا کر اس بات کا اقرار کر لیتے ہیں کہ

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا ہم ہی کر بیٹھے تھے ان کو پیش جوتی ایک دن

جوتوں کے سیاسی افعال زیادہ دلچسپ اور توجہ طلب ہوتے ہیں۔ اسی جوتم پیزاری کے اشتیاق نے بغداد کے معصوم صحافی منتظر الزیدی کے اس بے اختیار عمل کو راتوں رات عالمی شہرت کا حامل بنا دیا۔ جوتوں کے اس تاریخی استعمال کو ضبط تحریر میں نہ لانے سے انشائیہ کی صحت متاثر ہوتی ہے کہ نمرود وقت اور جارج بش جیسے فرعونی و بددماغ کرداروں کے دماغ درست کرنے کا واحد کار

آمد، ارزاں اور ٹکنالوجی کے تکلفات سے آزاد ہتھیار جوتا ہی ہے۔ بقول شاعر

نہ توپوں نے بش کو نہ راکٹوں نے مارا　　اسے مارا تو دو جوتوں کے خالی وار نے مارا

اس معصوم نے اپنے باپ سیدنا ابراہیمؑ کی پیروی میں شیطان (جمرات) پر کنکری میسر نہ ہونے پر جوتا مارنے کی سنت پر عمل کیا تھا۔ مگر اس کی اخلاقی جرأت کو کل کائنات عالم نے سلام پیش کیا۔ لہذا جوتا بعض اوقات اوزار عبادت اور بسا اوقات شہرت بھی بن جاتا ہے بشرطیکہ شیطان مردود پر مارا جائے۔ جس سے نہ صرف جوتوں کی قدر و منزلت بلکہ قیمت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے۔ آپ کو نہ صرف سر آنکھوں پر بٹھایا جائے بلکہ چشم زدن میں عالمی تشہیر اور وقار بھی قدم چومے۔ بس جوتے مارنے کی سب سے اہم شرط ہے انتخاب ہدف۔ اگر ہدف کا انتخاب لاجواب ہوا تو ہر انصاف پسند نہ صرف آپ پر رشک کرے گا بلکہ بانگ دہل کہہ اٹھے گا۔

نصیب بگڑا ہوا اس طرح سنواروں گا　　کسی وزیر کو جوتا چلا کے ماروں گا

برصغیر ہندو پاک کو اہل مغرب کی عادات و اطوار کی تقلید، بلکہ استفادے، سرقے، چربے کا اعزاز بہت خوب حاصل ہے۔ لہذا اسی بنا پر درج بالا عمل کا کامیاب تجربہ بھی بار بار کیا جاتا رہا ہے۔ بلکہ سستی تشہیر اور آن کی آن میں زبان زد خاص و عام ہونے کا شرطیہ طریقہ ہی بن گیا ہے۔ جوتوں کی سیاسی اہمیت یوں بھی ہے کہ آپ وزرا کے جوتے سیدھے کر کے مالی منفعت اور سرکاری منصوبوں کا پرکشش فیض اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح جوتا سیاسی بازیگری کا اوزار بھی بن جاتا ہے۔ جسے جوتے چاٹنے پر بھی محمول کیا جاتا ہے۔ گو جس کا تصور طبیعت مکدر کر دے مگر کم وقت میں مقدر سنوارنے کا عمل بھی ہو سکتا ہے۔

جوتے خواہ کتنے ہی قیمتی اور صفات جمیلہ کے حامل ہوں۔ بہر حال سر پر نہیں پہنے جاتے۔ جوتوں کا مقام پیروں میں ہے جو پیروں میں ہی بچتے ہیں۔ فی زمانہ کی مقابل آرائی نے

www.urduchannel.in

جوتوں کو بھی تشخص کی بعض علامتوں میں شامل کر دیا ہے۔ مردانہ جوتے جہاں شخصیت کی زیب و زینت، مردانہ وجاہت اور رعب داب کا سبب بنتے ہیں۔ وہیں زنانہ جوتیاں نزاکت ولجاجت، حسن آرائش و زیبائش کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں۔ عام آدمی کے جوتے چٹخارنے سے ان بیش قیمت جوتوں کو بھلا کیا نسبت؟

جوتے اور مساجد کا تعلق ازل سے مشہور ہے۔ جوتے مسجد میں داخل ضرور ہوتے ہیں۔ مگر وہاں پہنچتے ہی اپنی یادداشت بھول جاتے ہیں۔ نہ جانے کیوں اپنے وزن دار مالک کی وفاداری سے تائب ہو جاتے ہیں۔ اس سادگی میں کب وہ دوسرے ہلکے شخص کی ملکیت میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں احساس تو نہیں ہوتا۔ البتہ پرانے مالک کا کف افسوس اور نئے مالک کی تبدیل شدہ چال تفاخر دیدنی ہوتے ہیں۔ جوتوں کی اس بار بار بے وفائی اور مالی خسارے کے پیش نظر بیشتر افراد کے ہاں نماز جمعہ یا مسجد کے مخصوص جوتوں کا نظم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان ہی شاندار جوتوں کی محبت اکثر و بیشتر خالق و مخلوق کے تعلق میں پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہے۔ جوتا یہاں اوزار شیطانیت بن جاتا ہے۔ بالخصوص بوقت نماز ان کی کیفیت یوں ہو جاتی ہے کہ

آخری صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　تاکہ جوتوں کی حفاظت بھی رہے وقت نماز

بعض ناعاقبت اندیش حضرات کو بازار سے جوتے خریدنے کے مرحلے میں جیب ہلکی ہونے کا خوف ستاتا ہے۔ قلاش اور بے بساط ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جوتوں کا معیار جوں جوں بلند ہوتا جاتا ہے توں توں قیمتیں بھی فزوں تر ہوتی جاتی ہیں۔ لہذا وہ جیب ہلکی کرنے کے فعل سے گریز کرتے ہوئے تن آسانی کے لئے مسجد کا رخ کرتے ہیں۔ ان کا مقصد خدا کو نہ یاد کرنا ہوتا ہے نہ خدا سے جوتے طلب کرنا ہوتا ہے بلکہ ان کی نیت اور بعض اوقات قسمت میں جوتے ہوتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر جوتے چرانے کا عمل کرتے ہیں۔ مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ

مسجد خدا کا گھر ہے یہاں اول آخر خدا ہی یاد آتا ہے۔ بقول شاعر

جوتوں کے انتخاب کو مسجد میں ہم گئے　　وہ جوتیاں پڑیں کہ خدا یاد آگیا

وہ بے چارے جوتے تو سر پر کھاتے ہیں مگر جوتے کے مالک سے نہ چاہتے ہوئے بھی رشتۂ نسبت جوڑ بیٹھتے ہیں۔ جوتے چرانے کا عمل عموماً برادر نسبتی (سالے) ہی کرتے ہیں۔ چونکہ اس رشتے کی ابتدا ہی رسم جوتا چرائی سے ہوتی ہے۔ یہ رشتہ اس شدت تک استوار ہو جاتا ہے کہ

ساری خدائی ایک طرف　　جورو کا بھائی ایک طرف

ہمارے مہذب معاشرے میں جوتے کی اہمیت و افادیت بطور آلۂ پیمائش بھی رائج ہے۔ بیٹا اگر کوئی کارہائے نمایاں انجام دے تو اسے 'بیٹا باپ سے چار جوتا آگے ہے' کہہ کر تعریفی کلمات سے نوازا اور مبارک باد دی جاتی ہے۔ خصوصاً یہ طریقۂ پیمائش اساتذہ، بزرگوں اور جہاں دیدہ اشخاص کا ہوتا ہے۔ جن کی جوتیاں سیدھی کرنا ان کی تکریم و تعظیم کا پیمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بھی قول رائج ہے کہ جب باپ کی جوتے بیٹے کے پیروں میں آجائے تو یہ پیمائش اس بات کی نوید ہے کہ برخوردار شادی خانہ آبادی کی منزل کو پہنچ چکے ہیں۔ لہٰذا والدین کے کان کھڑے ہو جانا لازمی امر ہے کہ بہو کی تلاش میں جوتیاں چٹخارنے کا وقت سر پر آپہنچا ہے۔ ورنہ کہیں بیٹے صاحب دیدہ دلیری سے آنکھوں میں جوتا پہن کر گھس گئے تو صورتحال بگڑنے میں وقت کہاں رہ جاتا ہے؟

جب جوتوں کو اپنے سابقہ استعمال سے زیادہ معنوی قدر و منزلت کا احساس ہوا تو وہ بھی سر چڑھ کر بولنے لگے۔ گذرتے وقت کے ساتھ جوتے اس قدر مہنگے ہو گئے ہیں کہ ہمہ اقسام تاج، کلاہ و پپاخ، ٹوپیوں کی قیمت پر سبقت لئے جا رہے ہیں۔ اب تو کسی کو یہ حوالہ دیتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا ہے کہ سر کی ٹوپی سر کو اور پیر کے جوتے پیروں کو زیب دیتے ہیں۔ بالفرض جوتے نے یہ سوال کر دیا کہ دونوں میں سے کون قیمتی ہے؟ تو یقین جانئے کہ جواب نہیں بن

www.urduchannel.in

پڑے گا۔ اس ہزیمت سے بچنے اور جوتوں کے قیمتی اور گراں قدر ہونے کے اعتراف میں بارہا جی چاہتا ہے کہ جوتوں کو سر پر رکھ لیں۔ مگر تشبیہہ نمرود سے خوف آتا ہے۔ کہیں ناظرین کا ذوق انہیں عملی طبع آزمائی کی دعوت اور ہمارے سر کو جوتوں کی ضرب کی دعوت نہ دے بیٹھے۔ چونکہ مچھر بھی بے شمار ہو گئے ہیں۔ نہ جانے کون سا مچھر ہمارے کس گناہ کی پاداش میں ناک میں گھس جائے اور عوام الناس کو جوتم پیزاری کا لطف بالکل مفت میں آجائے۔

جزیرہ نمائے سینا میں ضرب کلیم سے پتھروں سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تھے۔ ہزل نگاروں کے سر پر جب پاپوش باری یعنی جوتوں کی برسات کی جائے تو ان کے طباع دماغوں سے ہزاروں مزاحیہ خیالات کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ جن میں جوتے ہی جوتے نظر آتے ہیں۔ صاحب ناپ (اوصاف) اپنا جوتا (مفہوم) از خود جان پہچان لیتا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جوتوں کا سب سے خوبصورت بے شمار، بااعتبار اور بے اختیار استعمال ہزل گو شعرا نے ہی کیا ہے۔ جوتوں کی جتنی مؤثر تشہیر ان شعرا نے اپنے کلام کی ہے وہ کسی بھی اشتہاری کمپنی کی سوچ سے بھی بالاتر ہے۔ خود جوتا ساش کمپنیوں کے وہم و گمان اور قیاس میں بھی یہ بات نہ آسکے گی کہ جوتے اس قدر کثیر المقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

تنہا گھر بھر سے لڑے ہوں تو ہزل ہوتی ہے　　سر پہ جب جوتے پڑے ہوں تو ہزل ہوتی ہے

تن پہ سوٹ، پاؤں میں جوتے پھٹے ہوئے　　ہنستے ہیں سب چمار مجھے دیکھ دیکھ کر

اس کو کہتے ہیں مقدر اس کو کہتے ہیں نصیب　　رات ان کی بزم میں جوتا چلا تھا میں نہ تھا

ان کی جوتی کے تلوے پہ فوٹو مرا　　قرب ان کا مجھے ایسے حاصل ہوا

اب شب ہجر خوب گذرے گی　　ان کی جوتی چرا کے لایا ہوں

درج بالا شعار کے طفیل عشاق نے جوتوں کی اس قدر عزت افزائی کی ہے جو شاید کسی اور کے بس کی بات ہو۔ اس معاملے میں عشاق نے جوتوں سے متعلق حسن ظن، خوش گمانی اور تعریف میں جوتوں کو قرارقعی سر پر بٹھالیا ہے۔

۹۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

خطابات ہر زمانے میں عزت، عظمت، قدر و منزلت، مقبولیت اور کشش کا مظہر تسلیم کئے گئے ہیں۔ شاید آئندہ بھی تسلیم جاتے رہیں۔ کسی بھی فنکار کو اپنے فن کے مظاہرے میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ دیگر صلاحیتوں مثلاً سیاسی بازیگری، شطرنج کی بساط، ہوا کا رخ، عنان اقتدار کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ کچھ جی حضوری، تعلقات اور وسائل کی وسعت کے جوہر جیسی امتیازی خصوصیات اور ان کے بروقت استعمال کا فہم و ادراک ضروری ہے۔ نہ جانے کون ساحربہ کس جگہ کارآمد ثابت ہو۔ گو خطابات کے حصول کے لئے فن اور صلاحیتوں کا غیر معمولی مظاہرہ اولین شرط ہے۔ ان خصوصی اور گوناگوں اساسی شرائط سے متاثر ہو کر ہی عہد ماضی میں بادشاہ، نواب، حکومتیں اور زمانۂ حال میں انجمنوں اور اداروں کی جانب سے چیدہ چیدہ شخصیات کو خطابات تفویض کئے جاتے ہیں۔ تا کہ ان کی باکمال فنکارانہ صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا جا سکے۔

فی زمانہ بھی خطابات کے دم چھلے اپنے حاملین کے اسمائے خاص سے منسلک ہو کر ان کا سینہ دائماً گز بھر کا کر دیتے ہیں لہٰذا وہ پھولے نہیں سماتے۔ جس سے انہیں اترانے، فخر کرنے اور بعض اوقات شیخی بگھارنے کا جواز بھی فراہم کر دیتے ہیں۔ بدلتی ہوئی اقدار نے پیمانۂ انتخاب کو مخصوص نئے عوامل نے خوب متاثر کیا ہے۔ جو بظاہر نظر نہیں آتے بلکہ پس پردہ متحرک و سرگرم ہوتے ہیں۔ جیسے رشتے ناطوں کی محبت کے نازک بندھن، سفارشات، وسیلے بازی، رشوت ستانی اور 'من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو' جیسے عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ بعض اوقات صاحب اعزاز کو اس شرط پر اعزاز تفویض کیا جاتا ہے جب وہ اس کے ذیل میں مختص شدہ رقم لینے سے انکار کر دے اور یہ رقم ادارے کے کارندوں میں باہم مساوی تقسیم کر لی جاتی ہے۔ دوسرے طریقہ

www.urduchannel.in

انتخاب میں چور راستے پیدا کر کے ابن الوقت صاحبان اعزاز نے مذکورہ امر کو قدرے سہل اور راست قابل خرید و فروخت بنا دیا ہے۔ تا کہ ایوارڈ جیوری بلا وجہ کی مغز ماری اور دماغ پاشی سے محفوظ رہے۔ ججوں کو بھی مالی منفعت کا لطف مل جاتا ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں فی زمانہ کے مشہور و معروف فلم سپر اسٹار ہیرو بھی اس آنکھ مچولی کے ملزم خاص رہ چکے ہیں۔ غالباً وہ اس وقت اناڑی اور زمانہ سازی میں کورے بلکہ کور چشم تھے وقت گزرتے ہی وہ اس فن کے پختہ کار کھلاڑی ہیں۔

کبھی سیاسی مصلحت کے پیش نظر بعض اشخاص کو بھی ایسے خطابات تفویض کئے جاتے ہیں جو رشوت کی نظیر ہوتے ہیں۔ جن سے سیاسی بازیگری میں رخنہ اندازی اور ارباب حکومت کے عیوب اور اسکینڈل آشکارہ ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا صاحب خطاب حضرات اس پندار کے نشے اور سرور میں خود تو خواب غفلت سے لطف انداز ہوتے ہیں ساتھ ساتھ عوام کو بھی تھپکیاں دے کر سلانے کی ناکام سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ ارباب تقسیم خطابات کے وقت اپنے مفید، مطیع اور فرمانبرداروں و ہمنواؤں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تا کہ آئندہ انتخابات میں نہ صرف ان کی وفا شعاریاں برقرار رہیں بلکہ شطرنج سیاست کی بساط پر یہی مہرے کارآمد ثابت ہوں۔

تقسیم ہند کے وقت کانگریسیوں نے صوبۂ سرحد کی عوام کے تحفظات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ انہیں مسلم لیگ کے سپرد کرتے وقت ان کے سربراہ خاں عبدالغفار خان کو ان کی تمام وطن پرستی کا صلہ ''سرحدی گاندھی'' کے خطاب کی شکل میں دے کر اپنا پلہ جھاڑ لینے میں عافیت جانی اور اپنی سیاسی طوطا چشمی کا ثبوت دیا۔ ماضی میں متعدد ایسے سیاسی رہنماؤں کو قابل فخر و گرانقدر خطابات سے نوازا گیا جو بوفورس اور دیگر وطن فروشی کے اسکینڈلز کے ملزم و مشکوک رہ چکے ہیں۔ یہاں ان خطابات کی اہمیت و افادیت صاحب خطاب کی پردہ پوشی اور بے گناہی ثابت کرنے کی

www.urduchannel.in

ضمن میں تفویض کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان معاملات کے مقدمے ابھی زیر سماعت ہیں اور اب تک عدلیہ کی تاریخوں کی گردش لیل و نہار میں نہ جانے کتنے غوطے کھا چکے ہیں۔ بعض تو ایسے سیاسی رہنما بھی مجاہد آزادی کے خطاب و مراعات کے سزاوار رہ چکے ہیں جو یا تو انگریزوں کے مخبر (وفادار) تھے یا یوم آزادیٔ ہند کے وقت شیر خواری کے مزے چکھ رہے تھے یا گہواروں میں کھیل کود کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

برطانوی تسلط کے دوران تحریک ترک موالات اور عدم تعاون تحریک کے زیر اثر بیشتر وطن پرست رہنماؤں نے برطانوی حکومت کو سر کا خطاب لوٹا کر اپنی حب الوطنی، انسانیت دوستی اور قربانی کا منہ بولتا ثبوت پیش کیا تھا۔ فی زمانہ مفاہمتی سیاست بھی خطابات کے مرحلۂ انتخاب کی محرک و مرکز ہوتی ہیں۔ اب مرحلۂ انتخاب صرف قابلیت اور فنکاری کے خصوصی اوصاف سے طے نہیں کیا جاتا۔ اس میں مصلحت کوشی کا شیوہ بھی غیر محسوس طور پر در آتا ہے۔ جیسے اقربا پروری، رشوت ستانی، سیاسی مصلحت پسندی اور کسی مخصوص ذات فرقے اور طبقے کی محبت بھی اس عمل میں دخل انداز ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ عمل سراسر بشری کمزوریوں کا سزاوار ہے۔ اس کا معکوس اثر خطابات کی اہمیت و افادیت پر رفتہ رفتہ یوں پڑ گیا کہ یہ خطابات اپنی وقعت اور اعزاز کھو چکے ہیں بلکہ کئی خطاب یافتگان مرد و خواتین مشکوک بھی گنے جاتے ہیں کہ کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں؟

اکثر صاحبان خطاب جو خطابات کے لئے نامزد کئے جاتے ہیں۔ وہ تقسیم خطابات کی تقریب میں بھی اکثر بیماری اور کبھی بیرون ملک کے سفر کے عذر پیش کر کے اپنی کمال انکساری، بے گناہی، بے اعتنائی اور بے نیازی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد عوام الناس کو یہ باور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ ان کی اپنی نظروں میں ان خطابات کی وقعت اور قدر و منزلت کس پائے کی ہے۔ نہ انہیں عنان حکومت کے تفویض کردہ خطابات سے علاقہ ہے اور نہ ہی ان کی ذیل

میں میسر وہ تمام مالی اعانت اور سہولیات ہی عزیز ہوتی ہیں۔ بعض حق گو ادبا،شعرا صحافی حضرات کےنزدیک ان خطابات کی قدر اس درجہ انحطاط پذیر ہو چکی ہیں کہ جہاں اپنے نقطۂ نظر سے حکومت کے مفاد متصادم ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہاں صاحب خطاب اپنا عندیہ منوانے کے لئے حکومت سے اختلاف رائے کی پاداش میں عنان حکومت کو خطابات کو لوٹا دینے کی نہ صرف دھمکی دیتا ہے بلکہ بعض اوقات اسے بھی کر گذرتا ہے کہ

لو، آج باز آگئے تیری بندگی سے ہم

بلاشبہ ان گراں مایہ خطابات میں آج بھی تازہ واردان بساط ہوائے دل کے لئے بے پناہ کشش موجود ہوتی ہے۔ البتہ خطابات کے لئے بار اول منتخب کئے جانے والے خطابات کے پس پردہ سیاسی بازیگری سے وہ ناداں قطعی طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔ حقائق سے واقف کہنہ مشق واقف کار خطاب یافتہ پرانے شکاری یعنی گرگ باراں دیدہ کی آگہی ایک طرف، البتہ خطابات کی کشش، حصول کا جنون دوسری طرف اسے باہم مصروف کشمکش رکھتا ہے گویا

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ہمیں نہ تو خطابات کی اہمیت سے انکار ہے اور نہ خطاب یافتگان کی ہجو ہی مقصود ہے۔ نہ ان سے خدانخواستہ کوئی حسد، حسرت یا رشک کا جذبہ ہی کارفرما ہے۔ نہ ان کی توہین و تذلیل اور کردار کشی سے علاقہ ہے۔ بلکہ ہمارا نظریہ تو ہے کہ خطابات دراصل صاحب خطاب کو گمنامی کے اندھیروں سے نکل کر شناخت عامہ کی روشنی فراہم کرتے ہیں۔ الحمد اللہ احقر، زیر نظر کتاب تصنیف کرنے کے سلسلے میں صوبائی اردو اکادیمی کے خطاب اور نذرانے کا مستحق ۲۰۱۲ میں قرار دیا جا چکا ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق اکثر و بیشتر خطابات اپنے حاملین کو عزت، مرتبہ اور موجب احترام بنا

www.urduchannel.in

دیتے ہیں۔ جس کا فائدہ یوں ہوتا ہے کہ جملہ تقاریب کے دعوت نامے ہوں یا اخبار کی خبریں، مراسلے یا اشتہارات ہوں، خط و کتابت کے پتے ہوں یا مکان پر آویزاں تختیاں ہوں، لوح زباں ہو یا لوح تربت الغرض ان معنوں میں یہ خطابات اپنے حاملین کو بعد از موت بھی دائمی حیات بخشتے ہیں۔ لہذا چوری کے راستے خطاب یافگان کو نوشتۂ دیوار پڑھ لینا چاہئے کہ کل کلاں کو کوئی یہ کہہ دے کہ

مر گیا مردود نہ فاتحہ نہ درود

اگرچہ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ خطابات کے لئے خطاب یافتگان کے ناموں کے اعلانات ہوتے ہی مذکورہ شخصیات کا صحیح تصور ان کے سیاہ و سپید کارناموں کے ساتھ ذہن میں سما جاتے ہیں۔ مختلف عمر کے فنکاروں اور صاحبان خطاب کی تاعمر خدمات کے اعتراف اور خطابات کا اعلان اس قدر تاخیر سے ہوتا ہے کہ خ طاب یافتگان کی کیفیت یا تو بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑنے یا پس مرگ دیا جاتا ہے۔ کتنے ہی بے چارے خطاب یافتگان وہیل چیئر پر بیٹھ کر تمام عمر کا حاصل خطاب حاصل کرنے با دقت تمام اسٹیج تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ جن کی کسمپرسی، کی حالت دیکھ کر یہ گمان گذرتا ہے کہ خطاب کی بے پایاں خوشی میں کہیں موصوف شادیٔ مرگ میں کہیں آنجہانی نہ ہو جائیں۔ گویا کسی عاشق کی طرح شوق شہادت میں میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کوچۂ دلدار میں پہنچے ہوں۔

خطابات کی ایک انتہائی مخصوص قسم ہے جس کے لئے آنجہانی ہونا شرط ہے۔ یعنی جیتے جی اس خطاب کا لطف اٹھانا تقریباً ناممکن ہے کچھ مستثنیٰ معاملات کے علاوہ۔ جیسے فوج کے شہید افسران، کرنل، میجر، سپاہی وغیرہ۔ چونکہ شہید کی جو قدر و منزلت اور عزت ہے وہ بہادر غازیوں کے حصۂ مقدر میں کہاں میسر ہوتی ہے؟ چونکہ ہماری برصغیر ہند و پاک کی غلامانہ تہذیب میں مردہ پرستی کے عناصر ایک امتیازی جزو کی اہمیت رکھتے ہیں۔ بہر حال خطابات کی اہمیت افادیت نشہ

اور سرور میں وہ دائمی تاثیر ہے جو اپنے حاملین کو پس مرگ بھی عوام الناس میں زندہ و جاوید بنا دیتے ہیں۔اسی طرح نوبل، اولمپک، کرکٹ وفٹ بال کے ورلڈ کپ کے خطاب یافتگان کو بھی ان کے اسی کارنامے کے تحت جا بجا یاد کیا جاتا ہے۔بلکہ بسا اوقات ان کے حوالے بھی تحریر و تقریر میں دئے جاتے ہیں۔

دو دہے قبل اچانک ایک انکشافاتی انقلاب برپا ہوا۔ دنیا نے معلوم کر لیا کہ ہندوستان میں بھی 'ملکۂ حسن' نامی مخلوق پائی جاتی ہے۔ پھر کیا کہنے تھے ہر سطح پر ملکۂ حسن کے مقابلہ جاتی انتخابات نمائش اور مسابقت کا سلسلہ ہی چل پڑا۔اس سے یہ بات ضرور کھل کر سامنے آگئی کہ بڑے تجارتی حربے اور مارکیٹنگ کے شعبے میں اس نئے ہتھکنڈے کا محرک صرف کسب مال ہے نہ کہ مشرقی حسن کی ستائش و پذیرائی۔ جیسے مس ورلڈ، مس یونیورس، مس ایشیا، مس انڈیا، مس ممبئی، مس کلکتہ، مس جے پور، مس کشمیر، مس بنگلور، مس اندور خطابات کے مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے دوشیزائیں ایک دوسرے سے نہ صرف برسرپیکار ہیں بلکہ باہم دست و گریباں کی صورتحال ہے۔جب یہ مقابلہ مزید حد سے گذر جائے تو نوبت باہم جوتم پیزاری پر آکر دم لیتی ہے۔امریکہ کی صنعت برائے خواتین وہاں اپنی گاہکوں کو رجھانے میں ناکام ہوگئی اور تیسری دنیا کے غلام مزاج میں اس قسم کی مصنوعات کے تحت دلچسپی کو دیکھتے ہوئے نباض چالبازوں نے یہ کھڑاگ پھیلایا ہے۔اب امریکی کمپنیاں ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنی صنعت قائم کر کے سارے ملک کی خواتین کو گورا چٹا رنگ، تیز نوکیلی پلکیں، سبز و نیلی آنکھیں، پنڈلیوں تک زلف دراز اور نہ جانے کیا کیا ملمع سازی کے ہنر سکھائیں گی۔البتہ تمام تجارتی فوائد انہیں حقیر کم مایہ ہندوستان کی کثیر العیال آبادی کے دم پر حاصل کرنا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں یہ دھوکہ بازیگر اکثر کھلا

www.urduchannel.in

بعض اوقات شاطر سیاست دانوں سے یہ خطا سرزد ہو جاتی ہے۔وہ بعض سرکردہ رہنماؤں کو خواہ وہ بقید حیات ہوں یا ملک عدم سدھار چکے ہوں انہیں یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ تب اس فرقے کی عوام اپنی ملی بیداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے سڑکوں پر اتر آتی ہے۔جمہوری احتجاج اور دھرنوں اور ہڑتالوں کے حربے آزمائے جاتے ہیں۔منظم سیاسی رنگ بازی کے زیر اثر بھوک ہڑتال، راستہ روکو، تالا ٹھونکو، چکہ جام بلآخر زندہ آباد اور مردہ باد کے نعروں سے ماحول میں گرمی پیدا کی جاتی ہے۔اس طرح عوام اپنے رہنما کو اس کے مقام کے شایان شان خطاب دلوا کر ہی دم لیتی ہے۔آہستہ سے حکومت بھی اپنے تجاہل عارفانہ کا اقرار کر لیتی ہے۔

خطابات کا حصول ایک نشہ ہے۔جس کی پر لطف کیفیت سے سرشار ہونے کے لئے صاحبان اعزاز اس کی حصولیابی کی حرص و ہوس اور دوڑ میں ہر زمانے میں مصروف رہے ہیں۔ شہرت، مقبولیت، اشتہار بازی اور نام و نمود سے کسے پرہیز ہے؟ ذرا تقسیم خطابات کا موسم تو آنے دیجئے پھر ملاحظہ کیجئے کہ نام و نمود کے بھوکے امیدواروں کی حالت اضطراب اور جنون شوق۔آپ بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

۱۰۔کہتا ہوں سچ کہ۔۔۔۔

چوری یوں تو معیوب، قابل گرفت اور لائق تعذیر وسزا جرم ہے۔بعض ممالک میں چوری کی سزا اس قدر سخت ہے کہ ہاتھ قلم کر دینے کا رواج ہے۔جو اس جرم کی سنگینی کا جواز ہے۔ مگر بعض شائستہ قسم کی چوریاں یوں بھی ہوتی ہیں جن کو تعذیر وسزا کے دائرے میں لانا ممکن نہیں۔ جیسے آنکھوں سے کاجل چرانا، کام سے جی چرانا، کتابیں چرانا، جوتے چرانا، معشوق کا دل چرانا، چین چرانا، مطلب براری کے بعد نظریں چرانا اور کرشن کنھیا کا مکھن چرانا وغیرہ۔ایسی معصومانہ واردات پر کون سا دفع اور قلم نافذ کیا جائے یہ تو وہ سرقہ ہیں جنہیں اکثر اوقات تجاہل عارفانہ کے تحت ناقابل مواخذہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

دل چرانے کا معشوقانہ عمل خاصہ دلبرانہ بھی ہوتا ہے۔جس میں بیک وقت دل چور اور صاحب دل یکساں طور پر اس کی حسین کیفیت سے لطف اندوز اور سرشار ہوتے ہیں۔شاید اسی لئے چوری کا گڑ بھی میٹھا ہوتا ہے جیسی میٹھی ضرب المثل معرض وجود میں آئی ہوگی۔البتہ چوری کا گڑ جتنا میٹھا ہوتا ہے اس سے زیادہ میٹھی اور حسین اس کی یادیں ہوتی ہیں۔اس طرح یہ چوری بھی دوطرفہ ہو جاتی ہے۔اس حین چوری میں باہم دلوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔فریقین کے دل ایک دوسرے کی سینے میں دھڑکتے ہیں۔جسے کہتے ہیں

؎ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

یہ دلوں کے باہم تبادلے کا کھیل اتنا خوشگوار پہوتا ہے کہ اس کا وقت اور مقام عشاق تا عمر دل سے محو نہیں ہو پاتے کہ

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ　　مجھ کو اب تک وہ پہر اور وہ ٹھکانہ یاد ہے

www.urduchannel.in

مقروض اور احسان ناشناس حضرات بھی وعدہ خلافی، خجالت، اور شرمندگی سے نظریں چرانے پر مجبور ہوتے ہیں۔کچھ ماہر ومشاق چور تو آنکھوں سے کاجل چرانے میں مہارت رکھتے ہیں۔عموماً ایسے چور چوری سے جاتے ہیں ہیرا پھیری سے نہیں جاتے۔لہذا بعض اوقات ان چوروں کے تقدیر کے ستارے بھی گردش میں آجاتے ہیں۔تب انہیں چور کے گھر مور اور جب سلسلۂ نحوست دراز ہوتا ہے تو ان کو کوئی اور ہی مل جاتے ہیں۔الغرض نہلے پہ دہلہ کی بات صادق آجاتی ہے۔یہ بات بھی زبان زد خاص وعام ہے کہ چور چور کو پہچانتا ہے۔مگر ثانی الذکر چور بڑی ڈھٹائی سے اول الذکر چور پر اپنا پارسائی کا دعویٰ اور بھرم رکھنے کے لئے چوری تو چوری اس پر سینہ زوری کے حربے پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔مفت خورے، سست الوجود اور کاہل حضرات اپنے کام سے جی چراتے ہیں۔

چوری کی کچھ مزید اقسام کا بھی مباح یا ناقابل گرفت وتعذیر تصور کیا جاتا ہے۔جیسے ایک مشہور مقولہ نہ جانے کس نے اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لئے وضع کرلیا ہے کہ 'کتابوں کی چوری جائز ہے'۔اگر اس کا مقصد تحصیل علم اور مفاد عامہ میں ہو تو اس کا مالک بخوشی اسے نظر انداز کر سکتا ہے۔البتہ یہ فعل بغرض تجارت اور شکم پروری کے کیا جارہا ہو تو ضرور قابل گرفت ہے۔فی زمانی کتابوں کی چوری کا جرم معمولی اور قابل عفو ہے مگر اصل فنکاری کتابوں سے بدون حوالہ اقتباسات کی چوری ہے اور ان کی ملکیت کا خود ساختہ مجاز بن بیٹھنا بھی ہے۔یہ عمل نہ صرف فنکاروں کا استحصال بلکہ ایک مکمل مسروقہ ادبی صنعت کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔اس آنکھ مچولی میں ناشر اور سرقہ باز مصنفین برابر کے شریک ہوتے ہیں۔جب تک اصل مصنف تک یہ بات پہنچ پاتی ہے بہت تاخیر اور معاملہ طشت از بام ہو چکا ہوتا ہے۔پہلے پہل تخلیقات کا یوں سرقہ، چربہ، استفادہ اور بدون حوالہ نقل کے افعال سے ان فن پاروں کے خالق کو کوفت ہوتی تھی۔رفتہ رفتہ تخلیق کاروں

نے بذات خود اپنی تخلیقی سرمائے کی بغیر نام کی فروختگی کا کاروبار فن کے بازار میں شروع کر دیا۔ شعرا نے متشاعر نامی مخلوق کو کسب مال کی خاطر پیدا کر لیا۔ انشا پردازوں نے ماضی کے اساتذہ کی مشہور اور جاندار تخلیقات کے چربے، افسانوں کے پلاٹ، کردار نویسی، جزویات نویسی، مختلف تکنیک اور نقطۂ عروج میں خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا کر کے نسل نو کو یا تو فروخت کر دئے یا اخبارات و رسائل میں شائع کروا کے ادب کے میدان میں قامت درازی کا شیوہ انجام دے دیا ہے۔ اس عمل کا محرک نان شبینہ چرانے سے بہتر عمل ہے کہ اپنے اکتسابی عمل کی صحت مند قیمت وصول کی جائے۔ مشاعروں اور سیمیناروں کے اسٹیج پر چھکنے، چمکنے و دمکنے والے شعرا و ادباؤں یا اخبارات و رسائل میں بکثرت چھپنے والے متشاعر اور معنویت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے فنکار ہوں۔ وہ بیچارے باوجود کوشش و اسراف مال پس پشت بھی ذلت آمیز فقروں اور القابات سے نوازے جاتے ہیں۔

جہاں تک متشاعروں کا شیوہ ہے اسے دیس چوری پردیش بھیک کہتے ہیں۔ یہ بلا خوف و خطر منتظمین مشاعرہ، شعرائے کرام اور سامعین کی آنکھوں میں جوتا پہن کر گھس جاتے ہیں۔ متشاعروں میں اداکاری کے جوہر جیسے مشاعروں میں پیشہ ورانہ انداز پیش کش، لفاظیاں، ترنم اور انداز سخن ایسا خوبصورت ہوتا ہے کہ بعض اوقات فطری فنکاروں کو نہ صرف رشک آتا ہے بلکہ وہ بھی احساس کمتری و کم مائیگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کمال حیرت اس وقت ہوتی ہے جب دیدہ ور سامعین بھی ان چہک چہک کر طرفہ تماشہ میں مصروف شعرا کو لہک لہک کر اور بعض وقت بہک بہک کر بڑی فراخدلی سے داد دیتے ہیں۔ ادھر شعری تخلیقات فروش نام نہاد استاد شعرا خم ابرو کے اشارے سے اپنے مصاحبوں کو نہ صرف کلام کی کامیابی کی حقیقت شاعرانہ بلکہ محبوبانہ انداز میں واضح کر دیتے ہیں بلکہ جذبۂ تفاخر سے پھولے اپنے گز بھر سینے پر ہاتھ ٹھونک کر اپنی ہی داد

www.urduchannel.in

رسی کا لطف بھی لے لیتے ہیں۔ گویا چور سے کہیں چوری کر شاہ سے کہیں تیرا مال لٹا۔ ادھر متشاعر بھی طویل عرصے تک مشاعرہ گاہوں میں اپنے پاؤں نہیں جما پاتا چونکہ جھوٹ کے پاؤں لمبے نہیں ہوتے۔ یوں بھی ضرب المثل زبان زد خاص و عام ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا۔

ایک مخصوص عرصے تک تو متشاعروں کو اپنے نام نہاد تخلیق فروش استاد شعرا پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ ہر مرتبہ حاصل محفل کلام انہیں عطا فرماتے رہیں گے۔ تاوقتیکہ طے شدہ معاوضے کی رقم کے ساتھ بخشش اور دعوتوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا ہے۔ تب تک مشاعرہ لوٹنے والے حاصل محفل کلام میسر آتے رہتے ہیں۔ چونکہ وہ خود بھی جانتا ہے کہ مٹھی بند ہو تو لاکھ کی ہوتی ہے اور کھل جائے تو خاک ہو جاتی ہے۔ لہذا گھر کی گھر میں ہی رہ جاتی ہے اور متشاعر کا بھرم قائم رہتا ہے۔ مگر جوں ہی رقم کی ادائیگی میں تقصیر (کاٹ کسر) یا کلام کی غیر مقبولیت حائل ہوتی ہے۔ وہاں متاسف تخلیق کار اس راز کو آشکارہ کرنے سے باز نہیں آتا ہے کہ جملہ تخلیقات کا اصل خالق کون ہے۔ آخر فن پارہ یا تخلیق کی محبت فنکار کا وہ فطری جذبہ ہے جو اس کی فروختگی کے باوجود خالق فن پارہ کے دل میں دوگنی شرح سے جاگزیں ہو جاتا ہے۔ جسے مال و دولت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا ہے۔ جیسے بیٹیاں بیاہ دینے کے بعد والدین کے دلوں میں ان کی محبت بھی دوچند ہو جاتی ہے۔

مگر داد کے بھوکے اور عارضی پذیرائی اور شہرت کے دلدادہ متشاعر سامعین کی داد کے نشے میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہنستے ٹھا کر اور کھانستے چور ان دونوں کا آیا اور۔ جب کبھی وہ محفل مشاعرہ سے ناکام و نامراد لوٹتے ہیں تو انہیں ٹھگ لئے جانے کا احساس غالب ہوتا ہے کہ جیب بھی ہلکی ہوئی اور مزہ بھی نہ آیا۔ گویا اپنا ہی مال جائے اور آپ ہی چور کہلائے۔ تب ان کی انا پر زبردست چوٹ لگتی ہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق وہ تخلیق کار شاعر سے رقم لوٹانے کا مطالبہ کر دیتے ہیں۔ بس یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب تخلیق کار اپنے ضبط راز کا باندھ توڑ بیٹھتا ہے اور

متشاعر کو سرعام مشہور کر دیتا ہے۔ باوجود ان تمام ذلتوں اور رسوائیوں کے متشاعر حضرات اپنے شعار سے قطعاً باز نہیں آتے۔

؎ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

www.urduchannel.in

۱۱۔ چمچماتے چمچے

چمچوں کی اہمیت اور افادیت ان کے بے حد کارآمد ہونے کی پختہ دلیل ہے۔ چمچے یوں تو دال بگھارنے، سالن بگھارنے، شیخی بگھارنے، باتیں بگھارنے اور سیاست بگھارنے جیسے اہم افعال میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ چمچوں کی غیر موجودگی بھی باعث تکلیف اور پریشانی ہوتی ہے۔ چمچوں کی عدم موجودگی میں آپ کی نرم و نازک انگلیوں کو گرم پتیلی میں غوطہ زن ہونا پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح جیتے جاگتے چمچوں کے بغیر سرکاری اعلیٰ حکام تک رسائی دوبھر ہوتی ہے۔ جہاں آپ کو میز در میز، دفتر در دفتر کے ہزار چکروں کے ساتھ رشوت اور بلآخر ذلت وخواری کی راہ پر گامزن ہونا پڑتا ہے۔ بقول غالبؔ

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا تھا تری رہگذر کریں

جس طرح قسم اول کے چمچے امور خانہ داری کی جان ہوتے ہیں ان کے بغیر باورچی خانے کے پکوانوں کی شان ناممکن ہے اسی طرح چمچوں کی دوسری متنفس قسم کے بغیر دکان سیاست چمکائی نہیں جاسکتی۔ امور خانہ داری کے چمچے بسا اوقات پتیلی سے زیادہ گرم ہوتے ہیں البتہ انہیں گرم چمچوں کے طفیل پکوان کا ذائقہ معلوم کیا جاتا ہے۔ میدان سیاست میں دو پیروں پر ایستادہ چمچے بھی پتیلی سے زیادہ گرم بلفظ دیگر سرگرم ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لہذا وہ ہمہ وقت سرگرم عمل نظر آنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ گو ان کی مدد سے پکوان کا ذائقہ نہیں معلوم ہوتا البتہ ان کی کثرت سے ان کے ممدوح سیاست داں کی مقبولیت، شہرت اور سیاسی گراف کی بلندی کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے یوں بھی مثل مشہور ہے کہ جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا ہر کوئی۔ بعض اوقات

ان چمچوں سے اپنا کام (ذاتی مفاد) نکل جانے کے بعد ان کی شان میں یہ کہہ کر گستاخی بھی کر دی جاتی ہے کہ حال کا نہ قال کا۔ روٹی چمچہ دال کا۔

لذت کام و دہن چمچوں سے ہے
رونق ہر انجمن چمچوں سے ہے

خانہ داری کے چمچے اپنے استعمال کے اعتبار سے مختلف النوع ساخت اور بناوٹ کے ہوتے ہیں۔ جیسے چھوٹے، بڑے، گول، چپٹے، سیدھے، ٹیڑھے، سپاٹ اور جالی دار وغیرہ۔ عین اسی طرح دیگ سیاست کے چمچوں میں بھی کچھ بنیادی اوصاف مشترک ہوتے ہیں۔ جیسے خوشامد، چاپلوسی، مدح سرائی، تعریف و توصیف اور سب سے بڑا وصف ہے ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانا۔ یہی جملہ اوصاف ان کی کامیابی، استقامت اور فیض رسائی کا سبب بنتے ہیں۔ خانہ داری کے چمچے تو استعمال کے بعد دھل دھلا کر صاف ستھرے بلکہ چمچماتے چمچے ہو جاتے ہیں۔ البتہ سیاسی چمچوں کے استعمال کے بعد ان کا غلاظت اور سیاست سے چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یوں بھی عصر حاضر میں سیاست اور غلاظت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ غذا اگر سیال یا نیم سیال ہو تو اسے نوش کرنے میں چمچہ معاون ہوتا ہے۔ ورنہ دیگر غذاؤں کو بغیر چمچے کے بھی نوش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بعض پیچیدہ کاموں کی تکمیل بھی سیاسی چمچوں کی بروقت مداخلت اور تعاون کے ممکن نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا بقول ڈاکٹر شباب للت

خلوتیں بدنام ان چمچوں سے ہے
جلوتیں خوش کام ان چمچوں سے ہے

خانہ داری کے چمچوں کا ظرف یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ جامۂ شرافت میں رہتے ہیں۔ نہ کبھی اپنے منصب سے بغاوت کر کے پتیلی کے ہمسر ہونے کی لالچ رکھتے ہیں۔ نہ پتیلی کے متبادل

www.urduchannel.in

کہلانے کے دعوے دار ہی ہوتے ہیں۔ مگر سیاسی چمچے مہذب زبان میں مصاحب کہلاتے ہیں۔ صحیح وقت اور موقع میسر آجائے تو ''م'' سے نجات پا کر مکمل طور پر 'صاحب' بننے کے لئے انتہائی قدم اٹھانے اور سنگین واردات کر بیٹھنے سے بھی باز نہیں آتے۔ چونکہ مصاحبین نہ صرف صاحب کے راہبر، راہزن، مشیر اور راز دار ہوتے ہیں بلکہ جاسوسی کی حد تک خبر رساں یا مخبر بھی ہوتے ہیں۔ مزید برآں ان میں صاحب کا سفینۂ سیاست کو پار لگانے نیز ڈبو دینے میں بھی یکساں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ صاحب کو تخت پر بٹھانے، تختہ پلٹنے اور مناسب موقع پر تختۂ دار سے لٹکانے میں مہارت اور ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہمارے ہمسائے ملک میں اس قسم کی مشقیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ میدان سیاست میں نہ کوئی مستقل دوست ہوتا ہے نا ہی دشمن۔ اس طرح کی مشقیں ہمارے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر تناسب بہت کم ہوتا ہے۔ شاید ہم میں غلامی کے جراثیم زیادہ اندر تک سرائیت کر گئے ہوں۔ بقول ڈاکٹر شباب للت

لذت کام و دہن چمچوں سے ہے — رونق ہر انجمن چمچوں سے ہے
یہ چمکتے رہیں تو خوب ہیں — یہ کھنکتے رہیں تو خوب ہیں
کوئی ہنگامہ ہو کوئی بزم ہو

جس طرح بیل کو پروان چڑھانے کے لئے درخت یا دیگر کسی سہارے کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ مصاحب (چمچے) بھی اپنے صاحب کے کاندھوں سے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ اپنے صاحب کے لئے امر بیل بھی ثابت ہو جاتے ہیں۔ جس طرح بیل اپنے ایستادہ سہارے کو مکمل طور پر اپنے حصار میں رکھتی ہے اسی طرح مصاحبین بھی اپنے صاحب کے گرد اپنا سخت حصار گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب یہ بات صاحب کی اپنی ذہنی استعداد یا ابن الوقتی پر منحصر ہے کہ وہ بیل اور اس کے حصار کا بخوبی جائزہ لے لیں۔ کہیں وہ قرار واقعی تعریف و

توصیف اور عارضی حمایت کے چکر میں کہیں امر بیل کے حصار میں تو نہیں آ گئے۔ اگر صاحب نے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر اس جہان فانی میں قدم رکھا ہوگا تو وہ اقتدار و سیاست مئے دو آتشہ کے نشے میں اس اندیشے سے بھی برگشتہ ہو جاتا ہے کہ بصورت دیگر بساط سیاست الٹتے ہی چڑھتے سورج کے پجاری چمچے آئندہ صاحب اقتدار و اختیار کے در کا رخ کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں برے وقتوں میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے تو ان معصوم چمچوں پر کیسا الزام؟ یہ بیچارے کس شمار و قطار میں ہیں۔ بقول ڈاکٹر شباب للت

بات بنتی ہی نہیں ان کے بغیر — بزم سجتی ہی نہیں ان کے بغیر
رونق محفل انہیں چمچوں سے ہے — دوستوں اسٹیل کے چمچے یہ نہیں
دوستوں ہم ٹین کے چمچے نہیں — خیر سے چاندی کے یہ ترشول ہیں
ہم کوئی مخلوق بے مصرف نہیں — ہم بھی ہیں مصروف خدمت صبح و شام

بغیر کسی لاگت، کسی مال زر سے وابستہ مصاحب کا پیشہ بھی کوئی معیوب بھی نہیں۔ نہ باعث پشیمانی و خجالت ہی ہے۔ بلکہ باعث صد افتخار اور عزت و وقار کی بات ہے۔ ہر طرف ان مصاحبوں کے نام کی گونج سنائی دیتی ہے چونکہ مرزا غالب نے اس پیشے کے شایان شان شعر وضع کیا ہے کہ

؎ بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

اس کے بیش بہا فوائد بھی ہوتے ہیں۔ مصاحب چونکہ ازلی طور پر طفیلی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ جس کی جیب ناتواں ہر اقسام کے اخراجات کی ضرب سے محفوظ ہوتی ہے۔ لہذا جو مراعات کسی صاحب کو پتہ پانی کر کے یا روپیہ پانی کی طرح بہا کر حاصل ہوتی ہے جیسے شاہانہ اخراجات، ہر بیرونی ٹور پر سوغات، سیر و تفریح اور مہنگے ترین معیار حیات کے اخراجات کا بار گراں تو صاحب کی جیب خاص پر ہوتا ہے۔ مگر مصاحب کو VIP ٹریٹمنٹ، اثر و رسوخ، بالا حکام اور اعلی و ارفع افراد تک رسائی،

www.urduchannel.in

مراسم اور شناسائی، مفت اعلیٰ و ارفع خورد و نوش اور آؤ بھگت اور معاشرے میں اعلیٰ مقام اور سرکاری درباری دفاتر اور ان سے وابستہ کاموں میں تن آسانیاں جیسے فوائد چنداں مفت میسر آجاتے ہیں۔ صرف زبان کے میٹھے دو بول سے یہ سب کچھ مل جائے تو پھر ستر ہل کون جوتے؟ بقول شاعر

زر، زمین، زن غرض ہر چیز نذرانے میں ہے — ہر طرح کا فائدہ اک چمچہ بن جانے میں ہے

راقم الحروف کو چمچوں سے کوئی بیر نہیں ہے۔ بر سبیل تحریر عرض کرنا ہے کہ چمچوں کی خدمات گرم پتیلیوں میں سیر و تفریح اور غوطہ زنی کر کے نہ صرف مصالحہ جات کو بھوننا، ملانا، پکانا اور بگھارنا یا ذائقہ چکھنے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ پکوان کو پتیلی تا طشت، طشت تا دہن سفر کا فریضہ بھی انہیں کے سر ہے۔ اسی طرح مصاحبین کا فرض ہے کہ وہ صاحب کی پذیرائی، مدح سرائی، اس انداز میں فرمائیں کہ صاحب قرار واقعی تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہو کر کسی فریضۂ منصبی کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ ورنہ چمچوں کو غائبانہ طور پر اسی ضرب المثل کے حوالے سے یاد کیا جائے گا کہ نہ حال کا نہ قال کا روٹی چمچہ دال کا۔

ایں جناب و آں جناب و آں حضور — ہوئی کوئی کتنا فہیم و باشعور
لاکھ ہو شوریدۂ کبر و غرور — آنکھ ہوتی ہے اس کی مسرور
ہنستے ہنستے منہ لگاتا ہے انہیں
خوان پر اپنے سجاتا ہے انہیں
کوئی بھی یگ ہو مگر یہ چمچگان — جاری رکھتے ہیں مگر اپنی دکاں
اہل عظمت کے سدا ہمدم رہے — جلنے والوں کو جلاتے ہم رہے

ہم نے بدلے فیصلے تاریخ کے　　سفر بھی گویا کر لئے مریخ کے
جنم داتا ہم رہے ہر جنگ کے
گل کھلائے ہم نے کتنے رنگ کے

رام کو بن باس دلوا کر رہے　　آگ ہم لنکا میں بھڑکا کر رہے
بھائی کو بھائی سے لڑوا کر رہے　　ہند کو تقسیم کروا کر رہے
بال ہر شیشے میں ہم لا کر رہے
جوتیوں میں دال بٹوا کر رہے

ہم سے بڑھ کر شعبدہ گر کون ہے؟　　محفلوں کا بازیگر کون ہے؟
آپ ہیں اپنے سلیقے کا جواب　　ہر طرف ہے اپنا جھاد و کامیاب
دلنشیں اپنا ہر اک انداز ہے
ہر کھنک اپنی نوائے ساز ہے

www.urduchannel.in

۱۲۔ ہوئے جی کے ہم جو رسوا

آپ نے اکثر و بیشتر اداروں، انجمنوں اور سوسائیٹوں جیسے انجمن حقوق نسواں، انجمن تحفظ اطفال، انجمن تحفظ برائے خیوش و طیور، ادارہ برائے تحفظ وحشی درندہ، چرند و پرند کے نام کے ساتھ ادارہ انسانی ذرائع وسائل کے چرچے بھی ضرور سنے یا اخبارات میں پڑھے ہوں گے۔ مگر مردوں بالخصوص شوہروں پر ازل سے جاری ظلم و ستم، طعن و شتم کے خلاف کبھی ادارہ سازی یا اتحاد کی کوئی خبر کبھی نہیں سنی ہوگی۔ جب کہ شوہروں کو بیویوں کے ناروا سلوک، بدزبانی اور کج روی کا آئے دن سامنا ہوتا ہے۔ آج معاشرے میں جا بجا شوہروں پر ظلم و ستم ڈنکے کی چوٹ پر ڈھائے جاتے ہیں۔ بلکہ اس ضمن میں بیویوں میں باہم مسابقتی رویہ بھی دیکھا گیا ہے۔ شوہروں کے حواس پر اپنی بیویوں کا اس قدر خوف مسلط ہے کہ وہ حواس باختہ گھومتے ہیں۔ انہیں اپنے حقوق کے تحفظ و بقا کی خاطر ایک ادارے کی تشکیل و تنظیم کی بھی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنے جائز حقوق اور گم گشتہ بالادستی کا مرثیہ ہی کہہ لیں کسی بات پر احتجاج اور صدائے بغاوت بلند کر سکیں یا پھر ایک دوسرے کی داستان الم و غم سن کر اس کا بوجھ ہلکا کر سکیں یا اپنے آپ کو طفل تسلی ہی دے سکیں۔ معمولی ترمیم کے ساتھ بقول سوختہؔ

جینے کا وزن صبر سے ڈھو لیتے ہوں　　وہ جو بیویوں کے ستم ہنس کر سہہ لیتے ہوں
ان لوگوں میں آپس کی محبت تو دیکھو　　ملتے ہوں، چمٹ جاتے ہوں، رو لیتے ہوں

ایک شوہر ستم ہائے روزگار سے تھکا ماندہ، مصروفیات سے فارغ ہو کر خواہ وہ ملازمت پیشہ ہو یا تجارت پیشہ یا اسی ذیل میں کسی اور پیشے سے وابستہ ہو جب اپنے دارالامان دراصل دارالمصائب کا رخ کرتا ہے۔ ابھی دماغ ہزاروں قسم کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے نبرد آزمائی

کر کے دہی بن چکا ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ چند گھڑیاں راحت اور سکون کی میسر آجائیں تو وہاں مسائل کی دیوی پہلے سے منہ پھلا کر بھری بیٹھی شدت سے اپنے شوہر نما شکار کی منتظر ہوتی ہے۔ گھر میں داخلۂ سلامی کے ساتھ صلواتوں کی جوابی توپیں مسائل کے گولے برسانا شروع کر دیتیں ہیں۔ سودا سلف کی کمی کا رونا، باورچی خانے میں درپیش مشکلات کا رونا، سودا سلف میں نقص اور الٹ پھیر کے شکوے بچوں کی نت نئی شرارتوں اور نقصانات کی نام بنام فہرست، نندوں اور دیورانیوں اور جیٹھانیوں کے بعد ساس کی فتنہ پردازیوں کے گلے بھی سننے پڑ جاتے ہیں۔ ابھی شوہر کا دماغ ان موضوعات کی نزاکتوں اور تقاضوں کو سمجھنے اور کوئی مناسب حل تجویز کرنے کا متلاشی ہی ہوتا ہے کہ روپیوں کی کمی اور بھاری بھرکم اخراجات کا رہا سہا گھڑا بھی اسی کے سر پھوڑ دیا جاتا ہے۔ بقول شاعر

چند کلیاں نشاط کی چن کر عمر بھر محو یاس رہتا ہوں — تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

بعض شوہروں میں بردباری کم اور جذباتی کیفیت حاوی ہوتی ہے۔ وہ مذکورہ باتیں سن کر فوراً بپھر جاتے ہیں اور منفی ردعمل ظاہر کر دیتے ہیں۔ اگر زن مریدی کا نشہ تازہ اور نیا نیا ہو تو فوراً اپنی بہنوں بھابھیوں اور حتیٰ کہ ماں سے بھی سخت باز پرس کر کے اچھا خاصہ تنازعہ پیدا کر لیتے ہیں۔ جس سے چند لمحوں میں گھر پانی پت کے میدان کا منظر نامہ پیش کر دیتا ہے۔ یا کبھی اپنی ہی بیوی کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے گھر کی دیگر خواتین کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش چشم زدن میں یہ احساس تازہ کر دیتی ہے کہ

الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اس صورتحال میں بیوی فوراً آنسوے بہانے، قسمت کو کوسنے اور اپنے والدین کو دہائی دینے جیسے ٹوٹکے آزماتی ہے کہ کیسے بے رحم، پتھر دل اور ظالم شخص کے پلے باندھ اس کے میکے والوں نے

www.urduchannel.in

اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کی (اس سے جان چھڑائی ہے)۔ بیوی کی جھیل سی آنکھوں میں آنسوے دیکھ کر شوہر کا دل کٹ سا جاتا ہے۔ غصہ تحلیل ہو کر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ شوہر اپنے طیش میں آنے پر کف افسوس ملتا ہے جب پشیمانی حد سے سوا ہو جاتی ہے تو فرط محبت سے روٹھی بیوی کو منانے بھی بیٹھ جاتا ہے۔ ادھر تجاہل عارفانہ کہ ہر بات کی سنی ان سنی ہو جاتی ہے۔ اب شوہر بے چارہ غم دوراں سے نبرد آزما ہو کہ غم جاناں کی مار جھیلے جو بنیادی طور چکی کے دو پاٹ ٹھہرے۔ بقول مومنؔ

نہ تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں — کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

اگرچہ میاں بیوی علٰحدہ رہتے ہوں جہاں بیوی کو بہت ساری دشواریوں سے ساتھ سسرالی رشتہ داروں کی روزانہ دخل اندازی سے نجات تو مل جاتی ہے مگر بے چارے شوہر کو کہاں چین و قرار نصیب؟ بچوں کی شرارت، پانی کی قلت کا گلہ، مکان مالک کی ایذا رسانی کے واقعے، خادمہ کی لاپرواہیاں اور بے وقت ناغے، کام کی زیادتی کا رونا، ناقدری اور ناسپاسی پر رنجش، دکھ و بیماری میں آہ و فغاں (جو اکثر شوہر کو متوجہ کرنے کی سبیل ہوتی ہیں)۔ یا پھر تصرفات کے موٹی رقومات کے مطالبے وغیرہ جیسے ٹیلی فون، بجلی، اخبارات، انٹرنیٹ، ٹیوشن فیس، اسکول فیس، رکشہ کا بل، دودھ کا بل، شادی بیاہ میں حیثیت کے شایان شان تحفے تحائف کے بل۔ اب بندہ کس کس بات کا رونا روئے اور کس کے سامنے روئے۔ جس کے پاس آپ سے بہتر، اعلیٰ اور ارفع مثال ہر وقت موجود ہوتی ہے جو صد لائق تقلید و نقل ہوتی ہے۔ بعض شوہر خاموشی سے ساری روداد سن لیتے ہیں۔ فوری طور کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرتے کہ ایک چپ سے ہزار بلا ٹلتی ہے تو اسی کا فیض بلکہ کیف اٹھایا جائے۔ البتہ بعض شوہر بڑے بے جگرے ہوتے ہیں بڑی صراحت و سہولت سے ساری داستان الم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے خارج کر دیتے ہیں۔ یعنی اس کا مطلق اثر

قبول نہیں کرتے کہ جذبات ہیجان انگیزی کی طرف مائل نہ ہوں جس کے نتیجے میں بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب کی نوبت آن پڑے۔ بعض شوہر بیویوں کی کمسٹری کو بڑی رغبت اور شوق سے سنتے ہیں۔ اس میں دلچسپی کا مظاہرہ کرکے نہ صرف مناسب برموقع برمحل حل بھی تجویز کرتے ہیں بلکہ ان کو بروئے کار لانے میں ان کی عملی مدد بھی کرتے ہیں۔ اس قسم کے شوہروں کو ان کی مائیں ایک خاص اصطلاح کے ساتھ یاد کرتی ہیں وہ ہے 'جورو کا غلام'۔ بقول مومن

نہ جائے واں بنی ہے نہ بن جائے چین ہے　　کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

اکثر بیویوں کو اپنے ہاتھوں بنائے گئے پکوانوں کی تعریف سننے کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے۔ جونہی شوہر آلام روزگار کے بعد ہاتھ دھو کر دسترخوان پر اپنے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے بیٹھتا ہے۔ بیوی اشارے، کنائے، آڑے ترچھے سوالات کے جواب بشکل پکوان کی تعریف سننے کی خواہاں ہوتی ہے۔ بلفظ دیگر شوہر کے منہ سے اپنے پکوان کی تعریف اگلوا کر ہی دم لیتی ہے۔ ایسے جہاں دیدہ شوہر جو اپنی بیوی کی نفسیات کے واقفیت رکھتے ہیں صرف پکوان کی خوشبو کی شان میں قصیدہ کہہ کر اپنی بیوی کا دل موہ لیتے ہیں۔ ایسے بے نیاز شوہر جن میں اس قسم کی جمالیاتی حس کی کمی ہوتی ہے جو بے چارے 'دست خود دہان خود' کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ ایسے شوہروں کو اپنے لقمے کے ساتھ طعنے بھی زیر حلق اتارنے پڑتے ہیں۔ جن شوہروں کو اپنی بیوی کی نفسیات سے کھیلنے کا ہنر آتا ہو وہ بات سے بات پیدا کرنے نہ صرف پکوان، بیوی کے ہاتھ اور اس کے حسن کی تعریف میں بھی رطب اللسان ہو کر موصوفہ کو ہی مذاق کا موضوع بنا کر چھیڑ چھاڑ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اکثریت ایسے نستعلیق، خاموش طبع، صلح جو شوہروں پر منحصر ہے جنہیں بیوی لذت دار گرما گرم پکوانوں کے ساتھ اپنی فرمائش کی فہرست، سیر سپاٹے کے پروگرام، شاپنگ اور تحفے تحائف کی فرمائش بھی پروس دیتی ہیں۔ جس سے ان کا ہاضمہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔

www.urduchannel.in

وہ بے چارہ کیا کرے کہ صورتحال جب یوں ہو کہ نہ جائے رفتن نا پائے ماندن۔

بعد از طعام جب شوہر نیم آرام کیفیت میں لیٹ کر غم جاناں اور غم دوراں کے چکروں سے فرار حاصل کرنے کے لئے اخبار بینی میں غرق ہوتا ہے تو بیوی پنکھا جھلنے کے بہانے بے معنی گفتگو کرکے شوہر کی ذہنی یکسوئی کی دشمن اور اسے اپنی سمت منعکس کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ مظلوم شوہر بیوی کے عتاب سے بچنے نیز اسے ٹالنے کے لئے ''ہونہہ۔۔ہونہہ'' کی تکرار کرتا ہے۔ بعض وقات خبروں کی دلچسپی، گہرائی و گیرائی سے متاثر ہو کر با آواز بلند اپنی بیوی کو بڑے اشتیاق سے خبریں سناتا ہے۔ ادھر اس نازنین کی وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ وہ کمال بے اعتنائی سے اپنی کلائی کے کنگنوں سے کھیلتی ہے بقول حسرتؔ

بے رخی کے ساتھ سننا درد دل کی داستان　　وہ کلائی میں ترا کنگن گھمانا یاد ہے

چونکہ شوہر کے خبر سنانے سے بیوی کی بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ جب شوہر خبر کے بعد بیوی کے تاثرات اور داد کی طلب میں رخ روشن کی طرف دیکھتا ہے تو اسے تاثرات سے عاری چہرہ گوا کورا کاغذ محسوس ہوتا ہے۔ جب کہ بیوی کو تو شوہر کی توجہ (زن مریدی) سے سروکار ہوتا ہے۔ یعنی یہی وہ داخلی معاملات ہیں جہاں ہمیشہ شوہر کا استحصال ہوتا ہے بقول مرزا غالبؔ

ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

اگر کسی تقریب، شادی بیاہ، دعوت یا سالگرہ کے لئے اہل خانہ کو شرکت کے لئے جانا اکثر ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ شوہر نامدار کے ذمے نہ صرف بذات خود تیار ہونا ہوتا ہے بلکہ بچوں کی تیاری بھی انہی کے سر منڈھ دی جاتی ہے۔ اب بیوی خود آئینے کے سامنے سو سو زاویوں اور تنقیدی نظروں، خود کلامیوں اور خود ستائی کے نہ جانے کتنے مراحل پر قناعت کرکے وقت کا زیاں کرتی ہے۔ اب دوسرا مرحلہ ٹھہرا آرائش و زیبائش، ملمع کاری (میک اپ) جس کی تکمیل کے

لئے یہ کہا جائے کہ ایک عمر خضر درکار ہے تو بے جا نہ ہوگا۔محترمہ ایک ناز و ادا سے زیر لب کسی نغمے کی دھن گنگناتے ہوئے میک اپ میں ایسی گم ہوتی ہیں کہ وقت دبے پاؤں کب اور کہاں نکل جاتا ہے اور احساس بھی نہیں ہوتا۔

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

اسی دوران شوہر نامدار سج دھج کر بچوں کو تیار کر کے موٹر سائیکل پر سوار بڑے حلم و تدبر، صبر و قرار کے ساتھ بیوی کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔لمحہ لمحہ گراں گذرتا ہے مگر ادھر بیوی کے غمزے عشوے، نخرے اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔جب شوہر کے ضبط کی تاب ختم ہونے کو آجاتی ہے تو مجبوراً کہہ اٹھتا ہے کہ

ایسا بننا سنورنا مبارک تمہیں کم سے کم اتنا کہنا ہمارا کرو
یہ ادا دیکھنے والے لٹ جائیں گے یوں نہ ہنس ہنس کے دلبر اشارہ کرو

جوں ہی محترمہ پری وش تشریف لاتی ہیں۔کم ہمت شوہر آپے سے باہر ہو کر غضب ناک ہو جاتے ہیں۔فراخ دل، عقلمند اور موقع شناس شوہر بیوی کی شان میں قصیدے ادا کر کے بیوی کو ہی اپنا بے دام غلام بنانے کی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔سادہ لوح عجلت پسند شوہر جب اس کام کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں تو راستے بھر بیوی سے اپنی بے حسی اور بے اعتنائی کا طعنہ بھی سنتے ہیں۔خیر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے کی مصداق راستہ کٹ جاتا ہے اور قافلہ منزل مقصود کو پہنچ کر دم لیتا ہے۔

محفل میں پہنچ کر بیوی سب سے پہلے اپنے جگر گوشے اپنے شوہر کے ذمے چھوڑ کر اپنی عزیز سہیلیوں، دور و قریب کے رشتہ داروں میں اس قدر گھل مل جاتی ہے جیسے وہ تنہا ہی محفل میں آئی ہو۔وہاں سونے کے زیورات، کم یاب ملبوسات، سینڈل اور پرس پر حاضرین سے داد و تحسین وصول کرتی ہے۔ادھر شوہر نامدار کے دائیں ہاتھ کی کہنی ہمیشہ زاویہ قائمہ کی شکل میں ہوتی ہے

www.urduchannel.in

۔جس پر کوئی نہ کوئی بچہ گود میں سوار ہوتا ہے۔لوگ بچوں کی عمر اور تعداد پوچھ پوچھ کر بیوی کی سن بلوغت کا پتہ لگا لیتے ہیں بعض زن مریدی کے پیمانے ذہن میں مرتب کر لیتے ہیں۔محفل میں وہی بیوی اپنے زخم خوردہ، ستم زدہ شوہر کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتی نظر آتی ہے۔اپنی سہیلیوں میں اپنی عظمت و شان کے مبالغہ آمیز قصے بیان کرتی ہے۔شوہر کی قدر دانی، سسرال میں اس کی قدر و منزلت اور بچوں سے محبت کا دلفریب نقشہ کھینچتی ہے۔البتہ ان تمام کاوش کے پس پردہ تعریف و حسنات کا محور بیوی کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔ایک بیوی کو تو یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ میرے میاں تو سورج مکھی کا پھول ہیں جہاں میں ہوتی ہوں ان کی نظریں مجھے ہی دیکھتی ہیں۔لہذا خود نمائی، خود پرستی کا جذبہ خوش فہمی کے جذبے سے تجاوز کر کے غلط فہمیوں کی حدود سے جا ملتا ہے۔

اگر اسی تقریب میں شوہر اپنے بے تکلف یار دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ یار باشی کرتا نظر آتا ہے تو شوہر کی یہ آزادی بیوی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔وہ فوراً سے پیشتر اپنے جگر گوشوں کو شوہر کے سر منڈھ کر خود ساری محفل میں بڑے مزے سے لہراتی بل کھاتی اٹھلاتی اینڈتی پھرتی ہے۔شوہر بے چارہ عزت و توقیر کا مارا بچوں کی نگرانی پر مامور ہو جاتا ہے گویا کوئی تربیت یافتہ گورنس اپنے فرائض انجام دے رہی ہو۔بزرگ خواتین جنہیں نوجوان چھوریوں کی نکیل کسنے میں مہارت ہوتی ہے۔وہ چھم چھم ناچتی مست مگن مورنی کو اس کے اپنے بھدے پاؤں دکھانے کے لئے فوراً پوچھ بیٹھتی ہیں۔''کیوں ری! بچے کہاں ہیں؟'' تب وہ کمال سادگی سے یہ کہہ کر کہ''اس کے ابو کے پاس ہیں۔'' کہہ کر شان بے نیازی سے اپنی راہ لیتی ہے۔

اگر میاں بیوی کو مشترکہ طور پر سودا سلف یا کپڑے خریدی کی ضرورت پیش آجائے تو بیوی کی جملہ صلاحیتوں کے ساتھ اس کی کپڑوں کے انتخاب میں رنگوں، ڈیزائنوں، فیشن، تراش خراش

اور ساخت ہر معاملے کے مباحث میں پیش پیش ہوتی ہے۔ شوہر بے چارہ لخت جگر کو گود میں اٹھائے مال بردار ٹٹو کی طرح پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنی عزت و وقار کی محافظت میں ہونہہ۔۔ ہونہہ کی گردان کرتا ہے۔ دانستاً احمق اور کنگال بھی ہوتا جاتا ہے۔ رہی سہی عزت کے علاوہ انکار پر آئندہ برپا ہنگامے کے پیش نظر بیوی کی ہر رائے پر آمنا و صدقنا کی مہر ثبت کرتا جاتا ہے۔ وگرنہ یہیں اسی مقام پر سر عام روٹھنے، منانے اور سمجھانے کا ڈرامہ مفت میں پیش کر کے ہزیمت نہ اٹھانی پڑ جائے۔ بیوی خریدی کے مرحلے میں خاصی پر جوش اور بااعتماد نظر آتی ہے۔ سہیلیوں کی حرص و ہوس کا مثالی تذکرہ بھی زبان کو تر رکھتا ہے۔ جس سے شوہر نامدار کا خون خشک ہو جانے میں کوئی اندیشہ نہیں رہ جاتا۔ الغرض اپنی عزت نفس کی محافظت اور جھوٹے بھرم کی خاطر شوہر نہ صرف کاٹھ کا الو بنتا ہے، بیوی کی پیروی کرتا ہے بلکہ دانستاً اپنی بچی کھچی ساکھ بچانے کی خاطر جورو کا غلام بنا پھرتا ہے۔ اگر بچے تھوڑے بڑے ہوں تو وہ بازاروں کو کھیل کا میدان تصور کر کے بے تحاشہ دوڑتے پھرتے ہیں۔ شوہر ان کے پیچھے جان ہلکان کر کے اپنا عہد طفلی یاد کرتا ہے۔ جس میں اکثر ناکام ہو کر بیوی کے طنز و طعنوں کا شکار بھی بن جاتا ہے۔

منشی پریم چند نے بیوی کی نفسیات پر فقرہ چست کیا تھا "عورت ہزار غم برداشت کر لیتی ہے مگر میکے کی برائی برداشت نہیں کرتی۔" بالفرض اگر شوہر نے عمداً یا سہواً اپنی سسرال کی شان میں کوئی طنزیہ مدح سرائی یا شکوہ آمیز فقرہ چست کر دیا ہو تو بیوی اپنی سسرال کے نسل در نسل مُردوں کو مخصوص القابات نوازنے سے باز نہیں آتی۔ اس کے برعکس جہاں شوہر نے اپنی سسرال کی تعریف کا سرا چھیڑا تو بیوی پھولے نہیں سماتی اور اسے آغاز کا انجام اپنے خاندان کی تعریف و توصیف کے حوالے نیز ایسے قصیدے وضع کرنا شروع کر دیتی ہے کہ شوہر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس فاش غلطی کے اعادے سے تائب ہو جاتا

www.urduchannel.in

ہے۔ شوہر کے مزاج میں شوخی کا عنصر ہو تو اپنی سسرال سے متعلق اظہار خیال سے قبل اپنے بردران نسبتی کی تعداد، جسامت، طاقت اور اثر و رسوخ کا اندازہ پیشگی طور پر کر لے یا کم از کم مستقل عتاب بیوی کی لعب طعن کا منتظر و مستحق رہے۔

بعض شوہر حد درجہ محتاط ہوتے ہیں جو بیوی کو فضول کی لعن طعن کا موقع فراہم نہیں کرتے۔ تب بیوی کی دسترس میں اس کے اپنے بچے ہوتے ہیں جن پر نزلہ گرا کر وہ ان کو ان کی خاندانی خصلتوں کے حوالے سے من چاہے القابات سے نواز کر اپنے دل کا غبار بہر حال نکال لیتی ہیں۔ بچے ان دقیق اور تہہ دار باتوں کے مفاہیم سے خاک واقفیت نہیں رکھتے مگر اصل تختۂ مشق تو ناک دار شوہر کی ذات ہوتی ہے جو مکھی کی نشست بھی گوارا نہیں کرتا۔ اگر بروقت خاندانی حمیت و غیرت بیدار ہو گئی تو اس منظر نامے کو پانی پت میں تبدیل ہونے میں قطعی تاخیر نہیں ہوتی۔ اگر شوہر نے بیوی کی ٹیڑھی پسلی سے معذور جان کر تدبر، تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کر دیا تو جنگ کی ابتدا نہیں ہوتی البتہ بیوی کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ اسی بہانے وہ اگلی پچھلی رنجشوں کا قضیہ شوہر کی دلآزاری میں تلاش کر لیتی ہے گویا

کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ

شوہر بے چارہ بے نیازی اور بے اعتنائی کی آڑ میں اس طرح نہ جانے کتنی ہنگامی اور غیر متوقع خانہ جنگی کے مواقع ٹال کر اپنی وسیع الظرفی اور عزت و وقار کا بھرم رکھ لیتا ہے تاکہ عزت نفس بھی مزید مجروح نہ ہو اور تعلقات میں کشیدگی سے معمولات اور خدمت بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ مگر اس معراج کو پہنچنے کے لئے خاصی مشق اور تجربہ درکار ہے۔ ہاں جن کو زیادہ تجربہ ہو جائے تو وہ بے چارے جسارت کی حسرت ہی دل میں لئے اس دار فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ مرزا نے کہا تھا

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اگر اللہ تعالیٰ شوہروں کو یہ سعادت ودیعت فرمائے کہ تم بیوی کی خوشنودی کی خاطر ایک مرتبہ مر کر پھر زندہ ہو سکتے ہو۔ یقین جانئے شوہر حضرات اتنے احمق ہوتے ہیں کہ وہ فوراً ایسا کر گذریں گے۔ البتہ بیوی کا وہی ازلی جواب ہوگا۔ ''ہونہہ اس میں کیا کمال کی بات ہے؟'' تب شوہر کو یہ بات بخوبی جان لینا چاہئے کہ بیوی تاحیات نہ تو اس کی شکرگذار ہو سکتی ہے نہ ہی اپنے حسن پر جان نچھاور کرنے والے شوہر کی قدردان۔ شوہر اپنی بیوی کو تمام عمر مرغ مسلم کھلا کر بھی اس کے میکے کی ایک وقت کی دال کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا بعض شوہر اپنی تعریف سننے کی توقع میں بے حساب اخراجات کا بار برداشت کرتے ہیں۔ بساط بھر کاوش میں نہ جانے کیا کیا خیال اور اہتمام کرتے ہیں مگر اخیر میں مایوسی کو گلے لگا لیتے ہیں۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم   نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

جب معاملہ اس صورتحال کے یکسر برعکس ہو کہ آپ بیوی کی مدح سرائی، حسن کی تعریف اس کے اور میکے کی قصیدہ خوانی میں مشغول رہیں تو آپ کے لئے نت نئے پسندیدہ پکوان، خصوصی خدمات، خاطر مدارت کے ساتھ ساتھ موٹے جیب خرچ کے امکانات بھی خود بخود روشن ہو جاتے ہیں۔ برسر روزگار (صاحب مال وزر) بیویاں صاحب حیثیت اور صاحب نصاب بھی ہوتی ہیں جن کے نکمے شوہر عجیب وغریب حربے بروئے کار لا کر بیوی کے حسن اور رقم کی زکوٰۃ وصول کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف بیوی کی تنخواہ پر پلتے ہیں بلکہ بہتر معیار زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ علحٰدہ گفتگو ہے کہ بیوی اپنی سہیلیوں اور شناسا خواتین میں اپنے شوہر کے غلامانہ اوصاف کی کیفیت بیان کر کے خود ممتاز ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ بھی اپنا حساب بیباق کر لیتی ہے۔ مگر بے چارے شوہر کو اپنے سارے مردانہ جوہر کو بالائے طاق رکھ کر سعادت مندی بلکہ بیوی کی رضامندی کا نیازمند ہونا پڑتا ہے

www.urduchannel.in

بیوی کے سر کا تاج رہے سال بھر تو ہم   پھر اس کے بعد بیوی کے پاپوش ہو گئے

۔شوہر کی اصطلاح میں یہ ہوتا ہے کہ ''مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟'' اور بیوی کے تناظر میں شوہر کی تذلیل آمیز شبیہہ وہ بھی ہندی اصطلاح میں یوں ہوگی کہ ''نر جنم سدا سُکھی ''

توڑ ڈال ڈال، میں پات پات

بیوی بھی شوہر کی بالادستی کو طوعاً کرہاً گوارا کرتی ہے۔ ورنہ دل میں تو وہ خود کو رانی ہی تصور کرتی ہے۔ وہ شوہر سے وقتاً فوقتاً اپنی تعریف وتوصیف، خدمات کا اعتراف اور ناز برداری کا خراج برابر وصول کرتی رہتی ہے۔ شوہر کو ہمیشہ اپنی ضد، انا، فرمائشوں اور ہٹ دھرمی کے دھرم سنکٹ میں الجھا کر رکھتی ہے گویا شوہر کی ذات لٹو ہو اور بیوی کی خوشنودی اس لٹو کا محور۔ شوہر بھی بے چارہ بزبان غالب معصومانہ اقرار کر لیتا ہے کہ

خانہ زاد زلف ہیں زنجیرے بھاگیں گے کیوں   ہیں گرفتار وفا زنداں سے

گھبرائیں گے کیا؟

مشہور مقولہ بھی رائج ہے۔ ''جو شخص ساری دنیا کے تمام محاذ فتح کر لیتا ہے وہ گھر کے محاذ میں ضرور شکست سے دوچار ہوتا ہے''۔ مگر دلیر شوہر اپنی خفت وپشیمانی کے سدباب کی خاطر یا دوستوں میں اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کی غرض سے فرضی قصے سنا کر دوستوں کو مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ یہ حکایات اور قصے گھر گھر عام ہیں اور ان کی حقیقت بھی اب راز کہاں رہ گئیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ

ے دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

شوہروں کو اکثر اپنی بیویوں کی ناز وادا، نافرمانیوں کا گلہ شکوہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ مگر دل کے غبار کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی کہ ہونٹ بھی اپنے اور دانت بھی اپنے۔ یہ بڑے صبر وضبط اور تحمل و

برداشت کی منزل ہوتی ہے کہ دل ناداں بغاوت کر بھی دے اور اظہار رائے کا پٹارہ جس محسن وغم گسار کے آگے کھولئے گا وہاں انتہا میں یہی مبارک ''زن مرید یا'' جورو کا غلام'' جیسے القابات یا تاثرات میسر ہوں گے۔لہذا اس خوف سے خاموش شوہر شمع کی طرح پگھلتا جاتا ہے۔گویا

ہونٹوں کے پاس آئے ہنسی کیا مجال ہے　　یہ دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں

شوہروں کے دائمی وقائمی استحصال، مستقل تنزلی، ابتر صورتحال اور منتظر فردا ہونے کے رویئے سے متاثر ہو کر ہم ایک ''انجمن برائے تحفظ شوہراں'' کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ جہاں رنجیدہ، ستم زدہ، زخم خوردہ شوہر حضرات نہ صرف اپنے جلے دل پھپھولے پھوڑیں گے بلکہ ایک دوسرے کا غم بھی ہلکا کرسکیں گے نیز بیویوں کو زیر دام کرنے کے حربے، داؤ پیچ اور طریقے بھی سیکھیں گے۔بلکہ اتحاد واتفاق سے شجر ممنوعہ کے گندم کھانے پر اکسانے کا انتقام لینے کی بھی کوئی مضبوط حکمت عملی ترتیب دے سکیں گے۔ظاہر ہے جمہوریت میں ہم مظلوم شوہروں کے حقوق کا تحفظ بھی کیا جانا ضروری ہے۔اگر اس قبیل کے شوہروں کو درج بالا تجاویز پسند یا راس آجائیں تو وہ مجوزہ انجمن کی رکنیت اختیار کرنے کی زحمت فرمائیں تا کہ متفقہ طور پر صدر کا انتخاب بھی عمل میں آجائے۔یوں تو

قابل صد احترام، قدر کے لائق ہیں آپ　　شوہروں کی انجمن کے صدر کے لائق ہیں آپ

ہم نے بساط بھر چراغ جلا کر اپنی روشنائی سے روشنی پھیلا دی ہے بقیہ مراحل اور معاملات آپ کے ذمے سونپتے ہیں۔بلا آخر ناچیز بھی ایک مظلوم شوہر ہے اور گھر باعافیت لوٹ جانے کی تمنا بھی دل میں کروٹیں لے رہی ہیں چونکہ اب بھی ہم اپنی ذات میں کشتیاں جلانے کا حوصلہ مجتمع نہیں کرسکے ہیں۔

www.urduchannel.in

۱۳۔گالیاں کھا کے۔۔۔

معاشرے میں جب کبھی اخلاقی اقدار انحطاط پذیر ہوتی ہیں تو اس دور میں طرح طرح معاشرتی علتوں کے ساتھ دولت دشنام (گالی گلوج) کے خزانے بھی ابل پڑتے ہیں۔عوام کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوتے ہی گالیوں کا پیمانہ چھلک اٹھتا ہے۔نہ گالیاں دینے والے کو اس کی علت، شدت، حدت کا احساس ہوتا ہے اور کھانے والے کے لطف کا تو احساس ہی جدا ہے۔بقول غالب

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

ہر خاص وعام کے لب گالیاں دینے کے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔جا بجا دشنام طرازیاں، حقارت آمیز فقرے وامثال، اہانت آمیز کلمات، طنز وتشنیع، لعن طعن آمیز انداز گفتگو ی بہتات ہوجاتی ہے۔یوں بھی دولت دشنام لا زوال ہے جسے نہ کساد بازاری کا خطرہ لاحق ہے نہ خسارے کا خوف ہی مسلط ہوتا ہے۔آپ اسے عوام الناس میں جتنا تقسیم کریں گے جس قدر شدت سے پہنچائیں گے اس کے کئی گنا شدید اور اضافی شکل میں اس کار دعمل بھی بلا معاوضہ اور فوری طور پر پائیں گے۔تا کہ طبع نازک پر کسی کے احسان کا بار گراں باقی نہ رہے۔یہ وہ واحد کاروبار ہے جس میں ادھار کا ہی کھاتہ لکھت پڑھت رسید اور بینک کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی ہے۔لہذا دولت دشنام کی تقسیم میں نقصان کا قطعی اندیشہ نہیں رہ جاتا۔ہر طرف سے منافع کی آمد یقینی ہوتی ہے۔جب تک وہ زبانی وکلامی انداز میں جاری رہتا ہے۔جہاں معاملے میں ٹھوس سے ٹھوس ٹکرانے کا ٹھوس جواز پیدا ہو جاتا ہے۔وہاں مذکورہ کلیہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

دشنام طرازی کہنے کو تو ملعون عزازیل یعنی شیطان کا آلہ کار اور دام فریب ہے مگر اس کے صارفین اکثر وبیشتر امت مومنہ کے شیدائی پائے جاتے ہیں۔یہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کی

ادائیگی کے بعد انسان کے غصے کو نقطۂ اشتعال کو نقطۂ انجماد کی طرف گامزن کرتی ہے۔ دشنام طرازی کے بعد فاعل کو یک گونہ سکون کا احساس ہوتا ہے اور مفعول پیچ و تاب کھا کر کہ یا تو چپ رہ جاتا ہے یا اس سے بھی کرارہ، منافع بخش رد عمل اسے لوٹا کر وہ بھی یہی سعادت حاصل کرتا ہے۔ جہاں انسان کی انا کو چوٹ پہنچتی ہے یا تشخص کی عظمتوں کو حرف غلط کی رد کیا جاتا ہو۔ جہاں دل جلوں کو اپنے پھپھولے پھوڑ نا مقصود ہو، جہاں اپنا رعب داب قائم رکھتے ہوئے ماتحتوں، دست نگروں اور کمزوروں پر نزلہ گرانا ہو تو اس مقام پر نہ تو دشنام طرازی کے لئے شعوری کوشش درکار ہوتی ہے، نہ پیشگی منصوبہ بندی اور سوچ بچار کارگر ہوتا ہے۔ یہ عمل خود بخود سرزد ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دشنام طراز کو یک گونہ اطمینان میسر آجاتا ہے۔ دل کا غبار جو فاعل کی لوح زباں سے نکل جاتا ہے مفعول کی آنکھوں سے نکلنے کی سبیل تلاش کر لیتا ہے۔ انتقام لینے کی حسرت نکل جاتی ہے تسکین کا سامان ہو جاتا ہے۔ ان معنوں میں وہ ایک نفسیاتی دباؤ سے اپنے آپ کو بچا کر اس کا بار مفعول کے سر ڈال دیتا ہے۔ ہر چند کہ بجز تمام اوصاف کے دشنام طرازی ایک قبیح ترین فعل ہے جسے مہذب معاشرے میں دوسروں کے لئے معیوب تصور کیا جاتا ہے۔

صنف دشنام طرازی میں نت نئی جدت، تراکیب، حسن بیان، اصطلاحات، تشبیہات و استعارے و تجربات کی خاطر نہ تو کسی دانشور کی گراں قدر خدمات درکار ہیں اور نہ ہی مرج و پابند اصول و ضوابط ہیں۔ نہ فرہنگ درکار ہے نہ شرح نگاری کی ضرورت ہے، نہ اسکول کالجس اور یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے نہ سائنسی آلات و تجربات کی سعی درکار ہے، نہ تحقیق و رسد گاہیں درکار ہیں اور نا ہی کیمیائی تراکیب اور طبعی اوزان کی ثقالت ہی لازمی ہیں۔ شاید یہی آزادئ بیاں اس کی نمو اور افزائش کی بنیادی وجہ ہے۔ یہ عوامی سرمایہ خود رو پودے کی طرح شاخ درشاخ اپنا نشاستہ عوامی تقاضوں سے بہم کشید کر کے نمو حاصل کر لیتی ہے کہ آن کی آن میں یہ شاخ دار، ثمر بار، تناور، چھتنار درخت بن جاتی ہے۔ جس پر شیطان پیر لٹکائے انہیں جھلاتا ہے۔ ایک محتاط انداز کے مطابق، بغیر کسی سرمائے اور شعوری کوشش کے جتنے اصطلاحی تجربے و تراکیبی اضافے صنف چشنام طرازی میں وجود میں آتے ہیں۔ اتنی تیز رفتار ایجاد و اختراع کسی اور میدان میں تقریباً نا ممکن ہے۔ دشنام طرازی تعلیمی قابلیت و لیاقت کے قید و بند اور تکلفات سے آزاد ہوتی ہے۔ گالیاں نہ معاشرتی اقدار اور حسب مراتب کی قدر کرتی ہے نہ عزت نفس کو ہی خاطر میں لاتی ہیں۔ بس فطری تقاضوں کے عین مطابق زبان کی نوک سے بے اختیار پھسل جاتی ہیں۔

جس طرح ملبوسات کے مختلف رنگ، ڈیزائن، قسم، ساخت اور استعمال کے اعتبار سے مردانہ، زنانہ، بچکانہ، موٹے اور پتلے ہوتے ہیں عین یہی ساری خصوصیات صنف دشنام طرازی میں بھی میسر آتی ہیں۔ زنانہ اور مردانہ گالیوں سے عموماً کان آشنا ہوتے ہیں۔ بچکانہ دشنام طرازی کا طریقہ دائرۂ ادب میں رہ کر مکمل ہو جاتا ہے۔ جیسے بد القابات سے غائبانہ و بانفس و نفیس تخاطب اور ادبی کو سادینا وغیرہ۔ اسی طرح برموقع و برمحل موٹی اور پتلی گالیاں بھی غصے کی حدت، دلآزاری کی شدت کے اعتبار سے یا تعلقات کو ملحوظ خاطر رکھ کر دی جاتی ہیں۔ بقول مومنؔ

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی　　　قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

فی زمانہ زنانوں میں مردانہ لباس کے تئیں رغبت اور مردوں میں زنانہ لباس زیب تن کرنے کا شوق جس طرح عام ہوتا جا رہا ہے۔ عین اسی طرح خواتین بھی مردانہ دشنام طرازی کے بعد داد طلب نظروں سے عوامی تاثرات کا جائزہ لیتی ہیں اور بعض اوقات فخر و مباہات کا احساس غالب بھی ہوتا ہے۔ خوشنما لباس سے شخصی تکریم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بدنما گالیوں سے شخصی تذلیل اور سفلے پن کا اظہار ہوتا ہے۔ اب کس کو کون سمجھائے کہ بدنما گالیاں پہننے (سننے) سے یا پہنانے (سنانے) سے ذلت میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا ہے۔

www.urduchannel.in

ایک زمانے میں دشنام طرازی صرف ذاتی رعب دبدبے قائم کرنے، کسی کی شان میں گستاخی، لعن طعن، طنز و تشنیع یا لعنت وملامت کے اظہار کی سبیل ہوتی تھیں۔ مگر فی زمانہ اس کا چسکہ، لذت اور استعمال زبان زد خاص وعام ہے۔ جو جدید فیشن کی طرح نئی نئی اشکال تبدیل کرتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اب تو انداز تخاطب، بے تکلفی کے القابات، تعریف وتحمید کے فقرے اور حتی کے طنز ومزاح کے اسلوب بھی تحقیر آمیز گالیوں میں لپیٹ کر پیش کئے جاتے ہیں۔ جسے نہ کہنے میں فاعل کو عار ہے اور مفعول کے لئے گراں بار طبع۔ شاید چچا غالب نے اسی جذبے کے تحت یہ شعر وضع کیا ہوگا کہ

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اب تک یہ سارا کاروبار دشنام طرازی تو فعل، فاعل ومفعول کے گرد محو گردش رہا۔ اب سامع کو کس کھاتے میں رکھئے تو لیجئے سامع کے دل کا حال بھی سنتے جائیے۔ سامع بھی بھانت بھانت کے ذوق وشوق کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض تو دشنام طرازی سے بھی حظ اٹھاتے ہیں اور مغلظات میں بھی مزاح کا مادہ کشید کر لیتے ہیں۔ جیسے مرغ کوڑے کے ڈھیر سے دانے چن لیتا ہے۔ بعض سامعین کو تذلیل بھی عزیز ہوتی ہے بشرطیکہ اپنی نہ ہو بھلے ہی کسی دوسرے کی ہو۔ بعض جہاں دیدہ سامعین کو علت دشنام طرازی کے پس پردہ فاعل کی عدم تربیت اور والدین کی عدم توجہی کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ کہیں دولت کی فراوانی اور علاقے اور خاندان کی نسبت نظر آتی ہے۔ بعض سامعین کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ بعض سامعین کے کان غیبت سے خاص رغبت اور ادھر کی بات اُدھر کرنے کے ماہر ومجبور ہوتے ہیں۔ انہیں بھی صحت گفتار اور گندگیٔ کردار کے موضوع اور پہلو ہاتھ آجاتے ہے۔ سامعین کی نظر میں گالیاں بھی باعث الطاف وکرم ہوتی ہیں جب اپنے دشمنوں کے حق میں دی جائیں۔ تب بڑے لطف وانبساط کا احساس تازہ ہوتا

www.urduchannel.in

ہے۔

بعض تعلقات کی نوعیت عجیب وغریب ہوتی ہے۔ جہاں اظہار محبت وعقیدت کی سبیل ہی دشنام طرازی بلکہ گالیوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ بے تکلفی کا معیار مغلظات کی حدت وشدت اور اقسام دشنام سے طے کیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے اخلاقی جرأت کی نمائش اور دشنام طرازی سے احتراز کیا تو اس پر تصنع کا شائبہ یا سازش کی بو کا گمان غالب ہو جاتا ہے۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب　　یاد تھیں جتنی دعائیں، صرف درباں ہو گئیں

دشنام طرازی کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی تاریخ بنی نوع انسان ہے۔ لہذا عاشق ومعشوق کی چھیڑ چھاڑ میں بھی کبھی دشنام طرازی کے عناصر در آتے ہیں۔ معشوق کے ایک بوسے کی خاطر عاشق کو ہدف شتم بننا پڑتا ہے۔ ذلت کی منازل سے بخوشی گذر جانا ہوتا ہے کہ دشنام معشوق کی لذت کسی بوسے سے ہرگز کم نہیں ہوتی۔ لہذا عاشق دانستاً دشنام معشوق کی لذت سے روشناس اور اس کا متحمل، متمنی ومتقاضی ہوتا ہے۔

بوسہ نہیں، نہ دیجئے، دشنام ہی سہی　　منہ زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

البتہ عاشق کی قسمت میں اگر جلد باریابی ہوتی تو ہر کوئی عاشق بنا پھرتا۔ عاشق جب اپنی قسمت آزمانے اور معشوق سے بوسہ بازی میں ناکام ہو جاتا ہے۔ جب نصب العین خاک میں مل جاتا ہے تو وہ لذت دشنام طرازی پر ہی قانع اور شاکر نظر آتا ہے۔

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے　　کہ نہ سمجھیں وہ لذت دشنام

معشوق کی دشنام طرازی کی لذت عاشق کو کن کن تصوراتی مسرتوں سے باور کرواتی ہیں کہ عاشق تمام ذلت ورسوائی سے بیگانہ بوسے کی لذت میں سرگرداں دشنام معشوق سے لذت استہزا کے کیف سے سرشار ہونے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بلکہ معشوق کی تمام تقصیرات اپنے ذمے لے کر بضمن

اعتراف و بانگ دہل کہہ اٹھتا ہے۔

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

۱۴۔مال مفت دل بے رحم

انسان کا کا کفایت شعار یا قناعت پسند ہونا کوئی معیوب یا معتوب بات تو نہیں ہے بلکہ ان عادات کا شمار تو محاسن میں ہوتا ہے مگر ان محاسن کے پس پردہ دوستوں اور زیردستوں سے اپنی شوق طبع کے لئے فضول خرچیاں اور بسیار خوریاں کروانا زمانہ سازی یا ابن الوقتی ہو سکتی ہے۔ البتہ شرافت کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ایسے بے شمار کردار ہمارے اطراف واکناف میں ”ڈھونڈو ایک ہزار ملتے ہیں“ کے مصداق محوخرام و آرام نظر آتے ہیں۔بعض ایسے ہم باش قسم کے یار باش احباب بھی پائے جاتے ہیں جن کی بغل میں جب تک کوئی طفیلیہ (مصاحب) نہ ہو۔ انہیں اپنی امارت کے شایان شان اپنے صاحب آن بان شان ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جو ایسے دوستوں کو کبھی فراخ دلی کبھی از راہ تعلقات کے تحت برداشت کر لیتے ہیں جو اصل میں مفت خور اور طفیلئے ہوتے ہیں۔طفیلیوں کی پہلی پسند ایسے اشخاص ہوتے ہیں جنہیں عوام الناس میں اپنی امارت، کبریائی، برتری اور فوقیت کی دھاک جمانے کا شوق انہیں پیہم آتش زیر پا رکھتا ہے۔لہذا مال مفت کے شیدائی طفیلئے عام طور پر امراءَ و روساءَ، صاحب اقتدار و اختیار، نودولتیوں اور سیاست دانوں کے ہاں خاصے مقبول و معروف ہوتے ہیں۔جو بادی النظر میں سماجی رواداری اور طبقاتی توازن کی اعلیٰ مثال بھی ہیں۔انسان کل کائنات میں ایسا صرف واحد سماجی جانور ہے جو ہمہ وقت مختلف اقسام کے طفیلیوں کی زد میں رہتا ہے بلکہ بسا اوقات بڑا خوش و خرم بھی رہتا ہے۔فریق ثانی کا مسلک بالکل نستعلیق و راست ہے کہ جب تک تھالی میں بھات، تب تک تیرا میرا ساتھ۔ بلفظ دیگر امرا کو امیر بنانے یا کہلوانے اور ان کی شایان شان عزت و اکرام کا اہتمام ہی ان کا فریضۂ منصبی ہے۔جس میں وہ بڑے طاق ہوتے ہیں۔انہی کی مصاحبت میں صاحب کی امارت کو

www.urduchannel.in

چار چاند بھی لگتے نظر آتے ہیں۔

ایسے باوصف حضرات کے اہل خانہ کو بھی ان کی طرف سے یہ قلق نہیں ہوتا کہ بیٹا نکھٹو ہے۔ البتہ یہ اطمینان خوب راس آتا ہے کہ بیٹا نہ صرف امیروں اور ارباب اقتدار کی صحبت میں وقت گذارتا ہے۔ بیٹا بڑا الائق فائق، نیک خو اور احسن عادات و اطوار اور نیک خصائل کا مالک ہے۔ خوش گمانیوں کا سلسلہ دراز ہو کر غلط فہمیوں کی حدود سے جاملتا ہے کہ ہمارا برخوردار قناعت پسند اور کفایت شعار واقع ہوا ہے۔ نہ فضول خرچیوں کا عادی ہے نہ بسیار خوری کی علت کا۔ کفایت شعاری تو گویا گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ مگر ان بے چاروں کا کیا قصور؟ انہیں کیا پتہ کہ ان کے یہی لائق فائق، کفایت شعار اور قناعت پسند فرزند دن بھر میں نہ جانے کتنے مرغوں کو بغیر بسم اللہ کے حلال کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ گویا وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا۔

کام تنہا جی حضوری تو نہیں   کھیر حلوہ ہی ضروری تو نہیں
ہم اتر جاتے ہیں روغن جوش میں   جلوہ گر ہیں بزم ناؤ نوش میں
محفلیں سنسان ہیں اپنے بغیر   دعوتیں ویران ہیں اپنے بغیر

مفت خوروں کے کچھ محبوب مشاغل ہوتے ہیں۔ جیسے مفت کی کرسیوں پر مفت کی اخبار بینی، مفت کی چائے سے لذت آمیز چسکیاں، مفت کے پان و زردے سے ہونٹ سرخ کرنا اور گٹکوں کی پیکوں سے دیواریں رنگین کر دینا، مفت کی بیڑی و سگریٹ نوشی کے گہرے کش لینا اور ان سے دائرے نما مرغولے فضا کے حوالے کرنا، مفت فلم بینی یعنی سمعی و بصری عیاشی، مفت کی مہمان نوازیوں، خاطر داریوں کا لطف اٹھانا، مفت کی دعوتوں اور ضیافتوں کا لطف اٹھانا، مفت کی سواریوں پر سیر و تفریح کے مزے چکھنا، حتیٰ کہ مفت کی گھڑیوں میں وقت دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان خواص کے سبب ہی مفت خور حضرات سیاست دانوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ بالخصوص انتخابات

www.urduchannel.in

کا موسم انہیں عید کی خوشیاں فراہم کرتا ہے۔

اپنے آقائے گرامی کے غلام   ایک ہی فکر ہے بس صبح و شام
کر رہے ہیں ہم بھی کچھ کار ثواب   ہم سے ہیں سب اہل ثروت فیضیاب
ہم سے الجھئے نہ مفت میں جناب   اپنے ہتھکنڈوں کا ہم خود ہیں جواب

مفت کی گردان اب خاصی طویل ہوتی جا رہی ہے جو شاید قارئین کے ذوق لطیف پر گراں بار گذرے۔ لہٰذا راقم الحروف کی آرا میں ایسے مفت خور و مفاد پرست عناصر کی خاطر ایک عدد استعاراتی عرفیت ''سوامی مفتا نند جی'' عطا کی جانی چاہئے۔ اب اگر اس عرفیت کی وجہ تسمیہ کا خلاصہ بھی ہو جائے قارئین کو لطف آجائے۔ سوامی کی توجیہہ یوں کہ انہیں جسے دار العمل یا دار الاسباب ہونے کا شرف حاصل ہے اس میں محنت و مشقت اور کسب مال کے فریضے سے سبکدوش ہوتے ہیں یعنی برگشتہ و بے نیاز ہوتے ہیں۔ جو کسی پنڈت، تارک الدنیا، مہنت یا سادھو کا کردار ہوتا ہے۔ مفت خوری کی جملہ مفید عادات انہیں مفت میں جملہ مسرتیں (آنند) بہم پہنچاتی ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے سوامی مفتا نند کی عرفیت سے بہتر بھلا کیا وجہ تسمیہ ہو سکتی ہے۔ باوجود ان تمام اوصاف حمیدہ کہ ہم انہیں عمداً یا سہواً گوارا بھی کر لیتے ہیں لہٰذا ''جی'' کا لاحقہ لگا کر ان کی شخصیت کی قامت درازی کا بھرم بھی رکھ لیتے ہیں خواہ طنز کے زمرے میں ہی کیوں نہ ہو۔ یوں بھی چکنے گھڑے پر کتنا بھی پانی پڑے گھڑے کو کیا سروکار؟

مفت خوروں میں وقت کے ساتھ یا مشاہدے اور تجربے کے پیش نظر مخصوص پیشہ ورانہ اوصاف در آتے ہیں۔ جیسے جی حضوری، قصیدہ خوانی، مدح سرائی، چاپلوسی، ضرورت سے زیادہ سر ہلانا اور مسکرانا، بات بے بات پر صاحب کی بات میں ہاں میں ہاں ملانا، خاموشی سے گردن خم کر کے تائید کرنا، بروقت لقمہ دے کر بات سنبھال لینا وغیرہ۔ یہ تمام باتیں صاحب اقتدار اور

صاحب مال زر کو نہایت عزیز اور بیساکھی کی طرح پائیدار ضروری محسوس ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان میں ارباب دولت وسیاست کے مصاحب بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ جس کی ذیل و طفیل میں ان کے تمام ذوق شوق، جملہ ضروریات کے اخراجات اور باوقار وقت گذاری کے ذرائع یکسر مفت مہیا ہو جاتے ہیں۔ اپنی تعریف کے بھوکے نودولتئے، امرا، سیاست داں، فضول خرچ اور بسیار خور قسم کی موٹی اسامیوں کے گرد اس قسم کے کردار مل ہی جاتے ہیں۔ یہ کردار اپنے ہم باش دوست سے مطلوبہ نشاستہ کشید کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر آزاد اور آرام دہ معیار حیات کا لطف اٹھاتے ہیں۔ گویا ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ آوے چوکھا۔

مفت خور حضرات محفل یاراں میں اپنے صاحبوں کے ہم رکاب اور باتوں میں شرکت کے مرحلے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ مہنگے ترین ہوٹلوں میں اعلیٰ ترین پکوانوں اور ضیافتوں سے لذت کام و دہن کشید کرنے اور فراغت پانے کے بعد جب موٹی رقوم کی ادائیگی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو عام مفت خور تو بے نیازی سے چلتا ہوا ہوٹل کی زیب و زینت کا نظارہ میں مصروف کار ہو جاتا ہے۔ مگر زمانہ ساز، عیار اور مکار قسم کا مفت خور بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ کر کہ "آپ رہنے دیجئے۔" اپنے صاحب کو بھی مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک گہری تصنع آمیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر سج جاتی ہے۔ البتہ بل کی ادائیگی میں اس کی شعوری کوشش ناتمام صاف عیاں ہو جاتی ہے اور رویہ منتظر فردا ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ ہاتھ بھی اتنے تجربہ کار اور مشاق ہوتے ہیں کہ بصد کوشش بسیار جیب کی بالائی حدود کو ٹٹول کر بے نیل و مرام اپنی سابقہ ہیئت پر لوٹ آتے ہیں۔ جیب کی اتاہ گہرائیوں میں اترنے سے اس طرح گریزاں ہوتے ہیں جیسے انہیں جان جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ تاوقتیکہ رقم کی ادائیگی کا مرحلہ صاحب کے ہاتھوں عمل میں آجاتا ہے۔ جس سے موصوف کی عزت و توقیر بھی الحفیظ والامان محفوظ رہ جاتی ہے۔ یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر ہی کھلاتا ہے۔ باوجود اس رحمت کے اکثر مفت خور اللہ کے شکر گذار بندے نہیں ہوتے ہیں۔

غیرت مند شخص مر کر بھی دوستوں کے شانوں کا بار نہیں بنتا اس کے برعکس مفت خور حضرات جیتے جی اپنے دوستوں کے دوش ناتواں پر سوار ہوتے ہیں بلکہ تکیہ کر بیٹھتے ہیں۔ اپنی عادات مہنگی ترین معمولات کی تکمیل کے لئے وہ نت نئے کاندھے تلاش میں کوشاں و سرگرداں ہوتے ہیں۔ جن پر اپنے آزمودہ کار تجربہ کار حربوں کی ضرب لگا کر وہ فیض کشید کیا جائے جو درکار ہوں۔ جس کا آغاز سخن ہے خوشامدانہ، دلآویز اور بے جا تعریف آمیز گفتگو جس کے ذریعے دلوں میں اپنے تئیں نرم گوشہ اور گھر کر لینا چنداں مشکل کام نہیں ہوتا اور معروف بھی ہے کہ

سو کام نکلتے ہیں خوشامد سے جہاں میں

بعض اوقات نئے دوستوں کی تلاش میں مفت خور حضرات مانند شکاری اپنے بسمل کی جستجو میں برسر پیکار ہوتے ہیں۔ جب تک نئے شکار کا لطف و کرم عنایات انہیں میسر ہوتی ہیں۔ مفت خور حضرات کی قوت کشید بھی خاطر خواہ حوصلہ پاتی ہے۔ جوں ہی ان پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ اب تلوں میں تیل نہیں بچا ہے تو وہ بجائے غم گساری، چارہ گری یا وفا شعاری کے فوراً اگلی ڈال کا رخ کر لیتے ہیں۔ اس موقع شناس طبیعت کی بنا پر ان کی طوطا چشمی اور ابن الوقتی شکار پر بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ اس طرح متمول عیاش طبع اور فراخ دل حضرات ہی ان کے زیر دام آتے ہی رہتے ہیں۔

منہ کو جب مکھن سے بھر لیتے ہیں ہم — اچھے اچھوں کی خبر لیتے ہیں ہم
ڈالنا یاروں کی یاری میں بھرم — خیر خواہوں کا لڑا دینا بہم
کھیل ہے اپنے تو بائیں ہاتھ کا — بیٹھے بیٹھے مہرے سرکاتے ہیں ہم

www.urduchannel.in

مفت خور حضرات عام طور پر خاصے بے غیرت،قوت ارادی اور حواس کے مضبوط انسان ہوتے ہیں۔جنہیں سبکی، ہتک،غصہ،جھلاہٹ اور انتقام کے دورے نہیں پڑتے۔وہ کمال ہشیاری سے ان تمام علتوں کو ہنستے ہنستے اپنی ذات میں جذب کر لیتے ہیں۔جس سے انہیں ہیجان، بلڈ پریشر اور عارضۂ قلب جیسے امراض نہیں ہوتے۔اگر کوئی بسمل نیم جاں،شاکی،دل جلا ان پر طنز وطعنوں کے تیر اور بدزبانی کے نشتر ہی کیوں نہ برسائے وہ شان بے نیازی سے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اسے دھول چٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔وہ اپنے غصے کو تحلیل اور شخصیت کو متوازن رکھنے کے فن میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔وہ زبان خاموش یا اشاروں سے ان شرارتوں کا کرارہ جواب اس طرح دے دیتے ہیں کہ حملہ آور اپنے ہی دانت کھٹے کر بیٹھتا ہے۔راقم کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا مفت خور حضرات جن کا وطیرہ ہے ”مال مفت دل بے رحم“ اگر پوری دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ اپنی جملہ صفات و بابرکات کو کسی مخصوص پیشے یا صنعت میں بروئے کار لائیں تو ایک نہ ایک دن انہیں یہ احساس بھی ضرور غالب ہوگا کہ

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

البتہ مفت خوروں سے زیادہ اور سنگین مجرم اور اصل قصوروار حضرات وہ ہیں جو اپنی جھوٹی شان و عارضی توقیر کے لئے ان مفت خوروں کو غیر معینہ مدت کے لئے نہ گھر کا ہونے دیتے ہیں نہ گھاٹ ہی لگاتے ہیں۔ان کی صلاحیتوں اور وقت کا استحصال صرف اپنی تعریف وتوصیف اور حمایت بے جا کے لئے کرتے ہیں۔البتہ ان کے ہاں جو حقیقی محنت کش اور قابل افراد کی خدمات سے سرف نظر کرتے ہیں۔چونکہ مفت خوروں کے چنگل میں گرفتار شخص دنیا سے تو بیرنگ اٹھ سکتا ہے البتہ ترقی کے لئے نہیں اٹھ سکتا۔

www.urduchannel.in

۱۵۔خون کی تجارت

قدرت نے خواہ انسان ہو یا حیوان ہر قوم رنگ نسل اور علاقے،ذات وقبیل سے وابستہ ہوں ان کا رنگ سرخ بنایا ہے۔اگرچہ جذبہ بے رحمی وسفاکیت کے لئے سفید خون کا استعارہ یا طنز زبان زد خاص وعام ہے۔گو خون کی صلاحیتیں لاثانی ہیں مگر اس کی تاثیر بہر کیف اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے جہاں جسم فانی میں دوران خون زندگی کی علامت ہے۔وہیں جسم میں حرارت وحیات بھی پیدا کرتا ہے۔جب خون جمود کی شکل اختیار کر لے یہ موت کا پیغام بن جاتا ہے۔جسم بے جان وسرد ہو رہتا ہے۔خون کے رشتوں کی محبت اور عداوت دونوں ہی بے مثال ہوتی ہے۔پھر بھی خون خون کو پہچانتا ہے،باہمی تعلقات کے حوالے سے کشش و دفاع بھی محسوس کرتا ہے،جوش مارتا ہے بعض اوقات سفید بھی ہو جاتا ہے۔خون یوں تو اچھا بھی ہوتا ہے اور گندہ بھی۔اگر انسان کا خون سفید ہو جائے تو ساری محبت،اخوت،انسیت،مروت،رشتے ناطے اور انسانیت کے جذباتی جال سے آزاد ہو جاتا ہے۔خون کے رشتوں میں خون آشام جنگوں اور معرکوں سے ہماری تاریخ رنگین ہے۔جن میں سرفہرست مہابھارت اور رامائن بھی خون کے رشتوں میں ہی پیدا شدہ کشمکش و باہم معرکہ آرائی کا نتیجہ ہیں۔بقول عبدالسلام اظہرؔ

یہ رسم آج بھی زندہ مرے قبیلے میں
خود اپنے بہتے ہوئے خون میں وضو کرنا

خون اگر گرم ہو جائے تو عداوت،دشمنی،تشدد،اور انتقام کی نوعیت قتل جیسے سنگین وجارحانہ اقدامات کے لئے اکساتا ہے۔خون جب جوش مارتا ہے تو ساری نفرت،کدورت،عصبیت، علاقائیت،بربریت اور فرسودہ روایات کو بالائے طاق رکھ کر رشتے ناطے جوڑ دیتا ہے۔خون جب اپنا رنگ دکھانے پر آجائے تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔مگر اپنی اوقات وشناخت ضرور ظاہر کر دیتا

ہے۔اکثر امرا اور روسا جنہیں غرہ ہوتا ہے کہ انہیں دولت کی بدولت سات خون بھی معاف ہے۔وہ شب و روز غریب مزدوروں کے خون کو پانی کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔جب دل نہیں بھرتا تو مزدوروں کے خون کی ہولیاں کھیلنے سے بھی باز نہیں آتے۔غریبوں کے ارمانوں کا خون کرنا یا انہیں خون کے آنسو رلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بلکہ شوقیہ مشغلہ ہے۔خون چوسنا بھی ایک مستقل ومقبول شیوہ بلکہ آفاقی مسئلہ بن چکا ہے۔جس کے شائقین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔مگر اس کے رسیا اور شوقین یہ بھول جاتے ہیں کہ

ظلم پھر ظلم ہے بڑھے گا تو مٹ جائے گا　　خون پھر خون ہے گرے گا تو جم جائے گا

یوں تو انسانی خون چوسنے کا تصور ہی گھناونا اور کراہیت آمیز عمل ہے۔جو نہایت ظالمانہ ،وحشیانہ قبیح ترین عمل ہے۔ہر چند کہ انسانی خون چوسنا مچھروں کھٹملوں اور جونک جیسے دیگر جانداروں اور حشرات الارض کا مستقل غذائی وظیفہ اور جبلتی مجبوری ہے۔ان سے قطع نظر ان کے صارفین اور طلبگاروں میں سود خور مہاجن، ساہوکار، بنئے، زمیندار امرا، روسا، سیاست داں اور بینک بھی شامل ہیں جن کے سبب ملک کے بیشتر کسان خودکشی پر مجبور ہیں۔مذکورہ بالا اسامیاں انسانی خون چوس کر موٹے (خوشحال) ہوتے جا رہے ہیں۔جسے ہر زمانے میں ظلم اور استبداد قرار دیا گیا۔البتہ عصر حاضر میں خون چوسنے والوں کی صفوں میں شریفانہ اور شاطرانہ اضافے بھی ہو رہے ہیں۔لہذا خون چوسنے کا شیوہ میں پیش پیش پیشۂ چارہ گری ومسیحائی کے علمبردار ڈاکٹرس کی قوم ہے۔عہد ماضی میں ڈاکٹرس حکیم وطبیب کا پیشہ مقدس ومعتبر تصور کیا جاتا تھا۔مگر دور حاضر کے ڈاکٹرس اور ان کے معاون پیشہ حضرات میں بھی بعنوان خدمت انسانی وبعوض طبی خدمات خون چوسنے بلکہ سارا انسان نگل جانے کے ہنر میں مقابلہ آرائی جاری ہے۔جو قوم کے بے لوث خدمت کا دم بھرتے ہیں مگر دراصل قوم کے دم سے اپنی جیب بھرتے ہیں۔غالباً انفرادی طور پر مذکورہ

www.urduchannel.in

عملاس قدر کارگر اور منافع بخش نہیں رہا۔لہذا اسے مہذب ومنظم طور پر اجتماعی تجارتی وصنعتی شکل میں جاری کیا گیا ہے۔جو چشم زدن میں کسی پانچ ستارہ ہوٹل کی تمثیل معلوم ہوتی ہے۔تاکہ لذت آمیز منافع کشید کیا جا سکے۔

یہ جذبہ یہیں نہیں ٹھہرتا کمرشیل بینک ہوں یا بلڈ بینک ان کی اساس ہی انسانی خون کی لذت وقوت کشید کی بنیاد پر رکھی جاتی ہے۔کمرشیل بینک بنام معاشی خدمات اپنے صارفین کی مشکلات کے لئے سود پر قرض مہیا کرتے ہیں۔جن سے صارفین مکان کی تعمیر، گھریلو وتجارتی اشیا، کاروں اور دیگر سواریوں کے مصرف میں خرچ کر دیتے ہیں۔بینک آسان قسطوں میں اصل کے ساتھ سود کی رقم بطور خن چوسنے کا مستقل وظیفہ صارفین سے حاصل کر لیتے ہیں۔بلڈ بینکوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔جہاں خون کے عوض خون قیمتاً دیا جاتا ہے۔جہاں صارف کے جسم سے نکالا ہوا خون تو عطیہ، خدمت، خیر سگالی کے جذبات کے تحت قطعاً مفت وصول کیا جاتا ہے۔البتہ آپ کا مطلوبہ گروپ کا خون آپ کو مہنگے نرخوں پر بطور انسانی خدمت فراہم کیا جاتا ہے۔یعنی

؎ رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

البتہ ڈاکٹروں کی عجلت، مریض کی شدت تکلیف کا احساس، وقت کی تنگی اور عدم تحفظ کا ماحول انسان کو حواس باختہ کر دیتا ہے۔لہذا مصروف زمانہ صارفین کے ہاں نہ تو معاشی پہلو پیش نظر ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت یا شدت کو محسوس کرنے کی مہلت میسر آتی ہے۔یوں بھی غرض مند کو عقل نہیں ہوتی۔نہ وہ رقم کے اعداد وشمار کو پیش نظر رکھتے ہیں۔بلکہ کمال کمال مرعوبیت سے بل ادا کر کے مریض کی صحتیابی یا جان بچانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔

بیمہ کمپنیوں کے کاروبار کا لائحۂ عمل مذکورہ بالا اداروں کے نقش قدم پر رواں دواں ہوتا ہے۔یہ جان کے تحفظ یا خوف کے پس پردہ خون چوستی ہیں۔بلکہ اپنے صارفین کے عزیز و

اقارب کو ان کا خون کر دینے کا سامان بھی مہیا کر دیتی ہیں۔اسی طرح قسطوں پر اپنا سامان فروخت کرنے والے شوروم اور سوپر مارکیٹ جو فرنیچر آسائش و آرائش حیات کے لوازمات فراہم کرتے ہیں۔انہیں بھی صارفین کا خون چوسنے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔علاوہ ازیں غلہ اور اشیائے ضروریہ کی کالابازاری کرنے والے کاروباری بھی خون چوسنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں۔تعلیمی اداروں میں مختلف النوع خون کے ذائقے بیک وقت میسر ہوتے ہیں۔یہاں تذکیر و تانیث، چھوٹے بڑے، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سرکاری اعانت کے ساتھ طلبا کے سرپرست حضرات کا خون ہر سمت سے چوسنے کی روایت طویل مدت سے جاری ہے۔جس سے بھرپور مزہ کشید کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔تعلیم کی نشر و اشاعت ایک مقدس و پاکیزہ خدمت تصور کی جاتی ہے۔جہاں علم و دانش کے پس پردہ ہر قسم کا خون چوسنا منتظمین کا شیوۂ خاص ہے کہ

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی

سماجی خدمت، قوم سے ہمدردی اور فلاح و بہبود کے طفیل عزت و اکرام کے علاوہ سیاسی قیادت کے سنہرے مواقع بھی حاصل ہوتے ہیں۔

خون بھی قدرت نے اصیل شۓ تخلیق کی ہے۔جو پانی کی ملاوٹ سے محفوظ رہتا ہے۔لہٰذا دودھ کی طرح پانی ملا کر خون کا حجم بڑھایا نہیں جا سکتا۔نہ ہی اس کی مصنوعی پیداوار ممکن ہے ورنہ دودھ گھی پنیر اور چھانچھ مکھن اور ڈالڈا کی طرح خون کی صنعتیں قائم ہو چکیں ہوتیں۔شاید یہی سبب ہے کہ انسانی خون کی مانگ روز افزوں بڑھ رہی ہے مگر پینے اور چوسنے والے اس سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔بلکہ اس کی چند مزید توجیہات ملاحظہ فرمائیں۔

عام مشاہدہ ہے کہ موٹے (خوشحال) طبقے کا خون اکثر و بیشتر بدمزہ تلخ امراض و جراثیم

www.urduchannel.in

سے لبریز ہوتا ہے۔یا پھیکا اور تمام لذتوں سے عاری ہوتا ہوگا۔چونکہ اس قسم کا خون چوسنا بے سود تصور کیا جاتا ہے۔جس سے تضیع اوقات اور گناہ بے لذت کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔اس کے برعکس محنت کی بھٹی میں خون جلانے والے غریبوں، مزدوروں اور محنت کشوں کا خون سود اور سواد کے اعتبار سے بڑا مزیدار اور بڑی مانگ کا حامل ہے۔گاڑھی کمائی کا گاڑھا خون ہر طبقے کی اولین پسند ہے۔چونکہ گاڑھی کمائی کرنے والے کا خون رزق حلال کے باعث محفوظ اور شدید محنت کی وجہ سے جملہ امراض سے پاک sterlized ہو جاتا ہے۔موٹے حضرات موٹی موٹی جان لیوا بیماریوں اور پریشانیوں کے سبب مزید موٹے ہوتے جاتے ہیں۔جن کے قریب مچھر کھٹمل اور جونک تو کجا مکھیاں بھی پھٹکنا گوارا نہیں کرتیں۔عموماً موٹے حضرات خون چوسنے کے عمل کو جائز اور روا قرار دینے کے لئے خدمت خلق کا مقدس جامہ زیب تن کر کے سفید پوشی کا رعب و داب سادہ لوح عوام الناس پر ڈالتے پھرتے ہیں۔اس کے پس پردہ وہی گورکھ دھندہ شباب پر جاری ہوتا ہے۔

سیاست دانوں کا وصف خاص ہے کہ وہ اپنے خون کو بہر حال خون سمجھتے ہیں مگر عوام کے خون کو پانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔لہٰذا جب تک بغیر کشت و خون دوکان سیاست جاری رہتی ہے یہ بھی خاموشی سے فائدہ کشید کرتے رہتے ہیں۔مگر جوں ہی بساط سیاست پر اقتدار کے مہرے الٹے پڑنے لگتے ہیں۔ان کا خون جوش مارتا ہے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔تب یہ معصوم عوام پر شب خون مار کر انہیں فسادات اور بم دھماکوں کی زد میں خون آلود کر دینے سے بھی باز نہیں آتے۔

عہد قدیم میں شاہان و سلاطین اپنے جوانمرد سپاہیوں کو خون بہانے کے عوض تمغے انعامات اور جاگیروں سے نوازتے تھے۔بے گناہوں کے خون کا کفارہ بطور خون بہا ادا کرنے کا

کلیات شب انصاری
شب نور دیار

رواج تھا۔ دورحاضر کی اقدارجدید نے خون چوس کر تمغوں کے حصول کی دوڑ و رسہ کشی جاری ہے۔ اکثر سیاسی اجلاس میں خطاب کے دوران اہل سیاست سستا خون، مہنگا پانی کا نعرہ دے کر غیر محسوس طور پر اس بات کا اقرار کر لیتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر راقم التحریر کا خون بھی خشک ہوا جاتا ہے۔

جنگل کے وحشی درندے زیادہ خونخوار و خون آشام ہوتے ہیں یا مذکورہ بالا سفید پوش انسان جو انسانیت کے علمبردار ہیں اس کا فیصلہ قارئین کے سپرد کرتا ہوں۔

۱۶۔ مخبر

مخبر معاشرے کا اخلاقی مجرم سہی مگر محکمۂ پولس کا محرم ہوتا ہے۔ وہ جہاں سارے معاشرے سے دغا کرتا ہے۔ وہیں پولیس سے ہی وفا کرتا ہے بلکہ بسا اوقات پولس کا منظور نظر اور دست راست (چمچہ) بننے کی دعا بھی کرتا ہے۔ صرف اس طمع یا لالچ میں کہ پولس سے راست اپنی مطلب براری کی تکمیل ہو۔ یوں بھی مخبر ہونا کوئی منہ کا کھیل بھی نہیں کہ کوئی بھی ایرا غیرا خبر رسانی کا جوکھم سر پر اٹھا کر خود اپنی حماقت وحزیمت کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرے کہ آ بیل مجھے مار۔ عوام الناس کی خفیہ، حساس اور کان کھڑی کر دینے والی خبروں کی روز دارانہ ترسیل محکمۂ پولس تک کرنا گویا شیوۂ میر جعفر و میر صادق کا عادی ہونے کے لئے کم از کم ہمت اور دلیری کی ضرورت بہر حال ہوتی ہے۔

یہ ایک جرأت مندانہ مگر غیر آبرومندانہ شیوہ ہے۔ پھر ان تمام مشاغل کا ردعمل مثبت ہو یا منفی اس کا بھی تیقن نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ پولس حولدار قطعاً لا اعتبار کا کلیہ مشہور ہے۔ نہ جانے کب اور کن حالات میں مجرم باوجود تمام تلاش بسیار میسر نہ ہو تو اپنے حکام بالا کی خوشنودی کے لئے مخبر کو ہی بطور مجرم پیش کر کے اپنی ملازمت کی خیر منا لی یہ کہا نہیں جا سکتا۔ اگرچہ کوئی مبتدی مخبر پولس کے اعتماد پر یا انہیں اعتماد میں لے کر بھی مخبری کا عمل انجام دے تو یہ سراسر حماقت ہے کہ اعتبار وہ بھی پولس کی ذات پر؟ یہ تو من وعن ایسا ہی ہے کہ

ع جن پہ تکیہ کیا تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مخبروں کے کچھ مخصوص انداز اور پیدائشی بلکہ ازلی خواص ہوتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر پولس انہیں نہ صرف منہ لگاتی ہے بلکہ بہترین مراسم و تعلقات بھی بحال رکھتی ہے یا ناک کا بال بناتی ہے۔

www.urduchannel.in

ان میں ازلی طور پر وہ تمام خصائل سئیہ وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جنہیں ہم عیوب یا بلفظ دیگر بشری کمزوریاں کہہ کر ان سے دامن تہی میں عافیت جانتے ہیں بلکہ بعض اوقات چہارم کلمہ کا ورد کرکے تنہائی میں بھی کان کو ہاتھ لگا کر ان سے پناہ چاہتے ہیں۔ جیسے غیبت، چغلی، الزام و بہتان تراشی، مکروفریب، بے جا تجسس، پیٹ کا ہلکا ہونا، خفیہ پیغام رسانی، دغابازی وغیرہ۔ ان قبیح ترین خصائل کی زیادتی انہیں نہایت مذموم لتوں کا عادی بنا دیتی ہے۔ جیسے کینہ، حسد، بغض، عناد، انتقام اور بلیک میلنگ وغیرہ۔ ان علتوں کے علاوہ ان میں چند مزید اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں ان کے برتاؤ میں کتے کی صفات درآتی ہیں۔ جیسے ہمہ وقت کان کھڑے رکھنا، سونگھنے، سننے، محسوس کرنے، دم ہلانے اور وقت ضرورت اپنے ہم جنس سے باہم دست وگریباں ہونے اور اپنے ہی ہم جنس کے خلاف محکمۂ پولس میں بھونکنے اور معاشرے کو نقصان پہنچانے جیسی عادات بھی بقدر ضرورت ان کی ذات میں درآتی ہیں۔ انہیں اوصاف کی خاطر پہلے کتوں سے سراغ رسانی کے شعبے میں مدد لی جاتی تھی۔ مگر جب اشرف المخلوقات بھی وہی تمام فرائض بخوبی انجام دے وہ بھی رضا کارانہ طور پر تو محکمۂ پولس کے کیا کہنے کہ

مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

یہ مخبروں کا خیال خام ہے کہ پولس ان کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔ پولس کے معاون و مددگار بن کر وہ اپنا الو سیدھا کرسکتے ہیں یا پولس ان کے لئے برے وقتوں میں مراعات، ہمدردی یا رعایت کرسکتی ہے۔ پولس اس قانون کی پابند ہے جس کی آنکھوں پر پہلے ہی سے پٹی بندھی ہوتی ہے۔ پولس کے عاملین کے لئے بعض اوقات اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے تو ان کالی بھیڑوں کی دادرسی یا چارہ گری چہ معنی دارد؟ بلکہ وقت ضرورت پولس ان کالی بھیڑوں کو ہی نرم چارہ بنا کر اپنی بساط بچانے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔

www.urduchannel.in

مخبر بڑے نبض شناس اور ہوشیار ہوتے ہیں ادھر پتہ کھڑکا کہ بندہ سرکا کے مصداق سماج میں رہ کر سماج کی خیرخواہی کے پس پردہ سماج کی ہی بیخ کنی میں مصروف عمل رہتا ہے۔ ان تمام مساعی کا حاصل عمل محکمۂ پولس کی خوشنودی حاصل کرنا اور اپنے آپ کو معاشرے سے فروتر سمجھنا ہوتا ہے۔ مخبر اپنے فرائض میں اس قدر طاق نیز طبیعت کا ایسا گھاگ ہوتا ہے کہ ضمیر کی آواز کو اس خوش فہمی میں درگذر کر دیتا ہے کہ اس کے تمام اقدامات پولس کے ہاتھ مضبوط کرنے، وطن عزیز سے کی خدمت ووفاداری، نیز من وسکون کے قیام میں معاون ومددگار ہونے کی خاطر ہیں۔ بعض اوقات پولس کی ایما پر مخبر کسی معصوم و بے گناہ شخص کے مستقبل اور عزت ووقار سے بھی کھیلنے سے باز نہیں رہتا۔ جس سے ان کی پیشہ ورانہ سفاکی، بے رحمی اور بربریت اظہر من الشمس ہے۔

محکمۂ پولس کے شعبۂ خفیہ کی جملہ کارکردگیوں کا سارا بوجھ ان ہی بیچارے مفت کے ٹٹوؤں کے سر آن پڑی ہے۔ انہیں مخبروں کی فراہم کردہ سچی، جھوٹی، چھوٹی، بڑی، کچی، پکی خبروں پر درج بالا شعبے کا انحصار مکمل طور پر ہو چکا ہے۔ بلفظ دیگر اگر یہ کہا جائے کہ مخبر لنگڑے کی بیساکھی کا فریضہ مفت میں انجام دیتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دراصل محکمۂ پولس کا یہ عذر لنگ بھی ہے کہ اس نے ہر قسم کی زور آزمائی، جدوجہد کی، تمام وسائل کو بروئے کار بھی لاکر جدید آلات سے لیس سراغ رساں اور جاسوس معاشرے میں پھیلا دئے انگریزی فلموں کی نہج پر جاسوسی کے نت نئے تجربات اور ہتھکنڈے آزما کر دیکھ لئے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ لہذا پولس نے نفسیاتی پینترا استعمال کیا معاشرے میں موجود ایک دوسرے سے حسد، رقابت، بغض، عناد اور حرص وطمع نیز دشمنی اور انتقام کے جذبات کا استحصال اپنی مطلب براری اور مقصد یاوری کے لئے کیا۔ طمع وتشہیر کے بھوکی کالی بھیڑوں کو چارہ ڈال کر ان سے چارہ گری کروالی یہ اور بات ہے کہ وقت نکلنے کے بعد انہیں ہی چارہ بھی بنا دیا گیا۔

دراصل محکمۂ پولس کا سابقہ تجربہ بے ثمر ونا کام رہا۔ چونکہ کرسیوں پر نیم دراز براجمان بھار بھرکم تن و توش کے مالک پولس محکمے کے اہلکار اور افسر جن کی شکلوں سے ہی بے فکری، آسودگی اور خوشحالی ٹپکتی ہو وہ نہ تو سراغ رانی کے حساس شعبے کے نہ تو اہل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی موٹی عقلوں سے ایسے کام کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ انہیں صرف ضابطے کی کاروائی مکمل کرنے، پس پردہ زیر میز رشوت کے عوض رسمی کاغذات سیاہ کرنے، نیز ہر آج کا کام کل پر ٹال دینے، حیلے بہانے تراشنے اور تعزیرات ہند کی غیر معروف دفعات کے ان سنے حوالے دینے کے علاوہ تنخواہ ،ایڈوانس، فرق، بھتہ، اضافہ اور بونس والاؤنسز اور پے کمیشنوں کی لایعنی مباحث سے فرصت ملے تو سراغ رسانی کی نوبت آئے۔ تب تک خاطی نہ جانے کتنی وارداتیں سرانجام دے چکا ہوتا ہے۔ بمشکل تمام جو وقت بچ رہتا ہے وہ یا تو شکم سیری کی نذر ہو جاتا ہے تاش کے پتوں کی بازی میں سرف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا احساس اور اہم ذمہ داریوں کا متقاضی شعبۂ سراغ رسانی کا بارگراں چارو ناچار معاشرے کے نام نہاد میر جعفروں اور میر صادقوں کے شانوں پر آن پڑتا ہے۔ جو اپنی مذموم حرکات سے من مانی اور من چاہی سرگرمیوں سے معاشرے کا احاطہ تنگ کر دیتے ہیں۔
بقول شاعر مشرق

جعفر از بنگال، صادق از دکن　　　ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

ان مخبروں کو معاشرے میں عموماً خبری، ٹپر یا انفارمر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو اکثر مفت یا انتہائی معمولی معاوضے کے عوض اپنا ایمان فروخت کرتے ہیں اور پولس کی رہبری اور عوام کی رہزنی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ پولس کی ذرا سی نظر التفات انہیں خاطر خواہ حوصلہ فراہم کرتی ہے جیسے بیل گاڑی کے نیچے چلنے والا کتا تصور کرتا ہے گویا وہی تن تنہا بیل گاڑی کا بوجھ ڈھو رہا ہو۔ لہٰذا وہ معاشرے کے بھولے بھالے عوام کی ہر ظاہر و پوشیدہ خبر، ان کی حرکات و

www.urduchannel.in

سکنات کی تفصیل پولس کو اس خوش فہمی کے ساتھ گوش گذار کرتا ہے عوام اس کی ان قبیح حرکات سے یکسر لاعلم ہو۔ وہ بھی قانون کے مجرم کم اپنے دشمنوں کے زیادہ نام درج کروا کے اپنی انا کی تسکین کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ مردہ خوری کے فن میں طاق ہو جاتا ہے اور یہی خوش گمانی ایک دن اس اپنی غلط فہمی کا شاخسانہ بن جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے بلی دودھ پیتے وقت اپنی آنکھیں اس خیال سے موند لیتی ہیں کہ وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہو۔ پولس والے نہ تو کسی کے سگے ہوتے ہیں نہ قانون اور قواعد کی پابندیوں سے آزاد جو مخبروں کی من مانی پر بھی ان کی حمایت، پشت پناہی اور ہمنوائی کرتے رہیں۔ چونکہ اکثر و بیشتر مقدمات میں جن فرضی، یا ڈمی قسم کے گواہ درکار ہوتے ہیں تب یہی کرائے کے ٹٹو پر بیٹھ کر مسائل کا سمندر طے کیا جاتا ہے۔ پولس افسران بھی یوان حکومت اور افسران بالا کو جوابدہ ہوتے ہیں۔

بعض اوقات محکمۂ پولس کی شہ پر مخبر سے قانون سے متجاوز حرکات سرزد ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ اس خوش گمانی کے زیر اثر پھول کر کپا ہوا جاتا ہے کہ پولس کے ساتھ کی گئیں وفاداریاں اپنی محرم شاسیوں کا صلہ دے کر ان کی پشت پناہی اور گلو خلاصی کروا لیں گی۔ مگر عین وقت پر وہی پولس مخبروں کو ان کے کردہ و نا کردہ جرائم کا پردہ فاش کر کے انہیں فرضی تعزیرات ہند کے حوالوں سے حوالات کے حوالے کر کے خود اپنے سینے اور شانے پر تمغہ سجا لیتی ہے کہ عادی اور خطرناک مجرم کو زندہ و صحیح سلامت گرفتار کرنے پر نہ صرف ترقی بلکہ تنخواہ میں اضافہ اور دیگر سہولیات کے بھی مستحق قرار دئے گئے۔ اس وقت مخبروں کی حالت زار یوں ہو جاتی ہے گویا دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ بزرگوں نے بجا فرمایا ہے کہ پولس کی نہ تو دوستی اچھی نہ دشمنی ہی بھلی ہوتی ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　　نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

یوں بھی تاریخ شاہد ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ راون کی ناقابل تسخیر حکومت کو اگر کوئی سیندھ لگا

سکتا تھا تو وہ اسی کا بھائی (مخبر) وبھیشن ہی تھا۔ دورِ جدید کی معاشرے کی لنکا میں بھی باون گز کے وبھیشنوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ے ڈھونڈو ایک ہزار ملتے ہیں

جن میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ اور رسہ کشی جاری ہے۔ مخبروں کو پولس کی معاونت ونصرت کے بعد سرکاری داماد ہونے کا غرہ سا ہو جاتا ہے۔ انہیں یہ بھی خوش گمانی بلکہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ پولس ان کے ایک اشارے پر ان کی مدد کی خاطر یک لخت تیار ہو جائے گی۔ ان کے اشارات اور سفارشات کو بھی ملحوظ خاطر رکھے گی۔ لہذا اس برتے پر یہ کم ظرف سارے معاشرے میں کم آمیز، بھولے بھالے اور سادہ لوح عوام پر رعب داب جمانے سے بھی باز نہیں آتے۔ بہر حال محکمۂ پولس کی نظر میں مخبر سوائے استعمال کی شئے کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جسے وہ USE & THROUGH کی بنیاد پر استعمال کر کے کوڑے دان کی نذر کر دیتے ہیں۔ مخبر خدا کے دربار میں راندۂ درگاہ بھی ہوتا ہے اور اس کے مظلوم بندوں کے نقطۂ نگاہ میں ذلیل خوار و رسوا ہوتا ہے۔ لہذا جن افراد نے پولس کی ایما پر اس کام کی ابتدا کر دی ہو وہ ایک لمحے کے لئے بھی نوشتۂ دیوار پڑھ لیں۔ اب بھی فیصلہ پر نظر ثانی کر لیں۔ ان کے برعکس وہ جو اس لت کا شکار ہو گئے ہیں ان کا خدا حافظ۔

www.urduchannel.in

۱۷۔ سرپوشی

جسم کی پوشش بشری جبلت کے عین مطابق اور اشرف المخلوقات کی جامہ زیبی کا مظہر وشناخت ہے۔ اعلیٰ ذوق کے اعتبار سے زیب وزینت اختیار کرنا نا صرف معاشرتی ضرورت و اہمیت کی حامل ہے بلکہ معمول ومعقول کا حصہ بھی ہے۔ عہد قدیم میں گو سرپوشی مرد حضرات کی خوش پوشی، شان وشوکت، وضع داری اور شرافت کا عنوان ہوتی تھی۔ مگر فی زمانہ سرپوشی ضرورت سے زیادہ شناخت کی مجبوری بن چکی ہے۔ ہر تحریک کی اپنی علحدہ وجداگانہ ٹوپی اور اس کی طرز وادا ہے۔ ہر ضرورت خواہ وہ پیشہ ورانہ مسلک کی ہو یا مذہبی مسالک کی ٹوپی انسان کے افکار، عقائد اور رجحانات کی غماز اور نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں۔ ہر بدلتے دور کے تقاضوں نے سرپوشی کے شعبے میں جملہ اقسام کی اختراع وایجاد کی گنجائش بہم پہنچائی ہے۔ جس میں مختلف رنگ، تنوع، ہیئت، ساخت وحجم، قدر وقیمت کے مختلف تجربات نے انہیں نت نئی شناخت، معنویت، عرفیت اور حیثیت عطا کر دی ہے۔ جو کسی اور قسم کے لباس کو میسر نہیں۔

دورِ ماضی میں اگر تاج، کلاہ و پیاخ، کی مختلف اقسام نہ ہوتیں تو بادشاہ، شہزادوں، وزرائے دربار، حکما، خانساماں، اردلی، دربان کے علاوہ دیگر عہدیداروں میں تفریق وامتیاز کیسے ممکن ہوتا؟ اگر مختلف ساخت، رنگ، ہیئت اور طرز کے دستار عمامے اور سرپیچ (پگڑی) نہ ہوتے تو اولیا اللہ، مرید ومرشد، مجاور وقوال، سجادہ نشینوں اور عام متولیوں کا فرق کس طرح واضح ہوتا؟ اس طرح بہت سارے پیشہ ور حضرات، مذہب وملت ومسلک اور ان کی ذیلی وضمنی جماعتوں کے علمبردار اور عبادت گذار مذہبی قائدین اپنی شناخت کے لئے نہ جانے کیا کیا حربے بروئے کار لاتے؟ اگرچہ مختلف النوع پگڑیاں یا سرپیچ نہ ہوتیں تو سپہ سالار، عام سپاہی، صوبے دار،

ٹھاکروں، سکھوں اور شراب خانوں کے دربانوں کو کیونکر پہچانا جاتا؟ ان تمام اقسام سرپوشی سے فزوں تر اگر گول ٹوپیوں کی مختلف اقسام عالم وجود میں نہ آتیں تو سب عربوں کی طرح عمامے پہن کر گھومنا پڑتا۔ لہذا دور سے ان کی چال دیکھ کر یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا کہ موصوف زن است یا مرد است یا زبردست است؟ ایسی صورتحال میں ہم مذہبی و منصبی پیشہ وروں کی شناخت کیسے کر پاتے؟ لہذا اس شعبے میں کی گئی اختراع و ایجاد نے انسان کو خانہ بخانہ تقسیم در تقسیم کرنے میں بڑی مدد فراہم کی ہے۔ ہر طبقے نے اپنی پسند کے رنگ، ساخت اور ہیئت کو اپنا کر اپنی انفرادی شناخت از خود پیدا کر لی ہے کہ انہیں اس حوالے سے پہچانا جائے۔ جب بنی نوع انسانوں کے کرداروں میں پاک دامنی نہ بچے تو اپنی شناخت اور پہچان کے لئے ایسے ہی ہتھکنڈے کارآمد رہ جاتے ہیں۔

عہد قدیم کی بادشاہتیں، سلطنتیں، قلمرو اور راج پاٹ سارے لد گئے۔ نہ تخت و تاج رہے نہ ہی کلاہ و پیاخ، نہ ہی شہزادوں کی کج کلاہیاں۔ چنانچہ معاشرے کے اشراف نے ساری توجہ سر پیچ پر ہی مرکوز کر دی۔ البتہ پگڑی باندھنا بھی کوئی منہ کا کھیل نہیں ہے۔ پہلے پگڑی کی طوالت، پھر باندھنے کی مہارت، کسنے اور گھمانے کی ریاضت خاصی فرصت طلب اور پگڑی کے ہی پیچ و خم کی طرح پیچیدہ اور دشوار گذار عمل ہے۔ بہر حال فی زمانہ کی تیز رفتار حیات میں عملاً پگڑی باندھنے کا عمل ناممکنات جیسا ہے۔ نہ اب وہ پگڑی باندھنے کی وہ روایت اور ذوق سلیم رہا جو افراد کو پگڑی بدل بھائی بنانے کا محرک تھا۔ دلچسپ اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ پگڑی باندھنا جس قدر دشوار اور وقت طلب کام ہے اتنا ہی آسان اور فوراً کام ہے کسی کی پگڑیاں اچھال دینا۔ پگڑی کے ناپید ہونے کی یہ بھی ایک سنگین وجہ ہو سکتی ہے۔ رفتہ رفتہ زمینداری اور جاگیرداری بھی لد گئی۔ آج کسی زمانے کے جاگیرداروں کی حالت زار یہ رہ گئی ہے کہ ستر گز پگڑی اور سر ننگا۔ ضرب المثل مشہور رہے کہ ہارا جواری پگڑی رکھے۔ خواہ وہ بدقسمتی، بے غیرتی یا مجبوری کی شکل میں ہی کیوں نہ ممکن ہو۔ دور حاضر

www.urduchannel.in

کے ہارے ہوئے جواری اپنی پگڑی رکھنا تو درکنار دیگر حضرات کی پگڑی اڑا لے جانے سے بھی نہیں چوکتے۔ بقول میر تقی میرؔ

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ

سرپوشی جہاں اشراف کا شعار ہے وہیں غلاموں اور مساکین کی عزت رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ جو بے شک وشبہ تعظیم و تکریم کی علامت ہے۔ اس کی بدولت پہلے عوام الناس پر رعب داب اور دھونس جمانے کا ذریعہ بھی ہوتا تھا۔ لہذا عوام الناس بھی سرپوشی کے اعتبار سے اہل منصب و مراتب کو حسب منصب و مراتب ہر اقسام کے سلام پیش کئے جاتے ہیں۔ موصوف کے سرپوشی کی حیثیت کے مطابق آؤ بھگت، استقبال اور ضیافت و دعوت اور خاطر تواضع کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ مگر گنجے سروں کی سرپوشی نا صرف اشد ضروری بلکہ کثیر الجہتی اہمیت کی حامل بھی ہوتی ہے جیسے ایک تیر کئی شکار کے مترادف ثابت ہوتی ہے۔ اول تو دھوپ کی تپش سے حفاظت ہوتی ہے تاکہ تپش میدان صاف دیکھ کر خون کا درجہ حرارت نقطۂ اشتعال تک نہ پہنچا دے کہ موصوف کا پارہ چڑھ کر وہ خود ضابطۂ اخلاق سے متجاوز نہ ہونا پڑے۔ اس طرح سرپوشی غصے کو قابو میں رکھنے کی تدبیر بھی ہے۔ تیسرا فائدہ یوں بھی ہے کہ اگر موصوف کی بیضوی چندیا جو دستار سے بے نیاز ہو تو ارباب ذوق کی ہتھیلیاں ان پر چپت رسید کرنے کی جسارت بھی کر سکتی ہیں۔ اس طرح گنجے حضرات کے صاف وشفاف سر کے بلاوجہ عوام کے درمیان استہزا بننے کا خطرہ بھی ٹل جاتا ہے۔ یوں گنجے سروں کی سرپوشی نہ صرف انہیں دھوپ کی تمازت وشدت سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ تمسخر کی حزیمت سے بچنے کے لئے مرجع ثابت ہوتی ہیں۔

سرپوشی کے لئے سہل ترین، ارزاں و مقبول ذریعہ ٹوپی ہے۔ جو نہ صرف جیب کو راس آتی ہے بلکہ جیب میں بھی آ (اٹ) جاتی ہے۔ ٹوپی کی یوں تو بے پناہ افادیت ہے مگر ملی و

مذہبی نقطۂ نگاہ سے ٹوپی پہننے سے چہرہ پاکیزہ، نورانی اور معصوم اور قابل ترس نظر آتا ہے۔ خواہ وہ ٹوپی کے بغیر شاہد کچھ اور ہی نظر آتا ہو۔ ٹوپی پہننے سے احساس بندگی، عبادت و ریاضت میں درکار خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے۔ مگر ہمارا سماج ٹوپیاں گھمانے والے یعنی اس کی ٹوپی اس کے سر۔ اس کی ٹوپی اس کے سر اور اس کی ٹوپی اس کے سر کرنے والے شاطروں اور ٹوپی باز جعلسازیوں اے بھرا پڑا ہے۔ جو شب و روز مکر و فریب اور جذباتی بلیک میلنگ کا بازار گرم رکھتے ہیں۔

ٹوپی کی ہمہ رنگ ساخت، ہیئت اور استعمال نے مختلف ملک و قوم، مذہب و ملت، جماعت و مسالک، منہج و ذات برادری کی شناخت کا وہ شان دار جواز پیدا کر دیا ہے جو کسی اور طرز لباس کے ذریعے ممکن نہ تھا۔ اب ٹوپیوں کو دیکھتے ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں ہندو، مسلم، پارسی، سکھ اور انگریز، مہاجن و بوہرہ، گورکھا، مسلم اور یہودی ہے۔ اس سے قطع نظر ٹوپیوں کی بدولت مختلف پیشہ ور حضرات بھی شناخت کی تخصیص پاتے ہیں۔ مثلاً جج، داروغہ، ڈاکیہ، اردلی، چوکیدار، دربان، کھلاڑی اور پولس کانسٹیبل وغیرہ۔ خیر یہ تو عام تخصیص و شناخت کا معاملہ ہے۔ مگر امت مسلمہ جسے ایک حساس جسم سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی جملہ ذیلی و ضمنی برادریوں، مکاتب فکر اور طبقات کو بھی اپنی منفرد متعلقہ ٹوپیوں کی تخصیص کے حوالے سے ہی جانا پہچانا جاتا ہے۔ ٹوپی ایک وسیلہ بھی ہے کہ ہم اپنے اپنے مرحوم قائدین کو یاد رکھیں اور ان کے نام کو زندگی و پائندگی عطا کریں جیسے جناح کیپ، جوہر کیپ، گاندھی ٹوپی جسے نہرو یا لال بہادر شاستری کے نام موسوم کرنا چاہئے تھا۔ چونکہ مہاتما گاندھی کی ایک بھی تصویر گاندھی جی کو اس ٹوپی کا حامل نہیں دکھاتی۔

ٹوپی اشتہار بازی اور جماعت بندی دونوں کی یکساں ترجمانی کرتی ہے۔ ٹوپی کے سامنے نچلے سرے پر چھوٹا سا سائبان نصب کر کے اسے کھلاڑیوں، مہم جوؤں، راہگیروں اور

www.urduchannel.in

مسافروں کو فیض پہنچانا بھی ایک اختراعی عمل ہے۔ مگر اس کی پیشانیوں پر مختلف کمپنیوں کی علامات شائع کروا کر مختلف رنگوں اور ساختوں کے حوالے سے اشتہار بازی کا وسیلہ بنانا ایک تجارتی حکمت عملی ہے۔ بالخصوص انتخابات کے ایام میں ان ٹوپیوں کی پیشانی پر انتخابی علامات اور نعروں کے اشتہار سے انہیں مفت عوام الناس میں تقسیم کرنا بھی کسی سیاسی جماعت کی سیاسی تدبیر ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ جسے آج بغرض فیشن و ضرورت بڑی کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ سر پوشی نہ انسانوں کی تقسیم کا باعث ہے اور نہ ذریعہ معاش کی بنیاد پر، اور نہ طبقاتی درجہ بندی و تقسیم کی قائل ہے۔ ٹوپیاں محض ہمارے اپنے خیالات، احساسات اور جذبات اور ضروریات کی تکمیل و ترجمانی کرتی ہیں۔

نمک پاشیاں

www.urduchannel.in

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	۵
۲	ساس شناسی	۸
۳	گر تری جیت میری ہار میں ہے	۱۲
۴	آزادیٔ نسواں	۱۷
۵	جاں	۲۰
۶	بال	۲۴
۷	بابوگیری	۲۹
۸	جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست	۳۴
۹	کتے	۳۹
۱۰	محبوب آپ کے قدموں میں ۔۔۔۔	۴۴
۱۱	محنت کرے مرغا	۴۹
۱۲	جماہیاں	۵۳
۱۳	ناک بڑی حیرت ناک	۵۶
۱۴	پن کا رنگیلا پن	۶۱
۱۵	پاؤں	۶۴
۱۶	آخر زباں تو رکھتے ہو	۷۱
۱۷	شرم ہم کو مگر ۔۔۔۔۔۔	۷۵
۱۸	آستین	۸۱
۱۹	غم سے نجات پائے کیوں	۸۵
۲۰	کوائفِ مصنف	۹۰

www.urduchannel.in

پیش لفظ

اپنے معبود حقیقی کی بارگاہ میں سجدۂ تشکر و امتنان ادا کرتا ہوں کہ ناچیز کی اولین ادنی تصنیف **ہوئے جی کے ہم جو رسوا** کو رسوائی سے محفوظ و مامون کر کے اسے معقول پذیرائی عطا کی اور احقر کی آبرو رکھ لی۔ جسے نہ صرف جملہ قارئین، اہل نقد و نظر نے سراہا بلکہ ہر دو ممتاز ادبی ادارے **مہاراشٹر اسٹیٹ ساہتیہ ایکاڈیمی ممبئی** کی جانب سے سال ۱۳۔ ۲۰۱۲ کا دس ہزار روپیوں کا انعام بمقام ممبئی تفویض کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ **قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی** نے سال ۱۳۔ ۲۰۱۲ تھوک کتب خریداری اسکیم کے تحت مذکورہ بالا کتاب کی دو سو کاپیاں مکمل قیمت میں خرید کر اعزاز بخشا ہے۔ میں تہہ دل سے تمام قارئین اور ہر دو اداروں کے جملہ صدور و اراکین کا ممنون ہوں۔ جن کی ہمت افزائی نے مجھ ناچیز کو بال و پر عطا کئے۔

ارباب حل و عقد اور اصحاب نقد و نظر نے ناچیز کی اولین ادنی تصنیف **ہوئے جی کے ہم جو رسوا** کو جس خلوص و محبت سے ہمکنار کیا ہے اس کی ضمن میں سراپا سپاس و ممنونیت ہوں۔ اس پذیرائی سے تخلیقی جذبے کو مہمیز ملی اور اشہب قلم کی رفتار مزید تیز ہوئی۔ فقط ایک سال کی قلیل مدت میں ہی دوسری تخلیق بعنوان **نمک پاشیاں** پیش کرنے میں غایت درجہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔ تصنیف کا مواد صرف دو اصناف سخن انشائیہ اور طنز و مزاح کے مضامین سے تعلق رکھتا ہے۔ احقر نے اپنے تحقیقی مقالے میں چند اہم امور کی طرف اشارہ کیا تھا جن کا ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

ہنسنا ہنسانا، ظرافت اور مزاح انسانی فطرت کا خاصہ ہے جو زندگی کی علامت ہے۔ ظرافت دراصل غم، الم، اندوہ، مایوسی اور قنوطیت جو موت کا علامیہ ہیں ان کی ضد ہے۔ لہٰذا ادیب کے پند و نصائح کی چابک سے معاشرتی اصلاح کا وہ کام موثر انداز میں نہیں لیا جا سکتا، جو طنز و مزاح نگار کی لطیف چٹکی اور ظرافت نگاری کی گدگدی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں طنز و مزاح

کی آفاقیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مزاح نگار اپنے اطراف واکناف اور معمول کے حالات اور واقعات کو اپنے منفرد تناظر اور مخصوص زاویہ نگاہ میں پیش کر کے قارئین کو حظ ومزاح فراہم کرتا ہے۔ بعض اوقات قاری کو عام مشاہدہ اور عین سامنے کی اشیاء بھی متوجہ نہیں کر پاتیں۔ اس کے برعکس مزاح نگار اپنے حساس مزاج، بذلہ سنجی اور تیز نگاہوں سے لاشعور کی ان پرتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ جن کا وجود تو لا شعور میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے، لیکن ان جذبات کو قوت گویائی ابھی عطا نہیں ہوئی تھی۔ مزاح نگار انہیں پوری شدت سے خصوصی اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ مزاح نگار کی انشاء پردازی، شگفتہ بیانی اور اسلوب کی چاشنی اسکی مزاحیہ تحریر کا لطف دو چند کر دیتی ہے۔ مزاح نگار کے ہاں عامیانہ موضوعات کا پر مزاح اظہار قائین کو لطف اندوز کرتا ہے۔

مزاح نگاری میں اپنے مخاطب کی کردارکشی، دلآزاری، تذلیل، توہین، ہجوگوئی، دشنام گوئی اور یاوہ گوئی کے عناصر سے فنی طور پر قابل گرفت عیوب پیدا ہوتے ہیں اور طنز ومزاح کا معیار سطحی، پست اور بھدا معلوم ہوتا ہے۔ لہذا ان علتوں سے پرہیز کرتے ہوئے ایک شائستہ وشگفتہ ادب کا معیار قائم کرنا ہوتا ہے۔ جس کا مقصد قاری کی تفریح طبع اور مضمون میں مضمر و پنہاں اصلاح کے درس کی ترسیل ہوتا ہے جیسے شکر پوش کڑوی گولیاں۔ جس سے عام قارئین کو اشارے، کنائے اور رموز سے سربستہ اسرار کو فنی طور پر افشا کرنا ہوتا ہے تاکہ کسی کی عزت وناموس پر حرف نہ آئے اور بڑی سے بڑی بات بھی فنکارانہ مہارت سے کہہ دی جائے۔ مزاحیہ تحریر میں حسد ورقابت، ذاتی رنجش اور باہمی چشمک کا شائبہ تک نہ ہو۔ البتہ لطیف طنز اور گوارا قسم کی چٹکیاں لینا روا ہوتا ہے تاکہ انتقام کا جذبہ یا درج بالا صفات ہرگز غالب نہ ہو۔

طنز ومزاح کی آفاقیت سے متعلق شہرہ آفاق نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کا قول خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ طنز ومزاح کا سرمایہ نہ صرف کسی زبان کی نشو نما وارتقا کیلئے بنیاد کی حیثیت رکھتا

www.urduchannel.in

ہے بلکہ اہل زباں کے تدریجی ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ مزید آگے وہ فرماتے ہیں کہ مزاح انسانی فطرت کی اہم خصوصیات میں شامل ہے۔

زیر نظر کتاب میں درج بالا تمام تر معیار وکسوٹیوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کی نیز مذکورہ عیوب سے اجتناب کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں احقر کس قدر کامیاب ہوا ہے اس کا فیصلہ میں ارباب میزان، اہل نقد ونظر اور جملہ قارئین کو سونپتا ہوں۔ امید ہے کہ انسانی اعضاء کی منفرد ومزاحیہ پیشکش، روزمرہ کے عام مشاہدات، احساسات، تجربات اور رجحانات کی پرمزاح عکاسی قارئین کو حظ وفرحت فراہم کرے گی۔

کامیابی کسی واحد عامل کی سزاوار نہیں ہوتی بلکہ ہمہ جہت عوامل کا مرکب ہوتی ہے۔ میں اپنے قارئین، خیرخواہوں اور تنقیدنگاروں کا ممنون ہوں جن کے گرانقدر مشورے، پذیرائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کیلئے آمادہ کیا۔ میں مقامی تمام انجمنوں کے صدور واراکین کا بھی ممنون وسپاس گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تخلیقات پیش کرنے کی اجازت دی اور اس پر مجھے اپنی آراء سے مستفید کیا۔ اسی طرح ان تمام اخبارات ورسائل کے مدیران کا بھی ممنون ہوں۔ جن کی بروقت اشاعت کے سبب احقر کی تخلیقات کو عوامی ترسیل نصیب ہوئی۔

اخیر میں اس کتاب کی ترتیب وتدوین، کتابت وطباعت نشر واشاعت اور پیشکش کے سلسلے میں اپنے بھانجے اور اردو ادب اطفال کے ابھرتے ادیب ابو اسامہ (ابن آدم) ہارون الرشید ماسٹر کا میں بصمیم قلب ممنون ہوں جن کی کمپوزنگ اور نادر مشوروں کے سبب زیر نظر کتاب کی تکمیل ہو سکی۔

احقر

شہزاد بخت انصاری (شب انصاری)

۲۳۸، نیو وارڈ، مالیگاوں ضلع ناسک مہاراشٹر

۱۸۔ساس شناسی

ساس اور داماد میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ دونوں الفاظ کو دائیں یا بائیں سے پڑھا جائے تو وہی تلفظ برآمد ہوتے ہیں۔ جبکہ بہوئیں اس خواص سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ اردو ادب کی سخاوت، فصاحت اور بلاغت پر قربان جائیے۔ جس نے ساس (جیسے خطرناک رشتے) کو خوش دامن کی خوش وضع اصطلاح سے نوازا ہے۔ غالباً ساسیں اس خوب صورت اصطلاح کے مفہوم سے ہی یکسر ناواقف ہیں اور اگرچہ واقف بھی ہوں تو وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہیں۔ کاش دنیا کی تمام ساسیں اس اصطلاح کے شایان شان عمل کرتیں تو ہمارے معاشرے کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ دنیا جنت نشاں ہو جاتی اور نصف سے زائد مسائل پیدا ہونے سے قبل خود بخود حل ہو جاتے، زوجین کے درمیاں تنازعے کی بنیادی وجہ ہی ختم ہو جاتی۔ وہ تو خدا کی قدرت خدا ہی جانتا ہے۔ اس کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ خیر سے جنت کی ستر حوروں کی مائیں نہیں ہوں گی ورنہ کیا بعید کہ ستر عدد ساسیں مل کر جنت کو بھی نظارہ دوزخ بنا دیتیں۔

مگر افسوس صورت حال یکسر برعکس ہے۔ ساسیں بجائے خوش دامن ہونے کہ عملاً تنگ دامن، تنگ نظر اور تنگ کرنے والیاں واقع ہوئیں ہیں۔ ساسوں کی ایماء پر ہی کتنی معصوم بہوؤں کو نذر آتش کیا جاتا رہا ہے اور کتنے ہی داماد یوسف بے کارواں بن کر تجرد کے صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ لہذا ساس کا نام سنتے ہی ناک بھوں چڑھانا یا تیوری پر بل پڑ جانا فطری عمل ہے۔ جہاں تک بہوؤں کا سوال ہے۔ ان کا اور ساس کا محور توجہ بھی ایک ہی شخص ہوتا ہے مگر ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر ان کے خیالات، جذبہء خیر خواہی اور زاویہء نظر میں قطبین کا فرق ہوتا ہے۔ چونکہ ساس کے اپنے بچے تو خیر سگے ہوتے ہیں مگر ان کے شریک حیات وہ خواہ

www.urduchannel.in

شوہر ہوں یا بہو وہ تو دوسروں کی اولاد ہی ہوتے ہیں۔ جو ان کو بطور اولاد نسبتی کی شکل میں نعمت غیر مترقبہ کی طرح ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ لہذا ان سے ناروا سلوک کرنا ساس محترمہ کا قدیم شیوہ رہا ہے۔ جو رفتہ رفتہ ان کی عادت خصلت اور سرشت کا حصہ بن گیا ہے۔ لیکن فی زمانہ جن مظلوموں کا سابقہ ظالم ساسوں سے ہے وہ کیا کریں۔ بقول فیض

دست فلک میں گردش تقدیر تو نہیں　　　دست فلک میں گردش ایام ہی تو ہے

عملی تجربہ یہ کہتا ہے کہ قدرت نے ساس کا رشتہ ہی ایسا بنایا ہے جو خالصتاً سگا ہوتے ہوئے بھی سوتیلا ہی معلوم ہوتا ہے یا قرار واقعی ہوتا ہے۔ ساس کے نام کے تذکرے سے ہی منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ فلموں، کہانیوں، افسانوں اور دیگر اصناف سخن میں بھی ساس کا کردار اکثر ناپسندیدہ اور منفی روایتی ساس کا ہی ظاہر کیا جاتا ہے جو برسہا برس کے تجربات کا لب لباب ہوتا ہے۔ ساسیں یہ مطلق بھول جاتی ہیں کہ وہ یعنی ساس بھی کبھی بہو تھی۔ وہ روایتی ساس بن کر اپنی بہو سے ان مظالم کا انتقام بھی تفریحاً لے لیتی ہیں جو اس پر ڈھائے بھی نہیں گئے تھے۔ اس جذبے کی یاد دہانی (مقصد خواہ سد باب کرنا ہی ہو) کی خاطر ٹی وی پر ڈرامہ ساس بھی کبھی بہو تھی نشر کیا جا رہا ہے۔ ساسیں بھی آخر صنف نازک ٹھہریں جو ازلی طور پر ناقص العقل ہیں۔ لہذا ساسوں نے اس سے عبرت لینے کی بجائے اسے تفریح طبع کا ذریعہ سمجھا۔ اس ڈرامے سے نئے نئے حربے اور فن سیاست کے گر سیکھے جن سے پہلے ان کی واقفیت نہ تھی اور انہیں حسب موقعہ و ضرورت آزماتی بھی رہتی ہیں۔ ہماری ساس دنیا کی ساسوں سے قطعی مختلف نہیں بلکہ ہماری دانست میں ان تمام سے دو چار جوتا آگے ہی ہوں گی۔ جن کی شان جلیلہ میں ہم اپنے ہی ایک قطعہ سے بصد جسارت ان کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

اپنی بیوی کی امی کو ساس کہتے ہیں　　　ہم احتراماً سراپا سپاس کہتے ہیں

لال تیور ہیں سرخ ٹماٹر کی طرح　　پیار سے ان کو ٹو میٹو ساس کہتے ہیں

ساسیں اکثر ایسی غلطیاں کرتی ہیں جو قابل گرفت ہوتی ہیں۔ اپنے رویئے میں موزونیت اور عتدال کی کمی کی وجہ سے اکثر انہیں ہزیمت اٹھانا پڑ جاتی ہے۔ لہذا جو محبت مروت، مراعات اور ہمدردی اپنی بیٹی کے لئے ہوتی ہے۔ وہ اس سے اپنی ہی بہو کو محروم رکھتی ہے۔ اسی طرح بظاہر جو عزت و احترام اپنے داماد کا کرتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ اپنی بیٹی کے کان میں پھونک رہی ہوتی ہیں۔ لہذا اس کانا پھوسی کے سبب بیوی کا دماغ ساتویں آسمان پا پہنچ جاتا ہے۔ ان ریشہ دوانیوں کا انجام فریقین کے مابین خانہ جنگی اور تنازعہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے فریقین کے دلوں میں صرف نفاق پنپتا ہے۔ داماد کے مقابل میں ان کا کارآمد ہتھیار ان کی فرماں بردار دختر نیک اختر ہوتی ہے تو بہو کے مقابلے کے لئے وہ اپنے فرماں بردار فرزند ارجمند کو نت نئی آمائش میں مبتلا کرنے سے بھی باز نہیں آتیں۔

اگر فی زمانہ ساسوں کو اپنے رشتہ میں اعتبار حاصل کرنا ہو تو ہم ایک نیک اور مفت مشورہ ضرور دینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں مال مفت دل بے رحم کا بھی ادراک ہے اور اس بات کا بھی علم ہے کہ ساسیں با آسانی اپنے روایتی سلوک سے باز بھی نہیں آجائیں گی۔ پھر بھی عرض ہے کہ وہ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کی خوشیاں اور اپنی ذات اور وقار کو عزت بخشنا چاہتی ہیں تو ان کی نجی (ازدواجی) زندگی میں بلا ضرورت ٹانگ اڑانے سے پرہیز کریں۔ جب تک فریقین از خود رجوع نہ ہوں۔ انہیں اپنے نیک صلاح و مشورے اور احکامات کی سوغات نہ دیں۔ اکثر ساسوں کے نیک صلاح و مشورے آتش گیر مادوں مثلاً پھلجڑی، پٹاخے تو پرانی بات ہوئی، اب تو ان سے سوا بم اور میزائل کی تاثیر رکھتے ہیں۔ جن کی وجہ سے فریقین کو ہی باہم آتش بازی سے برسر پیکار ہونا پڑتا ہے۔ لہذا ساسیں اگر بے جا مداخلت سے باز آجائیں تو اس سے ان کی وقعت اور عزت میں خود بخود اضافہ ہوگا۔ اور وہ نسبتی والدہ سے حقیقی والدہ کا احترام و مقام حاصل کر سکیں گی۔

www.urduchannel.in

۱۹۔ گرتری جیت مری ہار میں ہے

مزاح نگار بھی اپنی فطرت اور طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ جب طنز و مزاح کے موضوعات ذہن میں ہجوم پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ دل مچلتا ہے کہ مذکورہ خیالات کو ورق پر قے کر دے تو عادتاً رگ ظرافت بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اظہار خیالات کے لئے کس کو تختۂ ہدف بنایا جائے؟ تو اس بیچارے کی نظر انتخاب بھی اپنی بیوی اور انکے متعلقہ رشتے داروں پر پڑتی ہے جو چوبیسوں گھنٹے مزاح نگار کے حواس پر سوار اور مسلط ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے اسکی شامت ہی منتظر ہوتی ہے۔ گویا گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے جو اسے بیوی یا سسرالیوں کا بے ساختہ خیال آجاتا ہے۔ وہ ذوق طبع آزمائی کی رو میں ادب تو تخلیق کر لیتا ہے۔ عارضی طور خود تو خوش بھی ہو جاتا اور اپنے آپ کو داد بھی دے لیتا ہے مگر بیوی کے ادب و لحاظ سے اکثر ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جس کا ردعمل کبھی کبھار بڑا تلخ و ترش ہوتا ہے۔

بقول بیگم ہماری مزاح نگاری اور ظرافت کی دوکان انہیں کے دم قدم سے آباد ہے۔ یعنی ہماری مزاح نگاری اور ظرافت کے دو (۲) کان ہیں ایک کان تو خود بیگم کی ذات پر صفات ہے جسے وہ ہمہ وقت ہماری شان میں کھاتی رہتی ہیں۔ جبکہ دوسرا کان انکے میکے کی ٹیم ہے جو اتفاقاً ہمارے بھی سسرالی سہی مگر رشتے دار ضرور ہیں۔ یہ دعوی اگرچہ ہماری جملہ صفات اور خصوصیات کیلئے زبردست چیلنج تھا۔ اگر کسی اور نے یہ دعوی کیا ہوتا تو ہم اس بات کے تصفیے کی خاطر دو۔ دو ہاتھ بھی کر لیتے مگر یہاں معاملہ ہماری نصف بہتر کا تھا۔ لہذا چھٹی حس نے ہوش کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا، اس لئے مسکرا کر خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ یوں بھی ماضی کے چند تلخ تجربات نے جذبات کے طوفان کو سرد کر دیا۔ ہماری خاموشی کا فائدہ اٹھا کر بیگم نے دوسرا نادر

شاہی فرمان جاری کرنے میں تاخیر نہ کی کہ ہماری اولین کتاب (**ہوئے جی کے ہم جو رسوا**) پر جو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی کے ایوارڈ اور اس سے وابستہ رقم (دس ہزار روپئے) کے علاوہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذریعئے خریدی گئی ہماری تصنیف کی دوسو کاپیوں کی قیمت (نو ہزار روپئے) میں بھی ان کو نصف شراکت دی جائے ۔اب معاملہ برداشت کی حد سے تجاوز کر گیا تو ہم نے بھی سوال داغ دیا کہ آپ کا اس میں عملی تعاون کیا ہے؟ اتنا سننا تھا کہ بیگم ہتھے سے اکھڑ گئیں اور کروفر سے ہمیں پر برسیں کہ ہم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے جو تصویریں شائع کرواتے، اتراتے پھرتے ہیں اور منہ میاں مٹھو بنتے ہیں؟

بیگم کی دانست میں ہم جو بھی ترقی کرتے ہیں ۔وہ ان کی ذات کی یا ان کے اہل خانہ کی صفات کی رہین منت ہوتی ہے گویا اہل سسرال ہی ہماری ترقی کا زینہ ہیں جس کا وہ بار بار اعادہ بھی کرتی رہتی ہیں کہ ہماری ہر ترقی کے زینے پر ہمارے سسرال کی خصوصیات کا احسان عظیم ہے ۔انہیں کے بل پر ہماری مزاح نگاری کی بلند و بالا عمارت (لیکن سہی لفظ ہوگا عبارت) تیار ہوتی ہے ۔اس سوال پر تو ہماری غیرت اور انا کا مسئلہ ہی کھڑا ہو جاتا مگر ہمیں پر تاسف انداز میں اپنی صلاحیتوں کا ڈھنڈورہ پیٹنا پڑا کہ ہمارے احساسات، جذباتِ، نظریات، مشاہدات، تجربات اور تجزیات اور جمالیاتی حس کو یوں نظرانداز نہ کیا جائے ۔نہ انہیں قدموں تلے روندا جائے تو بڑے عالمانہ انداز میں گویا ہوئیں کہ ہماری تخلیقات خواہ مزاحیہ مضامیں ہوں یا انشائیے ان میں مرکزی خیال، مرکزی کردار، مرکزی مواد، مرکزی مکالمے بھی ان کے یا پھر ان کے میکے والوں پر مرکوز ہوتے ہیں ۔ہم ان کی حرکات وسکنات کی پرمزاح عکاسی کر لیتے ہیں ۔غالباً ان کی مراد یہ تھی کہ ہمارے مضامیں ان کے خاندان کی سوانح نگاری اور ہمارے لئے جگ بیتی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔لہذا ان تخلیقات کے جملہ حقوق بھی بصد عز از وشرافت انہیں ہی سونپ دئے جائیں ۔ہمیں ان کی یہ بے تکی قسم کی میکانیکی تقسیم ہر گز راس نہ آئی ۔مگر اب ہمارے لئے تو شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا ۔لیکن انکار کی صورت میں ہمیں انکی آنکھوں میں ڈوبنے سے بھی محروم ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا چونکہ پارہ اب عروج کی طرف گامزن تھا ۔ہماری حالت زار بقول علامہ اکبر الہ آبادی کچھ یوں ہو گئی کہ

دل وہ ہے کہ فریاد سے لبریز ہے ہر وقت　　　ہم وہ ہیں کہ کچھ منہ سے نکلنے نہیں دیتے

بیگم کا مطالبہ اگر چہ جائز ہے کہ شریک حیات ہونے کی حیثیت سے وہ بلاشبہ انعام کی حقدار اور کتاب کے جملہ حقوق کی سزاوار ہی نہیں بلکہ بلاشرکت غیرے انعام وکتاب کی مالک و مجاز ہوتیں مگر ہماری صلاحیتوں کی عدم پزیرائی و پامالی کے عوض ہر گز نہیں ۔خیر یوں اچھا ہوا انہو ل نے کتاب کے عنوان میں حصہ داری پر یا کتاب پر بطور مصنف نام لکھوانے میں شراکت یا انتساب کے لئے ان کے رشتے داروں کی حسب مراتب فہرست شائع کرنے پر اصرار نہ کیا ۔لیکن جہاں تک ہماری پذیرائی کا تعلق تھا وہ بھی اپنے نظریئے سے ٹلنے پر راضی نہ ہوئیں ۔آخر وہ بھی ضد کی پکی ٹھہریں ۔اپنا موقف تبدیل کرنا ہتک کے مترادف تھا ۔لہذا بیگم صاحبہ بھی عادت کے مطابق پیر پٹخنے لگیں ۔خدا کا خوف کریں یہ گھر نہ ہوا آکاش وانی ریڈیو اسٹیشن ہو گیا ہے ۔ یہاں تو منہ کھولنا بھی گنہگاری ہے ۔کوئی بات حلق سے نکلی نہیں کہ فلک کو پہنچی ۔ہم دن بھر خاموشی سے ان کی باتیں، شکایتیں اور صلواتیں سنتے رہتے ہیں ۔رات کی تاریکی میں انہیں شامل مضمون کر دیتے ہیں ۔ پتہ نہیں لوگوں کو بھی کیا گھر آنگن کے قصوں اور کھٹے گرانوں میں مزہ آتا ہوگا ۔ٹی وی پر اسٹار پلس اور دیگر فیملی ڈراموں کے چینلز کیا کم پڑ جاتے ہیں جو ہماری فضولیات بھی پڑھتے رہتے ہیں ۔بیگم کی باتیں اگر چہ صحیح تھیں مگر کہنے کا انداز مزید جارحانہ اور طیش آور تھا بقول مومن

ے کہتے تو ہیں بھلے کی لیکن بری طرح ۔

www.urduchannel.in

جس سے کوفت ہو رہی تھی گویا کوئی آئینہ دکھا رہا ہو۔ ہم نے ان کے مطالبے کو منظور کر لینے میں ہی عافیت جانی یوں بھی گھی کہاں گرا کھچڑی میں۔ آخر ہمیں ہی گھٹنے ٹیک کر تسلیم خم کرنا پڑا اور نصف حصہ کی بجائے چوتھائی حصے کی تقسیم پر موصوفہ کو راضی کر لیا۔ لیکن ابھی ان کی سرزنش اور تصحیح کا فریضہ باقی تھا۔ پھر بھی ہم نے لہجے کی ملائمت قائم رکھتے ہوئے بیگم کی دلجوئی کی خاطر عرض کیا کہ ادباء و شعراء اپنے خون جگر سے ادب تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کرنا اعلیٰ ظرفی کی علامت ہے۔ نامور شاعر فنا کانپوری نے کیا خوب کہا ہے۔

سخنوری سے تو دل باغ باغ ہوتا ہے　　ادیب قوم و وطن کا دماغ ہوتا ہے
جیتے جی کبھی قدر نہ ہوئی شاعر کی　　فنا کے بعد یہ روشن چراغ ہوتا ہے

انہیں کچھ سمجھایا نہیں البتہ آخری مصرعے نے خوب متاثر کیا۔ بیگم بڑے ناز و ادا سے ہاتھ نچا کے گویا ہوئیں کہ ہونہہ! یہ تو پتہ ہے کہ چراغ سے روشنی ہوتی ہے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ چراغ سے جن برآمد ہونے کی قصے کبھی بچپن میں سنے تھے۔ یہ بھی سنا ہے کہ چراغ بجھنے سے پہلے ضرور پھڑ پھڑاتا ہے اور مشہور بھی ہے کہ چراغ تلے اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ مگر ایسے چراغ کا کیا فائدہ جو فنا کے بعد روشن ہو۔ موت کے بعد کس نے کیا دیکھا ہے جو آپ منتظر ہیں؟۔ یہاں تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایسا چراغ آپ کو ہی مبارک ہو۔ بیگم کی اس تاویل پر ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بقول نادر اسلوبی

ہم خود کو بھی اظہار کے قابل نہیں پاتے　　غم ہیں بھی تو اندر کے ہیں باہر کے نہیں ہیں

ہم نے دل ناتواں کو سمجھا لیا کہ ہر خاص و عام آدمی کی یہی مجبوری ہے کہ وہ بیرون خانہ ہر محاذ پر بھلے ہی کامیاب و شاد کام رہے۔ نہ جانے کیوں وہ محاذ اندرون خانہ پر ہی کیوں بخوشی پسپائی قبول کر لیتا ہے؟ یا اسے مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ یہ اندر کی بات ہے۔

جان و دل سے میں ہارتا ہی رہوں　　گر تری جیت مری ہار میں ہے۔

www.urduchannel.in

۲۰۔ آزادیٔ نسواں

صنفِ نازک کو شوق چرّایا کہ مرد ناداں سے اپنی ازلی زبردستی، غلامی، ظلم و استبداد اور استحصال کا انتقام لے۔ مرد کی بالادستی کو قدموں تلے روند کر اسے اپنی ناز و ادا کا غلام بنا لے۔ جستجو نے آتش شوق بھڑکائی، شوق جنوں خیز ہوا اور شدّت و حدّتِ جذبات میں اضافہ ہوا کہ مرد کے زورِ بازو کو سازش کی نقب زنی سے کمزور و ناتواں کر دے۔ اسے اپنے غمزے اور عشوے اور ناز و ادا پر تو کامل اعتماد تھا مگر موئی بوڑھی مشرقیت اس کی راہ میں حائل تھی۔ اب کون سا نسخۂ کیمیاء کارگر ہو جو بوڑھی مشرقیت کو راہ سے ہٹایا جائے۔ لہٰذا اس کے پابند سلاسل کو ختم کرنے کے لیے مغربیت کے درِ نیاز پر دستک دی۔ کشکول دراز کیا۔ مغربیت نے فرطِ سخاوت سے اپنا آزمودہ و محرب نسخہ اہل مشرق کی صنف نازک کی نذر کیا۔ تحریکِ آزادیٔ نسواں یعنی خواتین کی بالادستی۔ خواتین کی حکومت اور مردوں پر مستقل حبس دوام کی سزا۔ ایک مکمل سازش جو خواتین کو ہر میدانِ عمل میں آزادی اور مردوں کی محکومی و غلامی کے عوض تھی۔

صنفِ نازک ازلی طور پر کج فہم و کج ادا ٹھہری۔ اس نے اس تحریک کو متاعِ گم گشتہ جان کر سینے سے لگایا۔ اس کی شیدائی و مدّاح بن گئی۔ حتیٰ کہ اسے راہ نجات اور ہتھیار سمجھ بیٹھی۔ مرد نے بھی اس خوبصورت دامِ فریب کو ترقی کا ضامن جانا۔ ہوش کے ناخن نہ لئے اور تحریکِ آزادیٔ نسواں کے سرابِ صحرا اور معکوس ترقی کا اسیر ہو گیا اور آخر کار بقول حافظؔ ناگپوری اس حالتِ زار کو جا پہنچا۔

کھیلنے جاتی ہے ٹینس، لیلیٰ　　گیند دیتا ہے اُٹھا کر مجنوں

تحریکِ آزادیٔ نسواں نے خواتین کو پردے سے آزاد کیا، شرم و حیا سے آزاد کیا، ننگ

ناموس عزت وعصمت وعفّت سے آزاد کیا، گھر کی محفوظ چار دیواری سے آزاد کیا، رشتوں کی محبت اور تقاضوں سے آزاد کیا، کمانے اور من چاہے اسراف کے لیے آزاد کیا، اختلاطِ مرد و زن کے لیے آزاد کیا، بلا امتیازِ جنس، مذہب وملّت دوستی کے لیے آزاد کیا، اختیارات کے لیے آزاد کیا، عائلی حقوق وفرائض سے آزاد کیا، حدود کے لیے آزاد کیا، مشرقیت اور نسوانیت سے آزاد کیا۔ لیکن آزادی کی خواہاں اس ابوخاں کی بکری کو اپنے انجام کی خبر نہیں ہے۔ اب تو خدشہ لاحق ہو گیا ہے کہ آزادی کی اس دوڑ میں معاشرہ ہی مادر پدر آزاد نہ ہو جائے۔ جو مغربیت کی سوغات ہیں بقول مجروحؔ

؎ بھیس مجنوں کا لیا مَیں نے جب لیلیٰ ہو کر — رنگ لایا ہے دوپٹہ میرا میلا ہو کر

تحریکِ آزادیٔ نسواں نے پھلنے پھولنے کے لیے تعلیم کا سہارا لیا۔ تعلیم کو شعور کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔ مگر صنفِ نازک کے تو تیور ہی بگڑے ہوئے تھے۔ بنتِ حوا نے تعلیم کو محض ہتھیار سمجھا جو انتقامی واردات میں کارگر ہو کڑی محنت کی تعلیم کی اعلیٰ منازل طے کرتی گئی۔ مگر چونکہ صنفِ نازک بنیادی طور پر ناقص العقل ہے اس لیے اس نے نوشتۂ دیوار نہیں دیکھا۔ اخبارات کی دلدوز، لہولہان، ہوش رُبا خبریں بھی اس کے عزائم کو سرد نہ کر سکی اور اس حد کو جا پہنچی۔

؎ حسن فیشن ہے نیم برہنہ ہو بدن — کس ادا سے نئی تہذیب بھی اترائی ہے

جوشِ جنوں نے آتش زیر پا رکھا۔ ٹیڑھی پسلی نے اپنی کرامات دکھائیں۔

خواتین نے پردے کو کبھی بالائے طاق رکھا تو یہی پردہ ان کا عذر بنا، ڈھال بنا۔ بقول حافظؔ

بیبیاں خوش ہیں کہ پردہ اُٹھ گیا اچھا ہوا — چشمِ بد کا حسن وخوبی پر اثر جاتا رہا

خواتین نے شعبہ ہائے عمل میں قدم رکھا اور اپنے نصب العین کو عملی جامہ پہنا دیا۔ مردوں کو اس مقامِ شرف سے بے دخل کیا جو اسے میسر تھا۔ جس طرح صبح ازل آدمؑ کو جنت سے بے دخل کیا تھا۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر کے مصداق مرد نازاں ہے بنام ہوٹل

www.urduchannel.in

مینجمنٹ یا شیف، خانساماں بنے ہوئے، بنام فیشن ڈیزائنر، زنانہ ملبوسات کے درزی، بنام بیوٹیشین زنانہ حجام بنے ہوئے۔ غرض خواتین نے اپنے شعبۂ عمل کو مردوں کے سپرد کر کے ہر مردانہ کام میں مردانہ وار ڈٹی ہوئی ہیں۔ خواتین صدرِ مملکت، وزیرِاعظم، وزیر، پولیس انسپکٹر، فوج کی افسر غرض ہر صنعت وحرفت جو مردوں کے لیے مختص تھیں اب خواتین کا خاصہ بنتے جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ بس ٹرین رکشہ کے ڈرائیونگ سے لے کر پائلٹ اور خلاباز بھی خواتین ہی ہیں اور ہر جگہ اپنی نشستوں کو محفوظ کرنے کی سیاست میں مردِ مجاہد سے چار جوتا آگے ہیں۔ نتیجتاً مرد بیچارہ بے روزگار، یوسف بے کارواں کی طرح یہ کہنے پر مجبور ہے کہ

؎ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات ہی بھنگ

وجودِ زن نے اپنی حشر سامانیوں سے عیّاش طبع مرد کی ہوس، حرص اور سفلی جذبات پر اس قدر شدید اور کامیاب نفسیاتی حملے کیے کہ مرد نے اپنی ساری غیرت، حمیّت، انا اور بالا دستی کو بغل میں داب کر خوابِ غفلت میں ڈوب جانا ہی عافیت جانی۔ صنفِ نازک اب اپنے عزائم میں مکمل طور پر کامیاب ہے۔

۲۱۔جاں

روح اور جسم کے ایک جان ہونے سے ہی جان دار کہلایا جا سکتا ہے۔ ہمارا کیا اقصائے عالم کا یہی قول فیصل ہے کہ جان ہے تو جہان ہے (جاں کے بغیر جہاں کا تصور چہ معنی دارد؟)۔ جان کوئی ادنی یا معمولی شہ نہیں ہے۔ جان تو قدرت خداوندی کا بیش بہا قیمتی عطیہ ہے۔ جو عاریتاً دے دیا جاتا ہے۔ جان بھی صرف ایک مرتبہ عطا کی جاتی ہے۔ دیگر مذاہب کے عقائد کی طرح بار بار جان عطا نہیں کی جاتی۔ ایسی خوش فہمی احمق ہی رکھتے ہیں۔ اسلئے جان کی قدر دانی بھی عزیز از جاں کرنی چاہیئے۔ بقول بابر عالم دوبارہ نیست

اپنے جاں نثار عزیز و اقارب پر بر موقع و بر محل جان چھڑکنا چاہئے۔ اس عمل سے باہمی محبت، اخوت اور انسیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جان کو فضول، بے جا و بے مصرف انڈیلنا یا جان بوجھ کر ضائع کرنا نہیں چاہئے بلکہ بڑی جاں فشانی سے جاں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ یہ سخن دیگر ہے کہ دشمنوں سے جاں لڑانا، دوستوں پر جاں لٹانا، محبوب کے انتظار کے جاں گسل مرحلے سے گذرنا، عاشقی میں جاں سے گذر جانا، وطن کیلئے جاں سپر ہونے کا جذبہ، ایمان کی بقاء کیلئے جاں نثار کرنا اور نت نئے افتاد جاں فتنوں سے جان بچا کر بھاگنا بھی جاں باز اور جہاں دیدہ افراد کا شیوہ ہوتا ہے۔ بقول مرزا غالب

جاں دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان کا عمداً زیاں یعنی خودکشی ایک عظیم بزدلی ہے۔ یعنی مایوس ہو کر جان کو بے مصرف ضائع کرنا یا جان دہی کی کوشش کرنا جو بڑا جاں جوکھوں کا کام ہو جاتا ہے۔ یہ بے شک کفران نعمت بھی ہے۔ یوں تو اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے لیکن شیطان مردود جب حواس انسانی پر

www.urduchannel.in

حاوی ہو جائے تو پھر جان سے جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بھی بارہا سنا ہے کے شیطان وبال جان بن جاتا ہے، جان کھاتا ہے، ہلکان کرتا ہے لیکن جان نہیں لے سکتا۔ اگر خودکشی کی کوشش بد قسمتی سے کامیاب ہو بھی گئی تو صد فیصد جان سے گئے۔ لہذا نہ دنیا کے بچے نہ آخرت کے۔ یعنی حالت پھر بھی وہی دھوبی کے کتے کی ہوئی کہ، نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے رہے۔ حالانکہ جان سے جانے کے عزائم تو یوں تھے بقول مرزا غالب

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا۔

اگر جانکاری و تجربہ کم ہونے کے سبب خودکشی کی کوشش ناتمام رہ جائے یا کسی خیر خواہ کی بروقت مداخلت کے سبب خودکشی سے جاں بر ہو بھی گئے تو دنیا والے جان کو لعنت بھیج بھیج کر جان کی آفت کر دیتے ہیں۔ رہا محکمہ پولس تو وہ وجوہات خودکشی جاننے کیلئے پوچھ پوچھ کر جان سے مار دیتے ہیں۔ جان دینے پر کوشاں شخص یہ جان کر جان سے عاجز ہوتا ہے کہ جان بچنا کس قدر حماقت کا سودا ثابت ہوا ہے۔ آخر کس کو اس قصہء ناتمام کی روداد رسوائی سنا کر جان چھڑائی جائے۔ لہذا اپنی جان بچ جانے کے صدمہء جان کاہ پر گہرے افسوس میں وہ (چلو بھر پانی میں) ڈوب کر مرنے۔ یعنی از سر نو کامیابی سے جان سے ہاتھ دھونے کیلئے کوشاں ہو جاتا ہے۔ توبہ کرتے کرتے پھر سے ناکامی کے داغ سے دامن دھونے کی خاطر پھر سے اپنی کوشش اقدام خودکشی میں مصروف ہو جاتا ہے تاکہ اس مرتبہ ناکامی کی شکل نہ دیکھنی پڑے۔ جان دینے والا اپنی جان پر کھیل کر جان دینے کے نئے نئے حربے جاں کنی کے عالم میں بھی آزماتا ہے کہ کسی طور اس دنیا کے گورکھ دھندے سے جان چھوٹ جائے۔ بقول چچا غالب

؎ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

جان سے بے موت جانے والا تو دنیا کے مسائل اور تکالیف سے عارضی طور

پر آزاد ہو جاتا ہے۔ ناکام یا کامیاب خودکشی کے وقت جان بچانے والے یا تماشائی کی بھی جان پہ بن آتی ہے۔ وہ بے چارہ بھی مقدمات کی جاں گسل مشکلات کا شکار اور پولس کیلئے لقمۂ تر ثابت ہوتا ہے۔ یعنی جاں دے کوئی اور اس کیلئے جان ماری کی سزا کوئی اور بھگتے۔ اگر جان بچانے والا کوئی جان پہچان کا ہوا تو خیر وہ ازراہ تعلقات یہ تکلیف اپنی جان پر برداشت کر لے گا۔ اگر وہ پرایا ہوا تو جان نہ پہچان خالہ ماں سلام۔ ان بے چاروں کو ایسی مشکل آن پڑتی ہے کہ جان بچا کر بھاگنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ اس لئے آج کل عوام جاں بوجھ کر جان دینے کے معاملات سے جان بچا کر بھاگ جانے میں ہی عافیت جانتی ہے۔ بلا آخر سب کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے۔ بقول چچا غالب ۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

خودکشی کی وجوہات میں اکثر عاشقی ایک اہم سبب ہے۔ اکثر عاشقی کا جادو عاشق و معشوق کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اپنے محبوب کے ایک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ اپنے محبوب پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ عشاق جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کیلئے جان دینے کی قسمیں کھاتے ہیں۔ بقول غالب ۔ ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جاں جھوٹ جاناں ان کی جان کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک انہیں اپنی جان سے جانجاناں نہ بنا لیں۔ بقول احمد فراز

آپ تو نزدیک سے نزدیک تر آتے گئے　　　پہلے جاں پھر جانجاں پھر جانجاناں ہو گئے

لیکن فی زمانہ کے اخبارات کی خبروں نے نیا انکشاف کیا ہے کہ اب عاشقی میں جان دینے کی روایت خاصی بزدلی کا عمل، عامیانہ روش و پھوہڑپن تسلیم کی جاتی ہے۔ کون اپنی جان وبال میں ڈال کر، جان جوکھم کر کے عشق کے امتحان سے گذرے کیا پتہ کہ

۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

www.urduchannel.in

عہد جدید کے عشاق جان لینے میں یقین زیادہ رکھتے ہیں تا کہ اپنے معشوق کا جذبہ ایثار و قربانی اور وفا کا پیمانہ معلوم ہو سکے۔ پولس کو معشوق کی جان جانے کے بعد جان دینے والے کے گھر سے یہی کچھ برآمد ہوتا ہے۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط

پھر ناکافی ثبوت کے عوض ضمانت۔ اس وقت تک عوامی یادداشتوں سے بھی ان خبروں کا صفایہ ہو جاتا ہے۔

ان متغیر اقدار اور پست حالات میں جاں سوزی نہایت عجلت اور غایت درجے کی حماقت کا فعل ہے جو قطعاً جان جوکھم سے کم نہیں ہے۔ جسے نہ رب کی اجازت ہے اور نہ ہی سب کی حمایت۔ مرے پر سو درے یہاں جاں سے چھوٹے نہیں کہ دوزخ کے فرشتوں نے نئے مہمان کی خاطر تواضع کیلئے نئی آگ بھڑکائی کہ مہمان کو یہاں آنے کی کس قدر عجلت تھی کہ بغیر وارنٹ ہی چلے آئے گویا بن بلائے مہمان۔ لہذا اس عمل سے توبہ کرنا اور اجتناب کرنا ہی عقلمندی اور دانشمندی کا تقاضہ ہے۔

خودکشی سے بچانے والوں کیلئے احتیاطی تدبیر یہ ہے کہ جان کر جان دینے والوں سے جان بچا کر بھاگ لینا ہی وقت کی ضرورت ہے۔ ورنہ پولس کی تفتیش، مقدمات کی گردش، گواہی کی پرسش کے وبال جاں سے جان آفت میں پڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۱۔ بال

بال قدرت کاایسا عجوبہء روزگار وشاہکار عطیہ ہے جو زنانہ حسن ومردانہ وجاہت کا موجب اور ہر دو جنسوں مرد وزن کی زیب و زینت کا سامان بھی ہے۔ بال ایسی فصل ہے جو بلا کاشت فراوانی کے ساتھ ہوتی ہے اور اسے جتنی کاٹو اتنی بڑھتی جاتی ہے۔گویا بڑھتی کا نام ڈاڑھی۔قدرت کی نوازشات کی نہ تو کوئی حد ہے نہ حساب۔کسی کو اس قدر فیاضی کے ساتھ بال سے نوازتی ہے کہ بال ان کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔اور کسی کو بال سے اس قدر محروم کرتی ہے کہ وہ بال کی حسرت و تمنا میں اپنے رہے سہے بال کو نوچنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔قول مشہور ہے کے اللہ گنجے کو ناخن نہیں دیتا ورنہ بچے کچے بال کا بھی اللہ اللہ خیر صلی۔ان بے چاروں کو غالباً علم ہو کہ سرمنڈواتے ہی اولے پڑتے ہیں۔ان کی تسلی کیلئے عرض ہے کے یوں بھی بال کی تگ ودو میں بال نوچنے یا جاں سوزی سے کیا حاصل۔بقول مرزا غالب

؎ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

شومئی قسمت سے جن کے سر کے بال ان سے پوری طرح روٹھ جاتے ہیں۔بلفظ دیگر وہ بال کی آفات سے بال بال بچ جاتے ہیں۔یعنی جن کے سر فارغ البال ہوجاتے ہیں۔ان کے لب پر یہی گلہ ہوتا ہے۔

کیسی قدرت نے مرے ساتھ عداوت کی ہے   سر کے بالوں نے مرے مجھ سے بغاوت کی ہے

بال سے کنگال شخص باقیماندہ بال کو غنیمت کے طور پر اپنے سر پہ چڑھالیتا ہے۔یوں بھی قدرت نے بال کو جغرافیائی طور پر سر چڑھایا ہوا ہے۔کچھ تو شعراء وادباء نے بال کو تشبیہ و استعارے کی زبان میں گیسو دراز، کاکل کا پیچ وخم، زلف گرہ گیر، بکھری لٹ اور ریشم کا جال

www.urduchannel.in

وغیر گردان کرادبی طور پر مزید سر چڑھادیا ہے۔یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ ؎

تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بال کا جادو ہر حال میں سر چڑھ کر بولتا ہے۔جو عہد شباب میں کالا جادو، ادھیڑی میں کھچڑی قسم کا جادو ہوجاتا ہے اور بلآخر پیری میں سفید جادو کی شکل اختیار کرلیتا ہے یہ بھی اب قصہء ماضی ہو چلا ہے۔اب حنا کی بناء اور ہیئر ڈائے (بالوں کے مختلف رنگوں) کی مناسبت سے رنگین جادو بھی ہوتے ہیں۔اس ایجاد کے زمانے میں نئے انکشاف کے امکان سے انکار ممکن نہیں ہے۔بقول شاعر

؎ چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال

اور جو بال سے محروم ہوں ان کیلئے بال یا بال کا خیال مستقل وبال جان بن جاتا ہے۔

بالوں کی اہمیت کے پیش نظر بالوں کی آرائش وزیبائش، رنگ وروغن، نگہداشت اور نشو نماء کیلئے جن مواد کا استعمال ہوتا ہے ان کے بیان کی خاطر علحدہ دفتر درکار ہے۔مردانہ مواد زینت تادم تحریر محدود دہیں جو ان کی منکسر المزاجی کے عین مطابق ہے۔جیسے ناریل کا تیل، ہیئر ڈائے، ہیئر جیل، ہیئر کنڈیشنز اور ٹونز وغیرہ۔لیکن زنانہ شعبہء زینت میں ان مواد زیبائش کے امکانات لا محدود ہوتے جارہے ہیں۔مشہور ہے کہ خواتین اپنی آرائش کیلئے فضول خرچی کرنے یا اس کی مقابلہ آرائی میں، عمر کم بتانے، جتانے اور ثابت کرنے کیلئے کچھ بھی کرسکتی ہیں۔مثلاً صابن، شیمپو، بالوں کے فطری اور غیر فطری وغیر رنگ وروغن، ریٹھا، برہمی بھنگرہ، شکاکائی، آملہ آمیز مختلف روغنیات مختلف بیوٹی پارلر میں دستیاب بہتیرے ہیئر پیک کے علاوہ مصالحہ جات کی صنعت روز افزوں پروان چڑھ رہی ہے۔ملک کی کثیر آبادی کا ذریعہء معاش اسی صنعت سے فراہم ہوتا ہے۔یہ سارے چونچلے بلا لحاظ عمر وجنس بالوں کے ہی رہین منت ہیں۔جو اس ہوش ربا گرانی اور کساد بازاری کے

عالم میں بھی ماہانہ خریداری کی فہرست میں برابر شامل ہوتے ہیں۔ بال سے عاری اشخاص کی خاطر پہلے مصنوعی بالوں کی وگ دستیاب ہوا کرتی تھی۔ اب نئی ٹکنالوجی نے ہیئر ویونگ اور ہیئر ٹرانسپلانٹ کے طور طریقے ایجاد کر دئیے ہیں کہ یہ بھی بالوں کو سر چڑھانے کا منفرد طریقہ کار ہے۔

بال کی حجامت جیسے معمول کے فعل کو بھی نت نئے ناموں ہیر اسٹائلسٹ اور ہیئر ڈریسر کے عنواں تلے آراستہ کر کے خوب دولت کشید کی جا رہی ہے۔ صدیوں سے حجامت صرف مردوں کا خاصہ تھا اور خواتین پہلے شوہروں کی (شامت اعمال کی پاداش میں) حجامت کرنے کی ماہر تھیں۔ اب خود اپنی حجامت کیلئے بیوٹی پارلروں میں گھنٹوں محو انتظار رہتی ہیں۔ گویا ہر میدان کی طرح اس شعبے میں بھی خواتین مردوں پر سبقت لے جانے میں پیش پیش ہیں۔

بہر حال سر پر بال ہونا کس قدر اقبال مندی کی بات ہے، اس کی قدر اسے ہی ہوگی جسے قدرت نے بال کی نعمت سے کنگال رکھا ہے۔ انہیں پیشانی کی حدود کا تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور بوقت وضو چہرہ دھوتے ہوئے سہواً مسح کرنا پڑ جاتا ہے۔ جن کے سر بال سے یکسر عاری ہوں ان کو بال برابر بھی مطلق یہ خوف نہیں ستاتا کہ کوئی ان کا بال بھی بیکا کر سکے گا (اگر بال ہوگا تو وہ بیکا بھی ہو سکتا ہے)۔ جن کے سر بال سے فارغ البال ہوتے ہیں ان کو دھوپ کی تپش اور سرما کی سرد لہر بھی زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے سروں کو مختلف رنگوں ساختوں اور فیشن کی ٹوپیوں سے ڈھک کر احتیاط کرتے ہیں۔ اس طرح سر کی حفاظت کے فریضے کے ساتھ چندیا کی پوشش بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسے افراد کو چودھویں رات کو احتیاطاً باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ کہیں عوام کو زمیں پر ہی ایک اور بدر منیر کا نظارہ دیکھنے کا مغالطہ ہو سکتا ہے۔ جسے بھی عرف عام میں چندیا ہی کہا جاتا ہے۔ یعنی چندا بمقابلہ چندیا۔ بقول شاعر

www.urduchannel.in

کیسی حسیں آج تاروں کی رات ہے   اک چاند آسماں پہ ہے اک میرے ساتھ ہے

جو حضرات سر کے بالوں سے فارغ البال ہوتے ہیں یا جنہیں بال کم یا تقریباً نہیں ہوتے۔ وہ دوسروں کے بال کی کھال نکالنے اور بے مصرف قیل وقال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بال کی آرائش سے رخ زیبا کے جملہ عیوب کی پوشش اور چہرے کی تراش وخراش سنوارنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بال سنوارنے کے مختلف اطوار سے شخصیت نکھرتی ہے۔ انسان کے چہرے کے خدوخال، چال ڈھال اور اعمال کے ساتھ بال سے بھی شخصیت کے بارے میں تاثر قائم کیا جاتا ہے۔ لیکن جونہی بال جسم سے جدا ہو جاتا ہے اسے نجس و ناپاک تصور کیا جاتا ہے۔ اس سے یوں پرہیز کیا جاتا ہے گویا بال کوئی وبا یا وبال جاں ہو یا یہ جسم کا حصہ رہا ہی نہ ہو۔ اگر شیشے میں بال آجائے یا لقمے میں بال آجائے تو بھی انسان کو سخت ناگوار گذرتا ہے۔ ورنہ زلف معشوق کے بوسوں سے دلبستگی عشاق کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان اوقات میں انسان ابن آدم سے نہ جانے کیوں ابن الوقت بن جاتا ہے۔

بال محض زیب و زینت ہی کا موجب نہیں ہوتے بلکہ مذہبی رسومات میں بھی بال کا وقار سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس سے بال کی مذہبی کارفرمائی اور اہمیت مسلم ہوتی ہے۔ عازمین حج وعمرہ سر کے بال کی حجامت کے بعد اپنی عبادات کی تکمیل کرتے ہیں۔ عیدالاضحی کو قربانی کے بعد بال کی حجامت اور ناخن کترنا بھی باعث اجر وثواب ہوتا ہے۔ برادران وطن بھی تروپتی کے بالاجی مندر جا کر اپنے سر کے بالوں کو حجامت کے بعد اپنے درشن کی تکمیل کرتے ہیں، اسی طرح برادران وطن اپنے کسی عزیز کی موت پر بھی بالوں کی حجامت کے بعد اظہار غم و ماتم کرتے ہیں۔ جین منیوں اور سنیاسنوں (راہبہ) کے بال بھی مستقل حجامت کئے ہوئے ہوتے ہیں تا کہ جراثیم اور حشرات الارض ان میں اپنا بسیرا نہ کر لیں۔ اس لئے وہ بال کے جنجال

سے ہی فارغ البال ہو جاتے ہیں۔

عام مشاہدہ ہے کہ اکثر ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم بھی سر کے بالوں سے فارغ البال ہوتے ہیں۔اکثر امراء و روساء کے سر بھی بال سے عاری ہی ہوتے ہیں،اکثر و بیشتر شعراء ادباء دانشور،سیاست داں حتیٰ کہ سائنسداں حضرات بھی گو عقل سے مالا مال ہوتے ہوں البتہ بال سے کنگال ہی ہوتے ہیں۔ہم نے کہیں سطور بالا میں بال والوں کو خوش قسمت قرار دیا تھا جو محض موصوف کے جذبہء حسرت کی ترجمانی کیلئے تھا۔لیکن سر کے بالوں سے فارغ البال حضرات اکثر درج بالا خواص کے حامل بھی ہوتے ہیں۔اگر معبود حقیقی کچھ لے لیتا ہے تو وہ اس سے زیادہ نوازتا بھی ہے۔یہ صد فیصد سچ ہے۔بقول شاعر

بالوں کا سر پہ گرچہ ڈھیر نہیں ہے　　　اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔

۲۲۔ بابوگیری

بابوگیری یا ملازمت کوئی منہ کا کھیل نہیں ہے۔بڑی جان جوکھوں کا کام ہے،مثل مشہور ہے'نوکری خالہ جی کا گھر نہیں'۔گو ملازم پیشہ بابوؤں کو سرکاری داماد،نوکر شاہ کہلانے،اپنے اختیارات و منصب پر اترانے،اٹھلانے اور راج کرنے کا افتخار حاصل ہوتا ہے مگر درحقیقت بابو حضرات بڑے مظلوم و محکوم ہوتے ہیں۔گویا چابی پر چلنے والے کھلونے۔ان کا محدود دائرہ عمل ،محدود وقت کی تقسیم،محدود اختیارات،محدود قانونی بندشیں،محدود تنخواہ،محدود وسائل،محدود حلقۂ احباب،بالآخر ان کی سوچ کا افق بھی محدود اور اُمنگوں کو بھی تحدیدِ ادب،میں پھلنے پھولنے کی عادت سی ہو جاتی ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے

مگر مجبوری کہ نوکری میں نخرہ زیب نہیں دیتا۔ان کا سارا وقت ہر دو محاذ کی نبرد آزمائی کی نذر ہو جاتا ہے۔گھر میں شریکِ حیات کی خوشنودی اور دفتر میں افسرانِ بالا کے احکامات کی تعمیل۔خیر'چاکری کو آکری (سُستی) کیا'اگر شومئی قسمت سے بیوی نک چڑھی اور بدمزاج ہو یا افسرانِ بالا 'ہٹلر شاہی' صفات کے حامل سخت گیر اور نظم و ضبط کے پابند مل جائیں تو حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کی کیفیت ہو رہتی ہے۔سچ ہے راج ہٹ،باہٹ اور استری ہٹ کا دنیا میں نہ کوئی جواب ہے نہ متبادل۔بقول صبا شیخانی

جب بھی ہوتی ہے میری بیگم سے لڑائی　　　گھر میں بجتے ہیں سوز سے سامان و ساز
پاس مسجد ہے اذاں ہوتے ہی ٹل جاتا ہوں　　　آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز

ملازم پیشہ بابوؤں کا دل گردہ بڑا مضبوط ہوتا ہے جو تمام عمر'ماتحت'بن کر بھی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔دفتر میں اپنے افسرانِ بالا کے ماتحت اور گھر میں اپنی نصف بہتر کے

www.urduchannel.in

ماتحت ۔ پہلے پہل یہ مرحلہَ شاید خاصہ دشوار گذار ہو مگر رائج ہے خام کو کام سکھا لیتا ہے ۔

؎ آتے آتے جینے کے بھی لاکھ بہانے آجاتے ہیں

انہیں اپنے دو آقاؤں (گھر اور دفتر) کے غمزے، عشوئے، نخرے، ناز و ادائیں جھیلنے کی مجبوری، فرض یا محبت کی حد تک لاحق ہوتی ہے ۔ دفتر میں ہر بات پر ُیس باس' کہہ کر تو گھر میں اپنی شریک حیات کی صدا پر الرٹ ہوتے ہوئے ُجی ابھی آیا.... ' کرتے ۔گویا

؎ وقت ساری زندگی میں دو ہی گذرے ہیں کٹھن

مگر مرتا کیا نہ کرتا بادلِ ناخواستہ ہی سہی ان کا حکم بجالانا فریضہ قرار پاتا ہے ۔

رفتہ رفتہ احکامات کے تعمیل کی عادت جو خو اور خمیر کا حصّہ خواہ نہ ہو مزاج میں چپکے سے در آتی ہے ۔ بابو جی سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح ہر حکم کی اطاعت و تعمیل کو معمول کا حصّہ بنا لیتے ہیں ۔خواہ محاذ گھر کا ہو یا دفتر کا نہ انہیں شخصی رائے زنی کی زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے نہ خود مختاری اور آزادانہ خیالات کا بار اُٹھانا ہوتا ہے، بالآخر انہیں قوتِ فیصلہ کا مجاز بھی نہیں سمجھا جاتا ۔ان کے ہر فیصلے بیوی کی رضامندی اور افسرانِ بالا کی مرضی پر موقوف ہوتے ہیں، خواہ ضمیر کچھ بھی کہے ۔گویا نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ۔جس کا ماٰخذ سیدھا اور صاف ہے کہ ملازم پیشہ بابوؤں کو اپنی مرضی اپنی بغل میں دبا لینی چاہیے بقول شاعر

؎ مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے

اور اپنا مطمع نظر اپنے افسرانِ بالا کی خوشنودی اور اہلیہ محترمہ کی خوشی پر محور کرنا چاہیے تاکہ سفینۂ حیات طلاطم خیز لہروں کے گرداب میں کہیں ہچکولے نہ کھانے لگے ۔فرمانبرداری کے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں ۔مثلاً اپنے آقاؤں کے ہر مدعے کو ہمہ تن گوش بغور سننا خواہ وہ دلچسپی کے حامل ہوں یا نہ ہوں ۔مگر انہماک کی وہ کیفیت برقرار رکھنا باادب طور پر سر ہلا کر بیجا و بجا تائید کرنا

www.urduchannel.in

وقتاً فوقتاً مسکرانا، نمائشی تاثرات اور آمادگی کا اظہار اس کامیابی سے کرنا کہ مخاطب نہ صرف مطمئن ہو بلکہ اسے صد فیصد یقین ہو جائے کہ آپ اس کے زرّیں خیالات سے ہم آہنگ و متفق ہیں ۔

ملازمت صبر تحمل، ایثار و قربانی کی تربیت گاہ ہے ۔ملازم پیشہ بابو اسے اوّل آخر سیکھ کر بالخصوص امتیازی وصف کے حامل ہو جاتے ہیں ۔اسی طرح اپنے غصّے کو فرد کرنا، زبان کی نوک پر آئی صلواتوں، لعنتوں اور ملامتوں کو بلا چبائے نگل جانا، آزادانہ اظہارِ رائے اور باغیانہ تیور کے مظاہرے جیسے مضر امور سے دستبردار ہو کر نرم خوئی، حلاوت، خندہ پیشانی، گداز لہجہ، انکساری، خوشامد اور چاپلوسی کی حدود سے گلے ملتے ہوئے مصلحت اندیشی ایسی کہ مخاطب موم کی طرح پگھل جائے اس قسم کی تدابیر ان کا شیوۂ خاص بن جاتی ہیں ۔چونکہ انہیں تجربہ ہوتا ہے ۔ ُخوشامد سے آمد ہے ۔' معمولی ترمیم کے ساتھ بقول ڈاکٹر شباب للت ؎

ایں جناب و آں جناب و آں حضور ہو کوئی کتنا فہیم و باشعور

ہنستے ہنستے منہ لگاتا ہے ہمیں میز پر اپنی بلاتا ہے ہمیں

گو مذکورہ مزاج و عادات بظاہر کسی سند، ٹرافی، تعظیم انعام و اکرام اور مالی منفعت کا باعث ہرگز نہیں ہوتیں بلکہ ان سے فزوں تر یہ ملازم پیشہ بابوؤں کی شناخت بن جاتی ہے ۔دفتر میں ُفرض شناس افسر' اور گھر میں ُپتنی ورتا پتی' مثالی یا سیدھے فرمانبردار شوہر ۔ملازم پیشہ بابو جہاں اپنی خوابوں کی ملکہ کا سائق (ڈرائیور) ہوتا ہے واپنے افسرانِ بالا کے تقاضوں کی تکمیل پر لائق و فائق ۔جہاں وہ اپنے افسرانِ بالا کے متعلقہ کاموں کا جوابدہ ہوتا ہے وہیں وہ بڑی تندہی سے اپنے نصف بہتر کو تنخواہ، جیب خرچ اور گذرے اوقات کا حساب دینے کا پابند ہوتا ہے ۔اگرچہ شریکِ حیات بھی ملازمت پیشہ مل جائے تو محترمہ کی مزاج برداری کا بار دوگنا، سہ گنا اور چہار گنا تک ہو جاتا ہے ۔فرمائشوں کی فہرست طویل اور فہمائشوں کا قصّہ مختصر ہوتا جاتا ہے ۔سچ ہے

دو دھیلی گائے کی لتیاں بھی بھلی ۔ ؎ دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھرنہ آئے کیوں ۔ چکّی کے دو پاٹوں کی طرح ہر دو آقاؤں کے احکامات کی پیروی کرتے کرتے بابو حضرات بھی بلا آخر ہو شیار ہو جاتے ہیں ۔بقول ڈاکٹر شاداب للت ؎

اپنے آقائے گرامی کے غلام — ’ہر کسے را بہر کارے ساختند‘
کر رہے ہیں ہم بھی کچھ کارِثواب — ہم سے ہیں اہلِ ثروت فیضیاب
اپنے ہتھکنڈوں کا ہم خود ہیں جواب — اپنے ہتھکنڈے بہت معصوم ہیں
اور بھی کچھ گُر ہمیں معلوم ہیں

تجربات کی بھٹّی میں تپ کر ملازمت پیشہ بابوؤں کو دفتری سیاست کے داؤ پیچ کی بڑی مشق ہوتی ہے ۔ضابطے کی فولادی زنجیریں اور قانونی آہنی بندشوں کی سختی کا کیا کہنا ۔مگر بابو حضرات اپنے فن کے طفیل اس میں خوبصورت حیلہ سازیاں اور کارآمد گنجائشیں پیدا کر کے نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے افسرانِ بالا کے لیے بھی بالائی اور زیرِ میز آمدنی کے ذرائع پیدا کر لیتے ہیں ۔جن سے وہ اپنی ذاتی دبی کچلی خواہشات کا مداوا، شخصی تعیش اور باقی ماندہ رقم سے بیوی پروری کا فریضہ بھی قدرے فراخ دلانہ طور پر انجام دیتے ہیں ۔جس سے انہیں ایک تیر سے دو شکار کا فائدہ مل جاتا ہے ۔بعض اوقات محدود قانونی اختیارات و بندشیں انہیں پنجرے کا شیر بنا دیتی ہیں اور بعض اوقات سرکس کا شیر ۔جہاں انہیں ہر دو رِنگ ماسٹر کے ہنٹر کے اشاروں پر کمالات کا مظاہرہ کرنا لاحق ہوتا ہے ۔پہلی نصف بہتر اور دوسرے افسرانِ بالا داخل دفتر ۔

اگر ملازم نیا ہو تو پھر وہ شیر کا شکار کرتا ہے ۔وہ اپنی فرض شناسی ثابت کرنے اور افسرانِ بالا کی خوشنودی کے لیے اور الفتِ بیگم کے حصول کی خاطر غیر متوقع کام بھی چٹکیوں میں انجام دے کر ان کا منظورِ نظر بن جاتا ہے ۔فرمانبرداری، اطاعت اور خندہ پیشانی کے رجحانات اور عادات اپنے اندر اس قدر کشش رکھتے ہیں کہ ملازم پیشہ بابو خواہ اپنے کام میں ناکارہ، فنی مہارت میں نکھٹو اور تساہل وتجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کریں تب بھی یہ ملمع سازیاں ان کے معائب کو منطبق کرنے کے لیے کافی ہیں

؎ ’سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں‘

www.urduchannel.in

۲۳۔ جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست

جس طرح ہم اپنے بچوں کی ضد، ہٹ دھرمی اور غصّہ کو فرد کرنے کی خاطر انہیں چاکلیٹ، کیڈ بری اور دلچسپ کھلونوں کے بہلاوے یا سیر وتفریح کے بہانے تراش کر انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں عین اسی طرح عنان حکومت بھی اپنی ناراض اور بپھری ہوئی عوام کے پارے کو سرد کرنے کے لیے جمہوری قوانین کی تعزیرات میں پوشیدہ ایسی ہی کسی حکمت عملی کے پس پردہ غصّے سے آگ بگولہ اور بھڑکتے عوام کے غصّے اور تشدد کے عتاب، فرقہ ورانہ فسادات اور دیگر نقص امن کے خطرات کے مؤثر حل کے لیے سبز باغ دکھانے کی کوئی سبیل پیدا کر ہی لیتی ہے۔ گویا سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

؎ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

عوام کی، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے کی جانے والی جمہوری حکومت میں عوامی جذبات اور عوامی مطالبات پر عیار طبع سیاستدان کس قدر مہارت سے بساطِ سیاست تیار کرتے ہیں، کس طرح عوامی غصّے پر لگام کسنے اور انہیں نکیل بند کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں خواہ وہ کسی رنگ ونسل، مذہب، طبقہ، مسلک اور علاقائیت پر مبنی، چھوٹے بڑے تنازعات ہوں یا موذی فسادات یا دیگر عوامی مسائل مثلاً دہشت گرد حملے ہوں یا خود کش بم حملے یا اسی قبیل کے دیگر مسائل پر جب غصّے سے بپھری ہوئی بے قابو عوام یہ نعرہ بلند کرتی ہے

خاموش مزاجی تمہیں جینے نہیں دے گی　　اس دور میں جینا ہے تو کہرام مچا دو

پھر اربابِ حکومت کا قافیہ تنگ کیا جاتا ہے اور ان پر نا قابل جواب سوالوں کے کمند ڈالے جاتے ہیں تو ان جفا پیشہ کہنہ مشق سیاسی سوداگروں کے یہاں ان کا بہت آسان

www.urduchannel.in

، کارگر اور معتبر ترکیب کا تیر جو ان کی ترکش سیاست میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اوّل تو مگرمچھ کے آنسو بہا کر اپنی نام نہاد ہمدردی کا اظہار، مسئلے کی عادلانہ تحقیق اور خاطی کو سزا کا تیقن دے کر وہ ان مسائل کو اپنی پالتو تحقیقی وتفتیشی ایجنسیز کے سپرد کر دیتے ہیں خواہ وہ CID، CB CID، ATS، IB، RAW، CBI اور NIA ہوں یا اسی قسم کی اور تنظیم اور جب ان کی عملی استعداد پر اعتبار کم ہو اور اپنی بیرونی دوستوں کی اعانت بھی مقصود ہو تو از خود غیر ملکی تفتیشی تنظیموں کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً انٹر پول، موساد اور FBI وغیرہ تاکہ خارجہ پولیسی بھی متوازن رہے اور ہم نے چھوڑی نہ غلامی کی خو، یہ پیغام بھی پہنچتا رہے۔ بلآخر انکل سام کی خوشنودی حاصل رہے۔ پھر یہ ماہرین سیاست گھوڑے گدھے بیچ کر کمبھ کرن سے بھی گہری نیند میں غرق ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ بیچارہ کمبھ کرن بھی تو مجبوراً چھ ماہ بعد بیدار ہو جاتا ہے مگر ان کے لیے وقت کی حدِ فاصل ندارد مگر صحافی حضرات بھی انہیں جیتی مکھی نگلنے نہیں دیتے اور موقع پاتے ہی مذکورہ مسائل پر سوال اُٹھاتے ہیں مگر سیاست داں جنہیں لاج، شرم، حیا اور غیرت سے کیا علاقہ؟ تو یہ ڈھیٹ بن کر اعلی الاعلان جواب دیتے ہیں معاملہ زیرِ تفتیش وتحقیق ہے اس پر بیان بازی کرنا قانون کی سخت خلاف ورزی ہے۔ یوں بھی مشہور ہے　؎ یادِ ماضی عذاب ہے یارب

ان کے ترکشِ سیاست کا دوسرا اہم اور کارگر تیر ہے، کمیشنوں کی ترتیب وتشکیل جو عوامی اور قومی نوعیت کے مسائل کی تحقیق وتفتیش کرتی ہے۔ اربابِ حکومت کے پاس پُرانے چاولوں کی طرح قیمتی نمک خوار اور فرماں بردار، مؤظف وکلا اور جج حضرات کی فوج ہوتی ہے جن کی پیشہ ورانہ کیفیت اور معاشی سرگرمیاں عضوئے معطل سے کم نہیں ہوتی مگر ان کے گراں قدر مشاہدات، تجربات اور توڑ جوڑ کے عمل میں مہارت کے علاوہ ہر اُس فن میں کمال حاصل ہوتا ہے جو اُن کے آقاؤں کو درکار ہوتا ہے۔ ایسے ہی نابغۂ روزگار اور قابل وکلا کی شان میں وکیل پیشہ حضرتِ اکبر الہ

آبادی نے شعر چست کیا ہے

ع پیدا ہوا وکیل تو شیطان نے کہا   لو ہم بھی آج صاحب اولاد ہو گئے

حکومت ایسے باصلاحیت موظف قانون دانوں کی خدمات کا اعتراف بھی اسی بہانے کرلیتی ہے ان سے اپنے مطلوبہ موقف کی مقصد براری کے لیے ان پر سرکاری خزانوں کے منہ کھول دیئے جاتے ہیں جو عوام کی گاڑھی کمائی سے بمشکل ہی بھر پاتے ہیں بقیہ تمام سیاست دانوں کو بھی تو اپنا اپنا حصّہ مطلوب ہوتا ہے۔ان فاضل قانون دانوں کو نہ وقت کی بندش ہے نہ اخلاقیات کی حدِادب مقرر ہوتی ہے، نہ کام کے حجم کا احتساب، نہ حقیقت بیانی پر تمغوں کا لالچ، نہ شاندار نتائج پر ستائش وانعام کی توقعات، نہ تعریف وتوصیف کی بارش۔لہٰذا مذکورہ حضرات تفتیشی کاموں کو شیطان کی آنت کی طوالت عطا کرکے مزید پیچیدہ اور گنجلک بنا دیتے ہیں صفحات کی تعداد ہزاروں اا ور لاکھوں میں ہوجاتی ہے ان کے کاموں میں اس قدر محنت، لگن، انہماک اور جانفشانی درکار ہوتی ہے کہ نتائج کی اُمید کرتے کرتے مجرم ملکِ عدم کا راہی ہوجاتا ہے۔حکومت اور اربابِ سیاست تہ و بالا ہوجاتے ہیں۔مذکورہ مسائل عوامی یادداشت سے غائب ہوجاتے ہیں جو عموماً بڑی مختصر سی چیز ہوتی ہے اور آج میں جینے کا ہنر رکھتی ہے۔یہ مسائل طاقِ نسیاں کے امین ہوجاتے ہیں۔بیشتر شواہد، آثار وقرائن اور ثبوت بھی یا تو پیوندِ خاک ہوجاتے ہیں یا کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بھولی بسری داستان یا تو ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہوتی ہے یا حوالوں میں زندہ رہ جاتی ہے   ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ایک ہی مسئلے پر مختلف ادوارِ حکومت میں متعدد کمیشنوں نے کام کیا ہے مگر ان کی سفارشات کا عوامی اجراء اور نفاذ تو دور کی بات ہے، ان کی ماحصل رپورٹ بھی عوامی نظر سے بچا کر حکومتیں بآسانی ان مسائل سے چشم پوشی کرلیتی ہیں۔اگر من وعن حقائق سامنے آجائیں تو ہر

www.urduchannel.in

کمیشن ایک انقلابی بم کی حیثیت رکھتی ہے۔مگر ان تجربات نے اربابِ حکومت کو نیا کلیہ سکھا دیا ہے کہ جس مسئلے کو حل نہ کرتے ہوئے سرد خانے کے سپرد کرنا ہو اُس پر بھاری بھرکم موظف وکلا اور ججوں پر مبنی کمیشن نامزد کردیا جائے تاکہ مسئلہ اپنی طوالتِ تحقیق و تفتیش اور غیر تسلّی بخش سفارشات کے سبب اپنی بنیادی شناخت اور مقصد کو خود بخود کھو دے۔

ہم نے اپنی معمولی یادداشت میں جسٹس ناناوٹی کمیشن، جسٹس رنگ ناتھ مشرا کمیشن، جسٹس راجندر سچر کمیشن، جسٹس شری کرشنا کمیشن، گجرال کمیشن، لبراہن کمیشن، مدن کمیشن اور مقامی طور پر پاٹل کمیشن اور اسی طرح جمہوریت کے بعد بے شمار کمیشن کی تشکیل اور ان کے مابعد حشر اور انجام کو دیکھا ہے۔ان کمیشنوں نے اپنی سفارشات، حقائق، براہن وثبوت کب، کتنے عرصے میں، کہاں، کسے، کیسے اور کس مقصد کے تحت دیئے اور اس کا مثبت نتیجہ اور قانونی نفاذ کیوں کر عمل میں نہ آیا، ان پر کس قدر صلاحیتیں، وقت، وسائل، سرمایہ اور سرکاری مشنری کا استعمال ہوا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کی بازگشت کبھی نہیں آتی۔یہ سوالات بارہا ذہن کو دستک دیتے ہیں مگر جواب ندارد کہ ہم بھی یہی تسلیم کرلیں کہ کون سے اپنے جیب کا مال تھا؟

ع جیب کا اپنی ہے یہ مال کہاں   فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟

دراصل ان کمیشنوں کے مکر وفریب کے جال آج کل کی پیداوار نہیں ہیں۔

ان کی تاریخ کے ثبوت تقسیمِ ہند سے پہلے بھی ملتے ہیں۔غدر کے بعد ہی انگریزوں نے اپنے تسلط کو دوام بخشنے کے لیے مہلت طلبی اور وقت گزاری کے بہانے سے مسائل کو طوالت دینے کی نیت سے کرپس کمیشن، اور سائمن کمیشن جیسے بہتیرے کمیشن تشکیل دیئے مگر وہ تو پھر بھی کسی قدر اصول پسند اور دیانت دار تھے۔اپنے مدّمقابل سے مذاکرات اور معاہدے کرتے تھے۔خیر اُنہوں نے جو کیا سو کیا مگر ہمارے اربابِ اقتدار نے ان سے جو روش سیکھی وہ ہے مسائل کو زندہ رکھتے ہوئے

کمیشن پر کمیشن کی تشکیل کر کے بساطِ سیاست پر مہروں کی گردش کا موزوں جواز تو ہو

ے کمیشن پر کمیشن اس قدر تشکیل کرتا جا کہ ہستی مرتے مرتے آپ خود بے زار ہو جائیں

یہاں حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ قانون اندھا ہوتا ہے ظاہر ہے اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ مگر یہ قانون داں حضرات جوتا پہن کر عوام کی آنکھ میں گھس جاتے ہیں اور آنکھوں میں دھول جھونک کر اربابِ سیاست کی آنکھ کا تارا بن جاتے ہیں۔ کچھ قانون داں ایسے ہوتے ہیں جنہیں اپنی محنت، دیانت داری کا غرّہ ہوتا ہے اور قرار واقعی حقیقت کے انکشاف کا جنون ہوتا ہے وہ اربابِ سیاست کی مصلحتوں اور ریشہ دوانیوں سے متاثر ہوئے بغیر اپنی سفارشات اور رپورٹ تو کجا کل کمیشن کا مواد ہی انٹرنیٹ پر شائع کر کے اسے عوامی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ضمیر کے آگے مطمئن اور فرض کی تکمیل پر شاداں اور نمک خواری کا حق ادا کر کے خوش و خرم رہتے ہیں۔ بقول چچا غالب

ے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اہل سیاست ہمیں کمیشنوں کے لطف و کرم کا منتظر اور شیخ چلّی کے خواب دیکھتا چھوڑ کر اپنا راستہ لیتے ہیں۔ بعد ازاں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ آیا وہ کمیشن ہے کہ وعدۂ معشوق یا حسین بہلاوا۔ بقول مجازؔ لکھنوی ے

وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

۲۴۔ کتّے

فاضل مزاح نگار پطرس بخاری نے اپنی شاہکار نگارش 'کتّے' میں گائے بکریوں اور بھینسوں سے مادّی افادیت، مثلاً دودھ مکھن، دہی اور پنیر کی یافت کا اعتراف کیا ہے مگر اُنہیں شاید کتّوں کی غیر مادّی افادیت کا علم نہ ہو، نہ ہی وہ کتّوں کے پیدا کئے جانے کے جواز سے بہرآور تھے۔ کتّوں کی تاریخ بھی ازل سے انسانی تہذیب و تمدن سے وابستہ رہی ہے اُن کی وفاداری اصحابِ کہف کے ساتھ بھی تھی اور آج بھی قائم و دائم ہے۔ اس قدیم صحبت کے ماثرات یوں ہوئے کہ کتّوں کی چیدہ چیدہ صلاحیتوں نے حضرتِ انسان کو گاہے گاہے متاثر کیا اور حضرتِ انسان اسے قبول کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنے ہی منہ سے گالیوں کے اخراج میں بھی کتوں کی مشابہت سے باز نہیں آتا مثلاً کتوں کی طرح پیدا کرنا، کتّوں کی طرح زبان لٹکانا، کتّوں کی طرح لڑنا، کتّوں کی طرح دیکھنا، کتّوں کی طرح کان کھڑے رکھنا، کتّوں کی طرح بھونکنا، کتّوں کی طرح لالچی ہونا، کتّوں کی طرح ٹوٹ پڑنا، کتّوں کی طرح تلوے چاٹنا، کتّوں کی طرح دم ہلانا، کتا کمینہ ہونا، کتّوں کی طرح ٹانگ اُٹھا کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بالآخر کتّوں کی موت مر جانا۔ گو کتّوں کے لیے مذکورہ امور زندگی کے معمول کا حصّہ ہیں مگر انسان کے لیے اس قسم کی تشبیہات اور استعارات یا تو منفی جذبات کے اظہار کے لیے کئے جاتے ہیں یا گالی اور دشنام طرازی کے لیے۔ سوچئے اگر کتّے نہ ہوتے تو ہمیں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کہاں بھٹکنا پڑتا۔ بہر حال مذکورہ بالا ناپسندیدہ اشغال ایسے ہیں جو نہ صرف انسانی اعادات و اطوار کا حصّہ بن جاتے ہیں بلکہ بشری خصائل میں بھی در آتے ہیں۔ جو یقیناً بُری صحبت کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتّے ہم پر منحصر ہیں یا ہم کتّوں پر۔

www.urduchannel.in

کتے میں وہ تمام خصائل موجود ہوتے ہیں جو کسی درندے کا خاصہ ہیں مگر ہزار لاتیں، جوتیاں، پتھر، لاٹھیاں اور گھونسے کھا کر بھی یہ پالتو جانور بنا انسانی بستیوں میں اپنی وفاداری کی مثال بننے کی خاطر انسانی خوف کو زندہ کرنے اور ان پر بھونکنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اسے گلی کوچوں کی آوارگی با آسانی راس نہیں آتی کیوں کہ کتا اپنی ہی گلی میں شیر ہوتا ہے اور دیگر گلیوں میں دم دبا کر بھاگ کھڑے ہونے میں عافیت جانتا ہے۔ کتوں میں ایک عادت اور بھی بُری ہے جو کتے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں اور جو کتے کاٹتے ہیں وہ بھونک بھونک کر اس فعل کا اعلان کرنا عبث جانتے ہیں۔ مگر جسے کاٹ لیں اُس غریب کے پیٹ میں چودہ انجکشن پیوست کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ بشکل دیگر اسے ہائیڈروفوبیا ہو جاتا ہے اور پانی سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے چچا غالبؔ نے ارشاد فرمایا

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ   ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

کتوں میں دوسری بُری عادت ہوتی ہے کہ یہ سیدھے کا منہ چاٹنا اپنا فرض جانتے ہیں۔ لہٰذا اس خوف سے لوگوں نے سیدھی راہ ترک کر دی۔ کتے فقیروں کو بھی بھونکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ فارسی نہیں جانتے کہ ’آوازِ سگاں کم نہ کند رزق گدا را‘۔ یوں تو کتوں کے ہاضمے سے متعلق کبھی کوئی شکایت تو نہیں ملی مگر معروف ہے کہ کتے کو گھی اور بعض اوقات کھیر ہضم نہیں ہوتی ہے۔ یہ صرف حضرتِ انسان کا خاصہ ہے کہ سب کچھ ڈکار جانے پر بھی تہی دست اور تہی داماں بلکہ ناشکرا ہے۔ کتوں میں یہ بھی عیب ہے کہ وہ اپنے ہم جنس پر ہی بھونکتا ہے۔ گویا جس نے بھونکنا سکھایا اُسے ہی کاٹنے دوڑے۔ کتوں سے ہاتھی کی دشمنی کی کوئی مسلم تاریخ تو نہیں ہے مگر کہا جاتا ہے، ’کتا بھونکے ہزار ہاتھی چلے بزار‘ کتوں کو ایسے عمل سے گریز کرنا چاہیے جن سے اُن کی وقعت کم ہوتی ہو۔ مگر کیا کریں کتے کی دُم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔

www.urduchannel.in

کتے کو اپنی وفاداری، حساسیت اور احساس ذمہ داری کا بے حد خیال ہوتا ہے مگر کتا ان محاسن کے ذریعے انسانی روزگار پر بڑا ظلم کرتا ہے۔ کتا اپنے مجازی مالک کی بلا معاوضہ محافظت پر اس قدر پابندی اور وفاداری سے مامور ہوتا ہے کہ ملازمین کے لیے باعثِ عبرت ہے۔ اُسے نہ تو ہفتہ واری تعطیل درکار ہے نہ شادی بیاہ یا موت میت میں شرکت کے لیے رخصت، نہ اسے تنخواہ کی طلب ہے نہ اس میں اضافے کا انتظار، نہ P.F. سے غرض ہے نہ گریجویٹی کی طمع، نہ مہنگائی بھتوں کے لیے جلوس و دھرنوں کی یلغار ہے نہ پینشن سے سروکار۔ کتوں کی اسی دیانت دارانہ مفت خدمات نے نجانے کتنے گورکھے، جاگلیوں، چوکیداروں حتیٰ کہ تربیت یافتہ بندوق بردار سکیورٹی گارڈز کے روزگاروں پر دن دہاڑے ڈاکا ڈالا ہے۔ جس سے شرح بے روزگاری میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ادھر کتوں کی انکساری اور دل نوازی ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے غذائی وظیفہ کے لیے اپنے کنجوس مجازی مالک کی بھاری جیبوں پر مزید بوجھ اس خوف سے نہیں ڈالتے کہ یہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ بلکہ خود ہی حضرت انسان کی جھوٹن کھا کر یا چھوٹے موٹے جانداروں اور حشرات الارض کا شکار کر کے شکم کی آگ بجھا لیتے ہیں۔ پھر بھی اپنے مالک کا اسقدر پرتپاک استقبال دم ہلا کر، تلوے چاٹ کر اور ارد گرد گھوم کر ممنونیت کا والہانہ اظہار کرتے ہیں کہ رسمی شکریے کا تکلف از خود بے معنی ہو رہتا ہے۔

کچھ کتے قرار واقعی بدنصیب ہوتے ہیں جیسے دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ یہی بدنصیبی کبھی انسانوں میں در آتی ہے۔ جیسے بہن کے گھر بھائی کتا اور ساس کے گھر میں جمائی (داماد) کتا۔ کچھ لوگ اپنے مہمانوں سے حسن سلوک نہیں کرتے شاید انہیں پتہ نہیں ہوتا کہ گھر آئے کتے کو بھی نہیں نکالتے۔ کتے میں کچھ عناصر نفاست پسندی کے ہوتے ہیں اس لیے انسانوں کو مثال دی جاتی ہے کہ کتا بھی دم ہلا کر بیٹھتا ہے۔ جن حضرات کو کتے کے بھونکنے اور کاٹنے سے

خوف آتا ہے یا وہ ماضی میں ایسے تجربے سے دوچار ہو چکے ہیں تو وہ راستے بدل بدل کر اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں کہ کتّا نہ دیکھے گا نہ بھونکے گا۔ مگر کتّوں کو رذیل، حقیر اور کم تر مخلوق سمجھنا کم علمی کی دلالت ہے۔ کتّوں کی اعلیٰ نسلیں ایسی آسائشوں اور سہولیات کی عادی ہوتی ہیں کہ عام انسان کے لیے حسرت و یاس کا ساماں ہوتی ہیں۔ یہ بھی انسان کا اپنے ہم جنس سے ان کہا انتقام ہے کہ کتّوں کی اعلیٰ نسل خوبصورت حسیناؤں کی گداز بانہوں میں محوِ خواب ہوتی ہیں۔ کتّے ان حسینوں کے ہمہ وقت ساتھ ہوتے ہیں۔ خوبصورت تیز رفتار کاروں میں حسینوں کے ہم نشین ہوتے ہیں۔ جنھیں امراء کی طرح ستارہ ہوٹلوں میں خاطر مدارت وضیافت کے مواقع میسر آتے ہیں۔ شاید اسی امر کو کہتے ہیں آخر کتّوں کے دن بھی پلٹتے ہیں۔

کتّوں کی حساسیت خصوصاً قوتِ شامہ و سامعہ اسقدر تیز ہوتی ہے کہ محکمۂ سراغ رسانی کو بھی کتّوں کے آگے دم ہلانا پڑتا ہے۔ کتّوں کے ذریعے ہی وہ لاکھوں کی بھیڑ میں بھی خاطی کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ کتّوں کی شکاری مہارت سے متاثر ہو کر ہی راجے مہاراجے شکار کے لیے کتّوں کو نہ صرف تربیت دیتے تھے بلکہ انہیں کے ذریعے شکار کیا کرتے تھے اور شکاروں پر بندوق رکھ کر اپنی تصویر بنواتے تھے۔

اخیر میں کتّوں کی نفسیات پر بھی خامہ فرسائی کر دینا سامعین وقارئین کے لیے مفید ہوگا۔ کتّا جب نیچی آواز میں غراتا ہے تو وہ آپ کے ردِ عمل کا منتظر ہوتا ہے اگر آپ اس سے خائف ہو گئے تو فوراً بھونک کر حاوی ہو جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کتّا جب دور سے بھونکتا ہے تو وہ خود بھی آپ سے خوفزدہ ہے اور دفعِ خوف کے لیے وہ بھونک بھونک کر اپنی تسلّی کر لیتا ہے کتّا جب آپ پر لپکے اور کاٹنے دوڑے تو جم کر کھڑے رہیں اور خوف سے بھاگنے کی غلطی نہ کریں ورنہ کتّا کاٹ کھاتا ہے۔ کتّے اکثر و بیشتر راتوں کو غول کی شکل میں ہی اپنی دہشت گردی اور جرأت کا

www.urduchannel.in

مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر آپ زور زور سے باتیں کرتے یا گیت گاتے گزر جائیں تو کتّوں کے عتاب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چونکہ کتّے پر یہ باور ہو جاتا ہے کہ آپ چور نہیں ہیں۔ ویسے لاٹھی یا پتھر کی موجودگی بھی کتّوں سے حفاظت کے لیے کافی ہے۔

۲۵۔محبوب آپ کے قدموں میں.......

ان دنوں دافع بلیات یعنی گنڈے تعویز کی صنعت نے دیگر تمام صنعات کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔اس میں یہ بہت بڑے سرمائے کی ضرورت، نہ مزدوروں اور کارندوں کی حاجت، نہ خرید وفروخت کی زحمت، نہ بازار کے نشیب وفراز کی شکایت،بس ہر سمت سے رقومات، تحفے، ھدیئے اور تبرکات کی آمد آمد ہے۔نیازمندوں کی قطاریں، راشن دوکانوں کو بھی شرمندہ کردیں۔ ایسی بھیڑ عامل حضرات کے آستانوں کی زینت تھی اب شناخت ہو چلی ہے۔گویا مفت میں راشن تقسیم ہو رہا ہو۔خوف، وسوسے، نظر بد، جادو، ٹونا، اوپر کے اثرات کسی نے کچھ کردیا ہے۔ان باتوں کے خوف سے ضعیف العتقاد مرد تو کم خواتین کی اکثرت انہیں عامل حضرات کے آستانوں پر حاضری لگانے اور مدد طلب کرنے پر مجبور نظر آتی ہے۔عموماً خواتین عامل حضرات کو ہی اپنا حاجت روا، مشکل کشا، مختارکل اور شافع کے علاوہ قادرِ المطلق بھی تسلیم کرنے کی فاش غلطیاں کرنے کے باوجود نازاں نظر آتی ہیں۔اس توہم پرستی اور ضعیف العتقادی نے عامل حضرات کی وضع قطع، حلئے اور روش پر بھی خاصہ اثر ڈالا ہے۔بلکہ اب یہ خود ساختہ فقیر و درویش حضرات جنہیں گوشہ نشین اور حب الدنیا سے برگشتہ ہونے کا دعویٰ ہے وہ بڑے بڑے کاروباروں کے خاموش شریک، بڑی زمینات، سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات کے خزینوں کی ملکیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان کے ٹھاٹھ باٹھ اور معیارِ حیات بھی عام انسان کے لیے قابل رشک ہوتا ہے۔جس طرح الف لیلوی اور دیو مالائی داستانوں میں چراغ رگڑتے ہی جن برآمد ہوتا ہے اور منہ مانگی مراد چشم زدن میں برلاتا ہے، عین اسی طرح ان عامل حضرات کو بھی نیازمندوں کی نفسیاتی کمزوری کا جن ہاتھ آ گیا ہے جس سے وہ ہر قسم کا فیض اور مادی وسائل کی لذت کشید کرتے ہیں۔

www.urduchannel.in

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

خواتین عموماً ان کاموں کے لیے اپنے اہل خانہ سے چھپ چھپا کر محلے، پڑوس اور رشتہ داروں سے راز داری برتتے ہوئے انہیں گمراہ کر کے ایسے راہزن حضرات کے ہاں بلالحاظ ملت ومسلک حاضر ہوتی ہیں۔گھنٹوں انتظار کی کوفت بھی گوارا کر لیتی ہے۔اپنی باری آنے پر ان کو اپنے مسائل بتاتی ہیں۔ان سے تعویزات لے کر خطیر رقوم بطور نذرانہ پیش کرتی ہیں۔حالاں کہ خواتین فطرتاً بے حد کنجوس واقع ہوئی ہیں۔مگر یہاں بٹوہ ڈھیلا کرنے میں وہ بالکل عار محسوس نہیں کرتیں۔بعض اوقات وہ اپنی عزیز سے عزیز ترین شئے بھی عامل حضرات پر وار دیتی ہیں۔حتیٰ کہ جان سے زیادہ قیمتی زیورات بھی عامل حضرات کی چرب زبانی اور وثوق کے صدقے قربان کر دیتی ہیں اگر رقم کم پڑ جائے تو اہل خانہ سے جھوٹے حیلے بہانے تراش کر اضافی رقم جمع کرتی ہیں۔ان کے ہر جھوٹے دلاسے اور فرضی تیقن کو آمنا صدقنا کہتی ہیں۔ان تمام کاموں کے پس پشت ان کی آپسی رنجش، حسد، جلن، رقابت اور نفرت ہوتی ہے۔خوف، وسوسہ، عدم تحفظ کا احساس، شیطان کا بڑا کارگر ہتھیار رہے۔جس سے وہ انسانوں کو اپنے دام فریب میں پھنسالیتا ہے۔چند خواتین کو تو یہ بھی کہتے سنا گیا کہ جیسے مختلف امراض کے مختلف معالج ہوتے ہیں لہٰذا ٹونے ٹوٹکے کا علاج بھی کسی ماہر عامل صاحب سے کروالینا چاہیے۔بہر حال کچھ افاقہ ہو نہ ہو یہ بات اپنی راز دار سہیلی کے گوش گزار کر کے اُسے بھی عامل صاحب کا مستقل گاہک بنانے میں وہ بڑی فعال اور پیش پیش ہوتی ہے۔بجذبہ خیر سگالی وحسنِ ظن یہ خدمت کی جاتی ہے۔

پہلے پہل تو تعویز نویسی کے بھی آداب واطوار ہوا کرتے تھے۔تعویز نویس عامل حضرات غسل ووضو سے فراغت کے بعد طویل وظائف کا ورد کرتے پھر بطور سیاہی زعفران، ہلدی یا دیگر اشیاء کے محلول سے مخصوص قمری ساعتوں میں خصوصی مقصد کے لیے نقوش، آیات، جدول،

خاکے، اسم اعظم اور جنات کو مخاطب کر کے فارسی عبارات نویسی (جن کا ماخذ علم نجوم، علم الاعداد اور علم غیب ہوتا ہے جن کی تعلیم ہی حرام ہے) فرماتے تھے۔ مگر اب ان تعویزات کے نیاز مند لاکھوں میں ہیں۔ لہٰذا اب بلا تکلف سارا مواد باقاعدہ آفسیٹ پریس پر چھپے چھپائے نسخے نہ صرف تھوک کے بھاؤ بازار میں دستیاب ہیں بلکہ ہنگامی حالات میں فوٹو کاپی بھی بروئے کار لائی جاتی ہے۔ ؎ ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے

پھونک جھاڑ کے لیے جو روایتی اشیاء جو لازم تھیں ان میں معمولی سی تخفیف و اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ البتہ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اشیائے خوردنی اور اشیائے غیر خوردنی۔ اشیائے خوردنی میں پانی، تیل، شکر، کلونجی، رائی، لیمو، ہری مرچیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ جن پر دَم کر کے غیر محسوس طور پر مستعمل کو کھلا کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ مجرب نسخہ اپنا اثر دکھائے گا۔ اشیائے غیر خوردنی میں بھلاواں، لوبان، اگربتیاں، سوئیاں، ناگ پھنی کی کیل، شمشان گھاٹ کی راکھ، قبرستان کی مٹّی، مردہ اجسام کی ہڈیاں اور نہ جانے کیا کیا مکروہات اور غلاظت منگوائی جاتی ہے۔ نیاز مند مرد خواتین جب ان اشیاء کے حصول میں ناکام اور عاجز ہو جائیں تو عامل حضرات کے چیلے خطیر رقومات کے معاوضے پر مذکورہ خدمات بجالاتے ہیں۔ گویا

؎ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

نیاز مند کی نیاز برآئے، عامل صاحب کا کاروبار پھولے پھلے اور چیلوں کو بھی شکم پروری کا موقع فراہم ہو جائے تو کیا کہنے ہیں۔ اس طریقۂ علاج کی دو شاخیں ہیں ایک رحمانی اور دوسرا سفلی جواز خود اسم بامسمّٰی ہیں۔ ہر دو شعبوں میں عامل حضرات کی بڑی مانگ اور آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہر دو شعبوں کے ماہرین اشتہار بازی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے پُرکشش جھانسوں میں صد فیصد کامیابی کی گیارنٹی، شرطیہ علاج اور مکمل اطمینان کی ضمانت۔ رقم

www.urduchannel.in

واپسی کے وعدے اور ان سے بھی متجاوز وعدے شامل ہوتے ہیں۔ نافرمان اولاد کو قابو کرنے کا نسخہ، داماد یا شوہر کو قابو کرنے کا نسخہ، ظالم سسر وساس سے بہو کو نجات کا نسخہ، عشق میں ناکامی کا نسخہ، کاروبار میں ناکامی کا نسخہ۔ محبوبہ پر قابو پانے کا نسخہ، محبوبہ کے والدین کو قابو کرنے کا نسخہ، بہو کے مظالم سے ساس یا سسر کے نجات کا نسخہ گویا ہر شکایت کا تیر بہدف مداوا ان کو دساختہ عاملوں کے پاس موجود ہے گویا تقدیر انہی کے حکم سے گردش کرتی ہو۔ ان کے دعوے تو شرک اور خدائی کے مجاز معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بلند بانگ دعوؤں میں اولاد کے خواہشمند، نرینہ اولاد کے طالب، قرض سے نجات کے خوستگار، مہلک امراض میں مبتلا افراد، روزگار کے خواہشمند حضرات، بیرونِ ملک جانے کے عازم بھی کچی ڈور میں بندھے کھنچے چلے آتے ہیں۔ جن کے ہاں آسیب، جن، پری، بھوت، خبیث اور ابلیس کے علاوہ جنات کی شرانگیزیاں ہوتی ہیں، وہ بندش اتارے اور دافع بلیات کے نام پر خطیر رقومات کا نہ صرف اسراف کرتے ہیں بلکہ عامل حضرات انکا وظیفہ بند معاہدہ کر لیتے ہیں اور انہیں قلاش اور محتاج ہونے تک نہیں چھوڑتے ہماری ضعیف العتقادی اور نقص ایمان وتوکل نے ہمیں در در کا دست نگر بنا دیا ہے ہم نے ام الکتاب کو چھوڑ کر مفروضہ نسخوں کا اعتبار کیا ہے۔ ہم نے اصل حاجت روا، مشکل کشا اور قادر المطلق کو فراموش کر کے بہروپیئے نقال اور فریبیوں پر تکیہ کر رکھا ہے تو ذلت وخواری کیوں کر ہمارا مقدر نہیں بنے گی؟

ایک حقیقی واقعہ بھی گوش گذار کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ ایک مظلوم بہو نے حضرت عامل کو اپنا مژدہ سنایا کہ میری ساس نہایت خطرناک، ظالم، شعلہ بیاں اور تیز طرار ہے۔ مجھے کوئی ایسا تعویز دیں کہ مَیں ساس کے عتاب سے محفوظ رہوں۔ عامل صاحب نے غور و فکر کیا۔ داڑھی کھجائی پھر اندر اپنے حجرے میں داخل ہو گئے۔ کچھ دیر میں وہ موم جامے میں بند تعویز لے کر نمودار ہوئے۔ بی بی جب تمہاری ساس غصّہ کرے تو اس تعویز کو زبان تلے دبالینا۔ بی بی نے مطلوبہ معاوضہ عامل

صاحب کو ادا کیا اور رخصت ہوگئیں۔ ادھر جب جب ساس کا پارہ چڑھتا اور وہ بہو پر غصّہ کرتی تو بہو کسی نہ کسی بہانے مذکورہ تعویز زبان کے تلے دبائے سنتی رہتی۔ رفتہ رفتہ بہو کی سعادتمندی نے ساس کو متاثر کیا اس قدر کہ ساس بہو کی گرویدہ ہوگئی۔ ادھر بہو کا اعتقاد اپنے عامل صاحب پر پہلے کی بہ نسبت اور مضبوط تھا۔ ایک روز شوہر نے بی بی کو چھیڑتے ہوئے پوچھا ''کیا بات ہے بیگم آج کل ہماری امّی جان سے آپ کی پانی پت نہیں ہو رہی ہے؟ بیگم نے چپکے سے شوہر نامدار کو سارا مژدہ کہہ سنایا۔ شوہر نامدار بھی تعلیم یافتہ پروفیسر تھے۔ کانوں سنی بات کا یقین نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے تعویز کو موم جامے سے آزاد کیا تو کورے کاغذ کے سوا کچھ نہ تھا۔

۲۶۔ محنت کرے مرغا........

کہتے ہیں ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے جو بالخصوص اُس بیچارے کی بیوی ہی ہوتی ہے۔ یوں بھی ماں کی تربیت، نگہداشت اور پرورش، بہنوں کی محبت اور اعانت کی بہ نسبت بیوی کے نخرے، غمزے، عشوے اور ناز و اداؤں کی کشش شوہر کو اپنے ماضی کی حسین یادوں سے برگشتہ کر کے فقط زلف گرہ گیر کا اسیر بنا دیتی ہے۔ بیوی کے نرم و نازک ہاتھوں میں اپنے کامیاب شوہر کی لگام ہوتی ہے۔ جس طرح ریس کا گھوڑا خواہ جاں توڑ محنت و مشقت کر کے حتیٰ کے جان کی بازی بھی لگا کر فتح یاب ہو بھی جائے تو بالآخر گھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جسے تمام انعام و اکرام سے مستثنیٰ و مبرّیٰ اصطبل میں باندھ دیا جاتا ہے۔ مگر اصل انعام کا مستحق تو گھوڑے کی پشت پر سوار لگام بردار ہوتا ہے۔ جو اسے اپنی منشا کے مطابق ہانکتا اور قابو کرتا ہے اور کامیابی کی منزل تک لے جاتا ہے۔ عین اسی طرح شوہر کی ہر محنت و مشقت، ذہانت و حکمت عملی یا دانشمندی یا جدوجہد اگرچہ کامیابی کی ضامن سہی مگر اصل اعزاز و انعام کی مستحق تو لگام بردار بیوی ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ جس کی ہاتھوں میں اصل باگ ڈور ہوتی ہے۔ یہ بھی انسانی عادات کا حصّہ ہے کہ گھوڑوں کو چشمے پہنائے جاتے ہیں تا کہ وہ صرف سامنے اور سیدھے راستے پر چلیں۔ ادھر، ادھر منہ مارنے یا منہ موڑنے سے گریز کریں۔ بغاوت کی شکل میں چابک یا ہنٹر اپنا کمال دکھانے سے بعض نہیں آتا۔ بیویوں کی بھی شدید دلی خواہش ہے کہ اُن کے شوہروں کے لیے بھی گھوڑوں کی طرح کارآمد چشمے استعمال کئے جائیں تا کہ وہ مندرجہ بالا حرکات و سکنات سے باز آجائیں۔

یوں بھی شوہر کا صبر و تحمل، تدبر و تفکر اور حکمت عملی بیوی کی نگاہ میں نااہلی اور حیلے بہانے تراشنے کے الزام سے کم نہیں ہوتا۔ شوہر کی سست روی اور آرام پسندی کو نکھٹوپن پر

www.urduchannel.in

محمول کرنا، زنانہ عادات وسیرت کا حصّہ ہے۔اسی طرح شوہرِ نامدار کی فطری صلاحیت، جسمانی، ذہنی، علمی وعملی استعداد بیوی کی گز بھر لمبی زبان تلے دب کر فنا ہو جاتی ہے۔ بیوی اپنی مخصوص زنانہ صلاحیتوں مثلاً شعلہ بیانیاں، زبان درازیاں اور نت نئے القاب کی بنیاد پر شوہر اور اُس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کامیابی کی حد تک کرتی ہیں۔اُسے توقع تو بجا صد فی صد یقین ہوتا ہے کہ اُس کی آرا اور فرمائشوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ورنہ یا تو روٹھنے، ناراض ہونے، تجاہل عارفانہ برتنے، نخرے کرنے یا پھر احسان جتانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے یا پھر شکایتوں کے انبار لگانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا جاتا ہے۔نتیجتاً گھر کے ماحول میں تلخی اور ناچاقی در آتی ہے۔لہٰذا اس خوف سے شوہر کو اپنے سر تال اور لے کا میزانیہ اپنی عزیز از جان بیوی کے مزاج سے ہم آہنگ کرنا مجبوری بن جاتا ہے۔بصورت دیگر ناگہانی شامت آن پڑنے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

شوہر اگر چہ اپنے کسی دفتری کام میں مشغول ہو یا ٹی۔وی۔اخبارات، رسائل سے شغل فرما رہا ہو تو اُس کی یہ حرکت بیوی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ بیوی فوراً اُسے اپنے کسی نہ کسی کام میں مشغول کر دینے میں بڑی فوقیت محسوس کرتی ہے اور اپنی اس کوشش پر دل ہی دل میں نازاں اور شاداں بھی ہوتی ہے۔شوہر اگر یار باش ہو اور عیش وعشرت کی محفلیں سجاتا ہو تو بیوی کو اس کے نکمے دوستوں سے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔اس دوران شوہر سے نت نئی فرمائشوں اور تقاضوں کی قطار سودا سلف کی ہنگامی ضرورت یا کسی شئے کی بے وقت مرمت جیسے کام کروالینا بھی زنانہ فطینیت اور ذہانت کی علامت ہے۔خواہ اس بے تکے کام کا معیار شوہرِ نامدار کی سبکی کی وجہ اور مزاج وطبیعت کے شایانِ شان ہو یا نہ ہو۔ بیوی ایسے وقت شوہر کے صبر، قناعت، خاموشی اور فرمانبرداری کا امتحان لے کر خوب محظوظ ہوتی ہے۔شوہر کے ذاتی اخراجات بشمول پان، سگریٹ، زردہ، گٹکا اور بیڑی وغیرہم کا بل اُس کی اپنی آمدنی یا تنخواہ کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا مگر بیوی کمال

www.urduchannel.in

ہوشیاری سے ساری رقم کو اپنا حق ملکیت جان کر سارے اخراجات کا ماہانہ تخمینہ یا گوشوارہ ترتیب دیتی ہے کہ اس ماہ کا بجٹ کن خطوط پر گزارنا ہوگا۔مگر بے چارے شوہر کے ذاتی اخراجات کا قافیہ ہمیشہ تنگ ہو جاتا ہے مگر وہ بے چارہ تنگ دامانی کا شکوہ گلا کئے بغیر بڑی قناعت وکفایت کی حکمت عملی پر کاربند رہ کر سعادت مند شوہر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ پھر بھی وہ اتنی آسانی سے بیوی کے عتاب سے بچ نہیں سکتا۔ بیوی کمال رازداری سے جامہ تلاشی کے دوران حسب ضرورت ریزگاریوں کے ساتھ ساتھ بڑے کرنسی نوٹوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیتی ہے۔ بیوی کی اس دراندازی پر شوہر بحالت مجبوری زیرِ لب مسکرا کر ان تمام شرارتوں کو نظرانداز کرنے میں ہی عافیت جانتا ہے اور بیوی کے نزدیک اُونٹ نما شوہر کو پہاڑ کے نیچے لانے کی خوشی بھی دیدنی ہوتی ہے۔

شوہر کی کامیابی بھی کوئی اتفاقی امر نہیں ہوتا بلکہ شوہر کی کامیابی کے پس پشت کچھ نفسیاتی کمزوریاں اور بعض وقت انا کا مسئلہ کارفرما ہوتا ہے۔شوہر کو طعنے تشنے اپنی ہزیمت اور ذلت کا خوف بھی محو جستجو اور مسلسل کامیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔مجبوری کچھ یوں بھی کہ بالآخر شوہر کو لوٹ کر تو اپنے گھر ہی آنا ہوتا ہے۔ جہاں بیوی پہلے سے کیل کانٹوں سے لیس منتظر بیٹھی ہوتی ہے۔ابتدا میں نیم سوالات و نیم جوابات کا تبادلہ ہوتا ہے۔شوہر کو بھی بخوبی علم ہوتا ہے کہ معمولات اور موقع محل کے اعتبار سے کون کون سے ہتھیار و اوزار بیوی کے زیرِ استعمال ہوتے ہیں اور اُن کے مآثرات کس ذلت، ہزیمت و پشیمانی کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں۔ان کا رگر ہتھیاروں میں بیلن، چمچے، کفگیر، چمٹے، کنگھی اور جاروب جیسے عمومی ہتھیار اور شدید مہلک ترین ہتھیار جیسے چھری، کانٹے، چاقو اور قینچی وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔لہٰذا بے چارہ شوہر اس شامت جاں سے تحفظ کی خاطر اور اپنی عزت و آبرو ناموس کے حفظ ما تقدم کے لیے اب کامیاب بھی نہ ہو تو آخر کیا کرے؟

۲۷۔جماہیاں

جماہی لینا ہمارا غیر اختیاری، پیدائشی حق ہے۔ اسے ہم گود سے گور تک کسی بھی قیمت پر ترک نہیں کرتے۔ جب بات گلے سے نہ اُترے تو ہمارا جسم اپنا ردِعمل جماہی کی شکل میں ظاہر کر دیتا ہے۔ جو دونوں سامنے کے دانتوں کے مابین زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کر کے اعضاء و جوارح میں تشنج پیدا کر کے زائد ہوا کے اخراج کی شکل میں برآمد ہوتی ہے۔ جب سامع کی قوتِ برداشت کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک اُٹھے تو جماہی کا تازیانہ لازمی ہو جاتا ہے۔ جو سامع کی بیزاری، غفلت اور عدم توجہی کل ملا کر جسمانی طور پر حاضر ہوتے ہوئے ذہنی طور پر غائب ہونے کا بین ثبوت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اشارہ قابل فہم ہونا چاہیے کہ سامع کی طبیعت اب حالات کی یکسانی سے فرار کی متلاشی ہے۔ لہٰذا اسے بخش دیا جائے۔ اگر خطیب کا اعجاز تقریر ہے تو سامع کا حق ہے کہ وہ بھی جماہیاں لیتا رہے۔

بعض اوقات بطور سامع اپنے خطیب یا مخاطب حضرات کی خامہ فرسائیوں سے متفق ہونا تو کجا ان سے اُوب جاتے ہیں اور ان سے فرار کے حربے تلاش کرتے ہیں۔ جہاں اعضاء و جوارح سے احتجاج المختصر تشدد کا زور نہیں چلتا تو کم از کم درجہ کا خاموش احتجاج جمائی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے یوں بھی سنجیدہ محفلوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے جماہی سے زیادہ موثر اور کارگر بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ جسے ہم اصطلاحی زبان میں حرکاتی و سکناتی ردِعمل یعنی باڈی لینگویج پر محمول کر سکتے ہیں۔

اکثر اوقات جماہیاں میٹھی میٹھی نیند کا پیش خیمہ ہوتی ہیں جو بہر حال ہماری فطری جبلت اور بشری تقاضے کا حصّہ ہیں۔ بالفرض نیند کسی وجہ سے ادھوری رہ جائے تو لامتناہی

www.urduchannel.in

جماہیوں کا سلسلہ تا بستر دراز رہتا ہے۔ اگر نیند اپنی ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہو تو بھی طبیعت کی گرانی کے سبب جماہیاں آتی رہتی ہیں۔ یوں تو جماہیوں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ نا ان کی آمد و رفت کے قواعد مقرر ہیں نہ ہی نشست و برخاست کے اصول وضع کئے گئے ہیں، نہ ہی آداب و اطوار کا پتہ ہوتا ہے۔ تجربات شاہد ہیں جماہیاں اکثر اُن اوقات میں وارد ہوتی ہیں جہاں اُن کی آمد غیر متوقع ہوتی ہے بلکہ معیوب تصور کی جاتی ہیں۔ مثلاً امتحان گاہ میں، لکچر، سیمینار، ورک شاپ کے دوران، سیاسی اجلاس میں، خطبہ جمعہ کے دوران، کثرت سے ادبی، شعری و نثری نشستوں میں جہاں سامع اپنے جسم کو ڈھیلا ڈھالا چھوڑ کر ذہن ناتواں پر ناگوار بوجھ ڈالنے میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ خطیب حضرات کو سامعین کی جماہیوں سے سخت پرہیز ہے

جماہیاں عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں پہلی جماہی با آواز کیف و مستی سے بھرپور اور جسمانی کسل مندی کے اخراج کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ دوسرے قسم کی جماہی بے آواز مہذب شائستہ اور جسمانی حرکت کو محدود کرتے ہوئے وارد ہوتی ہے تاکہ شرکائے محفل کو ناگوار نہ گزرے اور محفل کا تقدس بھی پامال نہ ہو۔ یوں تو جماہی لیتے وقت پورا منہ کھولنے اور آنکھیں موند لینے کی روایت خاصی قدیم ہے لیکن جماہی لیتے وقت ہم جوں ہی منہ کھولتے ہیں شیطان منہ میں داخل ہونے کے لیے مستعد ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لیے جماہی لیتے وقت لاحول ولاقوت الا باللہ العلی العظیم پڑھنے کی روایت ہے۔ بعض بے فکرے منہ باہے جماہی کا بھرپور کیف تو لے لیتے ہیں مگر دعا کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔

اکثر مہذب خواتین و حضرات جماہی لیتے وقت منہ پر ہاتھ یا رومال رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں جس سے وہ اپنے دانتوں کی نمائش اور دہانوں کی منظر کشائی سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کی بدولت ان کے مخاطبین بھی کراہیت کی علت سے دو چار نہیں ہوتے۔ ہاتھوں یا رومال

کے استعمال سے وہ شیطان کے راستے میں مخل ہو جاتے ہیں اور شیطان کے شر سے خود بخو محفوظ ہو جاتے ہیں۔ہم تنہائی میں ہوں تو با آواز جماہی کے دوران منہ کھولنے، آنکھیں موندنے اور جسمانی کسل مندی کے اخراج کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔خیر یہ تو تھی تخلیہ کی آزادی۔مگر محفل میں جماہی کے آداب واطوار قدرے تکلف اور تکلیف کا باعث ہیں۔محفل میں جماہی کے دوران آواز کو نگل جانا ہوتا ہے۔پورا منہ کھولنے کی آزادی بھی میسر نہیں ہوتی۔جسمانی حرکات وسکنات کو بھی محدود کرنا پڑتا ہے۔اس کے ساتھ دیگر اخلاقی حدبندیوں کی پاسداری ضروری ہو جاتی ہے۔

جماہیاں بھی اپنے مزاج کی مالک ہیں جو تقریباً لا علاج ہیں۔آج تک ہم نے نہ ان کے مخصوص ڈاکٹر، طریقہ علاج اور کسی قسم کے انسدادی ٹیکے اور ویکسن سنے۔اس کا بس ایک ہی دیسی علاج دیکھا گیا ہے وہ ہے چائے نوشی۔نیند اور جماہی سے غالب حضرات کو یا تو بستر کا رخ کرتے دیکھا ہے یا تو چائے خانوں کا۔شاید میڈیکل سائنس نے اس طرف توجہ کرنے میں کچھ کجی کر دی ہوگی۔ورنہ کس شعبہ ہائے امراض کو بخشا گیا ہے آپ بخوبی واقف ہیں۔آپ کے چہرے پر اُڑتی ہوائیوں اور جماہیوں کو دیکھ کر دانشمندی کا اشارہ ضرور ہے کہ آپ کو بھی فوراً بخش دیا جائے۔

www.urduchannel.in

۲۸۔ناک بڑی حیرت ناک

قدرت کے بھید قدرت ہی جانے کہ اس نے بنی نوع انسان کو آنکھیں، کان، ہاتھ، پنجے، انگوٹھے، انگشت شہادت، پیر، زانو، پنڈلیاں، گھٹنے، شانے کہنیاں اور ٹخنے جفت بلکہ جوڑی سے عطا فرمائے۔مگر ناک صرف ایک ہی عنایت فرمائی۔شاید یہ مصلحانہ عمل ناک کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ہو ناک کے مسئلے کو مقدم رکھنا ہو، صورت کی پہچان مقصود ہو یا ناک بہر حال نیچی نہ رہے، غالباً یہی وجوہات کارفرماں ہوں۔بہرکیف ناک چہرے کا عنوان ہے۔ناک قبیلے، علاقائیت حتیٰ کہ براعظموں کی پہچان ہے۔ناک زنانہ حسن اور مردانہ وجاہت کا میزان ہے۔ناک عمل تنفس اور حیات کا امکان ہے۔ناک سے عزت وناموس وآن ہے۔ناک قوتِ شامہ کی شان ہے۔ناک شخصیت کے شایانِ شان ہے۔قدرت نے ناک کو ساخت کے اعتبار سے مختلف سانچوں میں ڈھال کر گول، چپٹی، استوانی، لمبی، چھوٹی، بڑی، کھڑی اور بیٹھی شکل دے کر جہاں اپنی کاریگری اور صناعی کا میعار مقرر فرمایا وہیں حسن ووجاہت کی تخصیص کا اعتبار و پیمانہ بھی معین فرمایا۔جوناک بردار کی خوبصورتی کا پتہ دیتی ہے۔

حسی عضوناک کے ان طبعی خصوصیات سے بالاتر صفاتی کمالات ہیں جو ناک کی معنویت اور فضیلت میں رطب اللسان ہیں۔ناک ٹپکنے، ناک کٹوانے، ناک لگانے، ناک لمبی کرنے، ناک کاٹنے، ناک جھاڑنے، ناک نیچی کرنے، ناک اونچی کرنے، ناک رگڑنے، ناک میں دَم کرنے کے علاوہ، ناکوں چنے چبانے جیسے ثقیل اور دشوار گزار کاموں میں بھی یکساں کارآمد ہے۔ناک ٹیکے بغیر خدا کے حضور سجدے کا تصور ناممکن ہے۔وہیں وضو کے لیے ناک جھاڑنا یا ناک صاف کرنا ایک اہم امر ہے۔ناک کی صفائی اس لیے بھی لازمی ہے کہ ناک کی

نفاست پسندی مشہور ہے اور اسے مکھیوں کے بیٹھنے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔لہٰذا ناک پر مکھیوں کا بیٹھنا با آسانی گوارا نہیں کیا جاتا۔ناک بردار جب غصہ سے غضب ناک ہو اُٹھتا ہے تو ناک بھوں چڑھا کر اپنے غصّے کا اخراج کر لیتا ہے۔ناک کی یہ عادت تقریباً سبھی کو ناگوار گزرتی ہے کہ ہر اچھی بات میں ناک کا مسئلہ ٹانگ اڑا کر بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا ہے۔ایسی حرکت کرنے والے مصاحبین کو وزرا و سیاست دان اپنی ناک کا بال تصور کرتے ہیں۔ناک بردار کو اپنی ناک کے نیچے سرزد ہونے والے عمل سے عموماً لا علمی اور بے خبری ہی رہتی ہے اور کیوں نہ ہو؟ ان کے ساتھ قدرتی مجبوری جو لاحق ہے۔وہ بے چارے عملاً ناکوں تلے دیکھنے کی قدرت ہی کہاں رکھتے ہیں۔بشرطیکہ آئینہ سامنے نہ ہو۔

ناک کی نوک بھی بڑی کارآمد شئے ہے۔سجدے میں ناک کی نوک کا زمین کو مس ہونا خشنودیٔ خداوندی کی سبیل ہے۔ناک کی نوک بیک وقت تکبر غصّہ اور گالیوں کے قیام کا پسندیدہ مقام ہے۔جوں ہی کوئی کام خلاف مرضی ہوا یا کسی کی خطا پر جھٹ غصّہ اور گالیاں ناک کی نوک سے پھسل کر زبان کی نوک پر آپڑتے ہیں پھر وہ منہ و مزاج کا ذائقہ تلخ کر دیتے ہیں۔ناک کی نوک رگڑ کر مطلب براری اور گزارشات کی جاتی ہیں۔ناک کی نوک ٹیک کر معازت بھی طلب کی جاتی ہے۔جہاں زنانہ ناک پر گہنے حسن و زیبائش کی علامت ہیں وہیں بُرے کاموں کی پاداش میں ناک کاٹ کر نکٹا بنانے کی سزا کا رواج بھی خاصہ قدیم ہے۔بیٹیوں،عورتوں اور ماؤں کو گھر کی ناک تصور کیا جاتا ہے۔شاید اسی لیے اُن کی ناکوں کو ڈھک کر پردہ کرنے کی روایت عام ہے۔
ناک کو مختلف مگر چند امراض سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔نزلے اور زکام میں ناک کا سرخ اور آبدار ہونا، چھینکنا اور چھنکنا،ناک کی ہڈی بڑھ جانا،ناک سے نکسیر پھوٹ جانا،ناک میں مسہ یا پھنسی نکل آنا اس کے علاوہ ناک سب سے کم مرمت طلب مگر کارآمد عضو ہے۔دورِ حاضر میں ناک کو عمل جراحی اور پلاسٹک سرجری کے ذریعے سیدھا یا ٹیڑھا کر کے فلمی ستارے اپنی جیب ہلکی کرنے اور بیرون ممالک کی سیر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ بقول جھاپڑ ناگپوری

عیب اس کا سرجری سے چھپانے لگے ہیں ہم
نکٹے کو ناک دار بنانے لگے ہیں ہم

اُردو ادب میں ناک کو تنہا محاوروں اور ضرب الامثال سے ہی رغبت نہیں بلکہ اسے زبان و ادب میں اہم مقام حاصل ہے یہ صنعتِ لاحقہ کی صورت میں ہمیشہ ہمیش زندہ رہے گی۔مثلاً خطرناک،وحشت ناک،عبرت ناک،حیرت ناک،اذیت ناک،دہشت ناک،ہیبت ناک، غم ناک،الم ناک،نم ناک،دردناک،غضب ناک اور تابناک۔نجانے کن کن صفات کی حامل ہوگی یہ معمولی سی ناک۔مگر پولس والے ہوں یا جہاں دیدہ حضرات وہ اپنے مخاطب کی ناک دبا کر منہ کھلوانے کا ہنر خوب جانتے ہیں اور سارے اسرار و منصوبے اگلوا لیتے ہیں۔خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان انہیں قابو کرنے کا ایک ہی کارآمد ذریعے ہے اُن کی ناک میں رسی ڈال کر اُنہیں نکیل بند کر دیا جائے۔محکمہ پولس بھی عادی مجرموں کو مجرمانہ حرکات سے باز رکھنے کے لیے نکیل بند کرتا ہے اور آزاد شخص کے لیے مہارِ بے نکیل جیسے القابات چست کیے جاتے ہیں۔

ناک کی بوالعجبی اور حشر سامانیوں کے کچھ حیرت ناک پہلو اور بھی ہیں۔اگر ناک نہ ہوتی تو عینک یا چشمہ کیا استوار کیا جاتا۔اگر ناک نہ ہوتی تو اگر بتی،عطر،پرفیوم اور مہنگے خوشبودار ذرائع کی صنعت و حرفت بھلا کیوں کر وجود میں آتی۔اگر ناک نہ ہوتی تو نزلے کے وقت رمال اور انہیلروں کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی؟ اگر ناک نہ ہوتی تو حشیش اور گرد کے عادی اپنا نشہ آور مال جسم میں کیسے داخل کرتے؟ اگر ناک نہ ہوتی تو سانسوں کا سلسلہ کیسے رواں دواں ہوتا؟ اگر ناک نہ ہوتی تو انا کے مسائل بغیر کوشش اور افہام و تفہیم کے حل ہو جاتے۔اگر ناک نہ ہوتی تو اُردو ادب کو اتنے کارآمد محاورے اور اس قدر حیرت ناک لاحقہ کیوں کر ہاتھ آتا؟ اگر ناک نہ ہوتی تو خودی اور خودداری کے مسائل بھی نہ ہوتے۔

www.urduchannel.in

رامائن میں دورانِ بن باس رام جی نے پنچوٹی کے مقام پر اُن پر فریفتہ 'سرپنکھا' نامی راکشش خاتون کی ناک 'ناشکا' کاٹ ڈالی تھی۔ اس لیے پنچوٹی کا نام 'ناشک' پڑ گیا۔ یعنی ناشک سے 'ش' حذف کرلیں تو محرک نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس سے سرپنکھا کے بھائی راون کو بہت غصّہ آیا اور راون کے انتقام کی پاداش میں سیتا کو اغوا کرکے شری لنکا کا اسیر بنا دیا گیا اور اس حق و باطل کے معرکے کا محرک بھی ناک ہی بنی۔

ابوالانسان جدِ اعلیٰ حضرت آدمؑ کے جسدِ خاکی میں جب روح پھونکنے کا مرحلہ درپیش تھا تب خالقِ کائنات نے ناک کو ہی منتخب فرمایا۔ جوں ہی روح جسدِ خاکی میں بذریعہ ناک داخل ہوئی تو باوا آدمؑ کو چھینک آگئی۔ تب اُنہوں نے 'الحمدللہ' کہہ کر اپنے مالکِ حقیقی کو شکر کا نذرانہ پیش کیا۔ تب سے آج تک ہم اسی سنت پر کاربند ہیں۔ شیطان مردود نے اللہ سے روگردانی کی اور حضرت آدمؑ کے سامنے ناک ٹیک کر سجدہ کرنے سے منکر ہوا۔ اُس نے اپنی ناک اُونچی کرنی چاہی اور ناک رگڑنے اور ناک ٹیکنے سے ناک کٹ جانے کا اندیشہ حائل ہوا تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اسے عبرت ناک سزا دے کر تاابد ملعون و مطعون قرار دے دیا۔ مگر شیطان نٹکھٹ ہے کہ سوتے ہوئے انسان کی ناک میں بسیرا کرتا ہے۔

ربوبیت اور خدائی کے جھوٹے دعوے دار نمرود کی سزا کا آغاز بھی ناک سے ہوا۔ ایک ادنیٰ سے مچھر نے ناک کے ذریعے نمرود کے دماغ تک رسائی حاصل کرلی پھر وہ حشر برپا کیا کہ سر پر لاکھوں جوتیوں کی ضرب اور اہانت کے بعد بھی تسلی و تشفی راس نہ آئی مگر پھر بھی اس ملعون نے ناک اُونچی رکھ کر تکبر کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کی اور خدا کے حضور ناک ٹیکنے، ناک کٹوانے اور ناک رگڑنے سے گریز کیا۔ ہمیں بھی اپنی ناک کے حفظ ماتقدم کے لیے شب و روز مستعد رہنا چاہیے۔ کہیں کوئی مچھر مکافاتِ عمل کے لیے ناک میں نہ گھس جائے یا خواہ مخواہ ہی ہمیں ناک نیچی کرنی پڑے۔

www.urduchannel.in

۲۹۔ 'پن' کا رنگیلا پن

'پن' کو اُردو ادب کی صرف و نحو میں اصطلاحاً لاحقہ کہا جاتا ہے۔ مگر اس کے محلِ استعمال سے شک ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ کسی بندے کی صفت کا پیمانہ یا مقدار و میزان کا اشاریہ ہے۔ یوں تو 'پن' سے ہمارا واسطہ اس عالمِ رنگ و بو میں وارد ہوتے ہی دائماً پڑ جاتا ہے۔ پھر یہ پن دم چھلّے کی طرح تاحیات ہمارا صفاتی ہم سفر بن کر ہمارا ساتھ نبھاتا ہے۔ بچپن سے لے کر لڑکپن کی منزل کو آتے آتے راہوں میں بھولپن، دیوانہ پن، باولا پن، فربہ پن، دبلا پن، الّو پن، گدھا پن، سیان پن، چالو پن، اُتاولا پن، چلبلا پن اور کنوارا پن جیسے سنگِ میل بھی آتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کو بھی اپنے لڑکپن کی خطاء یوں یاد آجاتی ہے

مَیں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

لڑکپن کا یہ سفر دیوانے پن، البیلے پن، اپنے پن اور بیگانے پن کے مختلف موڑوں سے گزر کر بڑک پن، رنڈوے پن، لاغر پن، بُڈھے پن اور کاہل پن کی سنگلاخ وادیوں سے گزرتا ہوا بالآخر مردہ پن کے عمیق گہرے گڑھے کو پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پن کو تذکیر و تانیث کے امتیازی فرق سے بھی خوب علاقہ ہے۔ حسبِ عادت 'لیڈیز فسٹ' کا نعرہ بلند کرکے خواتین نے کچھ مخصوص پن اپنے ذاتی مصرف کے لیے اُچک لیے جن پر بلاشرکتِ غیرے انہی کا مجاز و اختیار رہے۔ جیسے الھڑ پن، سگھڑ پن، بانکپن، چڑچڑا پن اور بانجھ پن وغیرہ جو انہیں عورت پن کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ مرد عموماً انا کا غلام ہے۔ اسے عورتوں کی بالادستی بھلا کیوں کر گوارا ہوتی لہٰذا وہ بھی مردانہ پن، آوارہ پن، بنجارہ پن، وحشی پن، فالتو پن، والہانہ پن، سادہ پن، کمینہ پن اور نکمّا پن جیسے اوصاف کو اختیار کرکے نہ صرف اپنے آدمی ہونے کا ثبوت دیتا

ہے بلکہ صنفِ مخالف سے حساب بھی بیباق کر لیتا ہے۔

کچھ ایسے 'پن' بھی ہیں جو ہماری طبع نازک پر گراں گزرتے ہیں۔ جیسے طنز نگاروں کا کٹیلا پن، طوطا چشمی کر کے پرایا پن، کم ظرفی کا اظہار کر کے سفلہ پن، لفنگوں کی طرح برتاؤ کر کے اوچھا پن، سیاسی رہنماؤں کا دوغلا پن، مصرعوں کا اکہرا پن، دلوں کا چھوٹا پن، دوشیزاؤں کا دوہرا پن وغیرہ۔ مگر کچھ پن ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیں مسرور و شاداں کر دیتے ہیں۔ فن میں جدت پیدا کر کے نرالا پن، فن کے عروج کو پہنچ کر اچھوتا پن، کھلاڑیوں کا پھرتیلا پن، معشوق کا ہرجائی پن وغیرہ کا اظہار کرنا بھی مرد و زن کی اضافی لیاقت اور بشری خصوصیت ہے۔ پن کی خوبی بھی بالخصوص قابلِ ذکر ہے کہ تمام تر قدرتی عیوب کے اظہار کا تنہا اعجاز پن کو ہی میسر ہے۔ جیسے اندھا پن، بھینگا پن، بہرہ پن، لولا پن، لنگڑا پن، بانجھ پن، پاگل پن حتیٰ کہ گنجے پن وغیرہ کے عیوب کا اظہار بھی پن کا ہی مرہونِ منت ہے۔ پن کی میتھمٹیکل افادیت سے ہر کس و ناکس واقف تو ہے مگر پن کو اس زاویۂ نظر سے شاذ و نادر ہی دیکھا گیا ہو۔ پن کو پانچ دہوں یعنی پچاس پر محمول کیا جاتا ہے۔ جن کا اعداد و شمار میں استعمال یوں آتا ہے۔ ترپن، چوپن، پچپن، چھپّن وغیرہ۔ اس زمرے میں ایک دلچسپ پیروڈی کا شعر یاد آ گیا ہے جو برسبیل تذکرہ پیش ہے

؎ پچپن کی محبت کو چھپّن سے ضرب دینا　　جب یاد مری آئے سَو اور بڑھا لینا

بولیوں میں زبان کے الفاظ کی شکست و ریخت ہونا فطری عمل ہے۔ جہاں روزمرہ کے مستعمل کا زور اور دور دورہ ہوتا ہے۔ مرہٹی، خاندیشی اور دکنی بولیوں میں پن اپنے زود استعمال کے باعث 'پنا' یعنی 'پن' کا متبادل بن جاتا ہے۔ جیسے شانت پنا، باوڑٹ پنا، پراما نک پنا، شاجوک پنا اور کھوٹا پنا۔ انہی بولیوں میں اصل پن کی معنویت بھی معنی خیز انداز میں تبدیل ہو جاتی ہے پھر یہ پن، مگر یا لیکن کے محل استعمال کا حامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب پن سے 'پنا' بن جاتا ہے تو اس کی

www.urduchannel.in

عملی افادیت میں ایک شوشہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ کپڑوں کے عرض پیمائش کے لیے کارآمد ہو جاتا ہے۔ جیسے ۳۶ رکا پنا، ۴۰ رکا پنا، ۴۲ رکا پنا، ۴۸ رکا پنا اور ۶۰ رکا پنا وغیرہ۔ اس پنا کو جب تشدید کا تاج پہنایا جاتا ہے تو اس کی افادیت اور معنویت کا دائرۂ اختیار بھی وسیع ہو جاتا ہے جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں 'پنّا' ایک بیش قیمت پتھر ہے اس کی اہمیت کے لیے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اسے ہیرا پنّا ہی کہا، سنا، لکھا، پڑھا اور برتا جاتا ہے۔ اسی لیے برادرانِ وطن فخر و انبساط سے اپنا نام پنّالعل بتاتے ہیں۔ اسی طرح ترش اغذیہ کے سیال کو بھی پنّا ہی کہا جاتا ہے جس سے پکوان کے چٹخارے میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً املی کا پنّا، کیری کا پنّا اور امچور کا پنّا وغیرہ وغیرہ۔ اپنی تحریروں کے پرانے پن سے اکتا کر میں نے نیا پن پیدا کرنے کے لیے 'پن کا رنگیلا پن' نامی انشائیہ سنایا ہے اُمید کہ آپ بھی اپنے پن سے میری کاوش کو سراہ کر بڑک پن کا ثبوت دیں گے۔

۳۰۔ پاؤں

قدرت نے انسان کو ایک جوڑ پاؤں عطا کئے جن پر وہ اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر کھڑا ہوتا، کبھی الیکشن میں کھڑا ہوتا ہے، کبھی سنیما ہال، بس اور ٹرینوں کے ٹکٹوں کی قطار میں کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی راشن، مٹی کے تیل، پٹرول پمپ اور رسوئی گیس کی خاطر قطار میں کھڑا ہوتا ہے، کبھی بینک، اے ٹی ایم اور سرکاری چلن، جرمانے کے چلن کی قطار میں کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی جنازہ کو کاندھا دینے کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی نمازِ جنازہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی بُرے وقتوں میں کاندھے سے کاندھا لگا کر کھڑا ہوتا ہے تو کبھی معشوق کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی پاؤں سے پیدل چلتا ہے تو الیکشنی ریلیوں میں چلتا ہے۔ کبھی سڑکیں ناپتا ہے، راستہ ناپتا ہے، سیر و تفریح کے لیے چلتا ہے اور کبھی چلتے پھرتے نظر آتا ہے، کبھی پاؤں سے زمانے کی رفتار سے دوڑتا ہے، حرص و ہوس کی دوڑ میں دوڑتا ہے، کبھی تمغوں کے لیے دوڑتا ہے، کبھی اولمپک اور کرکٹ کے میدانوں میں دوڑتا ہے، کبھی وزن کم کرنے کے لیے دوڑتا ہے، کبھی کتّوں سے جان بچانے اور پولیس سے بچنے کے لیے دوڑتا ہے، کبھی طوفان اور آفات سے جان بچا کر دوڑتا ہے۔ جب زیادہ ہی جوش میں آجاتا ہے تو پھر دوڑ دھوپ بھی کر لیتا ہے۔ المختصر میں ہر میدان میں دوڑتا ہی نظر آتا ہے۔ کبھی پاؤں ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے، کبھی قلابازیاں کھا کر گرتا ہے، کبھی کسی کے پاؤں اڑانے سے گر جاتا ہے، کبھی منہ کے بل گر جاتا ہے۔ بہر حال ہر مرتبہ اولمپک کھیلوں میں گر کر مادرِ وطن کی عظمت و ناموس و روفاداری کا پاس رکھتا ہے۔ ویسے نظر سے گرنا، اوقات سے گرنا اور گری ہوئی سوچ کے معاملے میں پاؤں کا عمل دخل ہرگز نہیں ہوتا۔ مگر کوئی حرج نہیں

؎ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

www.urduchannel.in

اکثر و بیشتر موسیقی کی لے پر یا پھر غصّہ میں پیر پٹخنے، فٹ بال کھیلتے وقت اور موٹر سائیکل چلاتے وقت کک لگانے کی عادت بھی رائج ہے۔ کبھی راستے کے پتھروں، ملازمتوں، تخت و تاج، اپنے اور پرائیوں کے رویّوں اور رشتوں کو بھی پاؤں سے ٹھوکر میں اُڑانا یا ٹھوکر مارنا انسانی اعادات و اطوار کا حصّہ ہیں۔ پاؤں پر رقص کرنا اور پاؤں اُٹھا کر بھنگڑا کرنا ہماری روایت ہے۔ پاؤں کے بل آلتی پالتی مار کر گیان دھیان کیا جاتا ہے۔ کبھی ہارمونیم، طبلہ، ڈھولک، جل ترنگ سارنگی اور ستار وغیرہ بجائے جاتے ہیں، سر دھنا جاتا ہے، سر میں مالش کروائی جاتی ہے، کھانا کھایا جاتا ہے۔ پہلے اکڑوں بیٹھ کر کھانے کا رواج تھا مگر توند کی سائز بڑھ جانے سے یہ عمل خصوصاً علمائے کرام اور عموماً سبھی کے لیے متروک ہو کر رہ گیا ہے۔ اکڑوں بیٹھ کر خاک نشین سودا فروشوں سے سودے بازی کی جاتی ہے۔ قضائے حاجت کے لیے بھی اکڑوں بیٹھنے کا ہی رواج ہے۔ اس میں زیادہ جدت نہ ہو سکی۔ موقع محل اکے اعتبار سے فراوانی میں پاؤں پسارنے اور ناموافق حالات میں پاؤں سمیٹنے اور پاؤں کھینچنے کی دانشمندی تقریباً سبھی کو آتی ہے۔ کبھی قاعدے میں بیٹھ کر نکاح پڑھنا پڑتا ہے۔ کبھی خشوع و خضوع کے ساتھ تسبیحات، تلاوت، عبادات اور دعاؤں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کبھی پاؤں پیٹ سے چپکا کر بڑے ذوق و شوق سے مشاعرے، سیاسی جلسے اور ثقافتی ڈراموں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اسی حالت میں جماہیاں لیتا ہوا خطبۂ جمعہ سنتا ہے۔ پاؤں پر پاؤں رکھ کر شان سے بیٹھتا ہے اور موسیقی کی لے پر پاؤں کو متحرک کر کے موسیقی کو جذب کرتا ہے۔

پاؤں کی زیبائش و آرائش کے لیے پائل گھنگھرو، گہنے تیار کرنے والے، کاریگروں اور کاروباروں کا ذریعۂ معاش بھی تو پاؤں سے ہی مربوط ہے۔ پاؤں کی پوشش کے لیے کھڑاؤں، جوتے، چپل، سینڈلیں اور موزے کی صنعت و حرفت بھی سینکڑوں قبیلوں اور کنبے کی کفالت اور

ترقی بھی پاؤں پر ہی منحصر ہے۔ انسانی وجود کا لازمہ پاؤں ہر قسم کی صفات بابرکات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ مگر پاؤں کی طبعی دقعت پر اس کے اعمال موقوف نہیں ہوجاتے۔ پاؤں نت نئی معنویت اور ذریعۂ اظہار کا وسیلہ ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا عموماً سب سے آسان عمل تصور کیا جاتا ہے۔ باوجود اس کے ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا شرف کہاں پاتا ہے۔ اس میں قدرت، قسمت، قابلیت اور ہمت کا دخل ہوتا ہے۔ پاؤں بھاری ہونا، سارے خانوادے کے لیے مسرت کا پیغام سہی مگر زیادہ خوشی ڈاکٹر کو ہوتی ہے جو متوقع معاوضہ پر تکیہ کیے بیٹھا ہوتا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔ اب بچے کے چہرے بشرے اور حرکات سکنات کا کیا اعتبار یہ تو وقت کے ساتھ تبدیل ہوجاتے ہیں۔ مگر پاؤں برابر اشارہ دے دیتے ہیں کہ بیٹا ہونہار ہوگا یا نکھٹو، دریادل، وسیع الظرف اور سخی شخص کی بابت کہا جاتا ہے، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ جب کسی چیز کی اچانک منتقلی یا غائب ہونے کا علم ہوتا ہے تو اسے پاؤں لگ جانے پر محمول کیا جاتا ہے۔ جب کسی کو اوقات یاد دلانا ہو تو پاؤں کی جوتی پاؤں میں ہی زیب دیتی ہے کہہ کر باور کرادیا جاتا ہے۔ جہاں معاملہ عدم مساوات کا ہو اور بڑے فریق کو چوٹ کرنا مقصود ہو تو پاؤں کی جوتی سر کو لگی کہہ کر رہی سہی بھڑاس نکالی جاتی ہے۔ کسی کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے ناچتے مور کے بھدے پاؤں کہہ کر اس کی اصلیت یاد دلائی جاتی ہے۔ کسی کے ہاں شرکت کرنا پاؤں رکھنے یا پاؤں دھرنے پر محمول کیا جاتا ہے۔ جس سے نیک فال یا بدشگونی کا قیاس کیا جاتا ہے اور پاؤں نہ دھرنا بائیکاٹ، حقہ پانی بند ہونے اور ترک تعلقات کے مفہوم سے عبارت ہے۔ اکثر چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا پریشانی و پشیمانی کا باعث بن جاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں پاؤں جمانے اور پاؤں اُکھاڑنے کا رواج اور زمانہ دونوں لد گئے۔ البتہ آج ہر میدان میں مقابلہ جاتی اژدہام کے سبب جہاں پاؤں جمانا بے حد دشوار گذار مرحلہ ہے وہیں پاؤں اکھڑنا اتنا ہی آسان

www.urduchannel.in

اور سہل ہو جاتا ہے۔ پاؤں اکھڑ جائیں تو مالشیے، حکیم یا فزیوتھیراپسٹ کی خدمات درپیش ہوتی ہیں۔

یوں تو دوسروں کے پھٹے میں پاؤں ڈالنا، اہالیانِ برصغیر ہندو پاک کی تہذیبی روایت ہے۔ مگر امریکہ اس کُلّیے کی تقلید میں ملکوں ملکوں جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ پاؤں پڑنے سے مراد خوشامد منت وسماجت ہے۔ عزت واحترام وسلام ہے تو قدم رنجہ ہونا بھی ہے۔ پاؤں دھو کر پینے سے مراد عقیدت اور بزرگی ہوتی ہے۔ کبھی اظہارِ عشق کے لیے بھی ماں کے پاؤں تلے جنت ہے۔ فلم پاکیزہ میں راجکمار نے چپکے سے دستی خط سوتی ہوئی مینا کماری کے پاؤں کی انگلیوں میں پیوست کردیا تھا اور دبے پاؤں رخصت ہوگیا۔ جس میں درج تھا، 'تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں انہیں زمین پر نہ رکھنا'۔ ہندوستانی تہذیب میں پاؤں چھو کر بزرگوں کو سلام وعقیدت پیش کی جاتی ہے۔ عموماً یہ عادت ھندوؤں میں رائج ہے۔ بیچارے مسلمان اپنے بزرگوں کی قدمبوسی پر ہی اکتفاء کرلیتے ہیں۔ پاؤں تلے مسلنا بھی ذلت اور حقارت کے جذبات سے عبارت ہے۔ خواہ وہ بیڑی، سگریٹ کے ٹوٹے ہوں یا کسی کی خدمت، محبت اور عقیدت کو پاؤں تلے مسلنا یہ بھی انسانی عادات کا حصّہ ہے۔ وہ سانپ ہوں یا غدار یا دشمن پاؤں سے ان کا پھن کچلنا دوراندیشی کی علامت ہے۔ کسی کام کی غرض یا مکمل آمادگی اور اتاولے پن کے اظہار کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے ہونے کی مثال دی جاتی ہے۔ مگر صوفیائے کرام بغرض وظیفہ بھی ایک پاؤں پر کھڑے رہ کر چلّہ کشی کرتے ہیں۔ کسی مقام کے قریب ہونے یا کسی نیابت یا زیردستی کے لیے پاؤں کے نیچے ہونے کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ سست، کاہل اور کام چور حضرات کو پاؤں گھس جانے کا طنز کرنا ہماری روایت ہے۔ پاؤں دکھنے اور پاؤں میں مہندی لگانے کا بہانہ بھی خاصہ قدیم ہے۔

ہم نے خط لکھ کے اُن کو بلایا، آ کے قاصد نے دُکھڑا سنایا

اُن کے پاؤں میں مہندی لگی ہے، وہ آنے جانے کے قابل نہیں ہیں

ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہ تو ہم پانی میں ڈوبنے سے بچ سکتے ہیں نہ زمانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اپنے مطلب کی تکمیل کے لیے بے چین اور مضطرب شخص کو جلے پاؤں کی بلّی کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ کثرت سے سفر کرنیوالے حضرت کو پاؤں میں چکّر ہونے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ننگے پاؤں چلنا انسان کی ازلی مجبوری تھی اب انکساری اور عقیدت و منت پر محمول کی جاتی ہے۔ پاؤں دابنے سے مراد خدمت، محبت، عقیدت اور اُنسیت کا اظہار بھی ہے اور سزا و مواخذہ بھی سید میر مہدی مجروح نے اپنے استاد مرزا غالبؔ کے پاؤں داب کر اظہارِ عقیدت کرنا چاہی تو مرزا نوشہ نے جھٹ ان کی اجرت داب کر اپنا استادی ہاتھ دکھایا۔ منوّر رانا نے فن شاعری میں کامیابی کا سہرا بزرگوں کے سر باندھا کہ

؎ یونہی چل کر نہیں اندازِ سخن آیا ہے — پاؤں دابے ہیں بزرگوں کے تو فن آیا ہے

مگر مرزا غالبؔ کا دعویٰ عجوبۂ روزگار ہے کہ ؎ کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مرزا اس بات کے بھی تو دعویدار ہیں ؎ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اسی خیالِ خام کو از سرِ نو تقویت دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

؎ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا مَیں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

مگر غالبؔ کو محض اذیت پسندی اور اذیت رسانی سے ہی علاقہ نہیں ہے۔ ان کی جمالیاتی حس اور نزاکتِ خیال محبوب کے پاؤں کے نشانات سے ہی وہ سارا کچھ اخذ کر لیتے ہیں جو ہم خواب و خیال میں نہ کر سکیں۔

؎ دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

یہی نہیں مرزا غالبؔ کو پاؤں سے اس قدر رغبتِ خاص تھی کہ انہوں نے متنوع

www.urduchannel.in

معنوعیت اور نت نئے استعارے اور تشبیہات سے مرصّع و مسجع غزل ہی کہہ ڈالی۔ جس میں انہوں نے ردیف کا انتخاب پاؤں کو کیا ہے۔

دھوتا ہوں جب مَیں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں — رکھے ہے ضد سے کھینچ کر باہر لگن کے پاؤں

دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پاؤں — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ — ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور — تن سے سوا فگار ہیں اس سوختن کے پاؤں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کے بعد مرگ — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

کل شب کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں — دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پاؤں

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو — پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

پاؤں میں چھالے پڑ جانا بھی کسی کام کے مستقل مزاجی اور استقامت کے لیے جانے کا سبب یا لمبی لمبی مسافتیں طے کرنے کی دلیل ہیں۔ بقول شکیلؔ بدایونی

؎ قسمت ٹوٹی راہ نہ چھوٹی — پاؤں میں پڑ گئے چھالے

مگر ناصرؔ کاظمی جدید شاعر تھے۔ لہٰذا روایت سے بغاوت ان کا وطیرہ جو ٹھہرا۔ لہٰذا فوراً اپنے نئے مفہوم اور مطالب کا استعمال کر کے انفرادیت ثابت کر دی۔

جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاؤں میں چھالے ہوں گے — ہاں وہی لوگ ترے چاہنے والے ہوں گے

پاؤں پھسل جائے تو گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ویسے پاؤں پھسلنے کے لیے عمر کی کوئی قید مقرر نہیں کی گئی ہیں۔ ہر عمر میں پاؤں پھسل سکتے ہیں۔ حرفِ آخر یہی ہے۔

؎ پاؤں رکھنا سنبھل سنبھل کے — یا پھر پھونک پھونک کر پاؤں رکھنا

۱۳۔آخر زباں تو رکھتے ہو...

زبان طبعاً خاصی چٹوری اور چٹخارے دار واقع ہوئی ہے۔زبان کی ہی صفات بابرکات نے ہمہ اقسام کی لذت کام و دہن سے عوام الناس کو شاد کام کر رکھا ہے۔جس سے ہوٹلوں نے صنعتی پیمانوں پر وسعت اختیار کرلی ہے۔ہوٹلوں کی صنعت ترقی پذیر سے ترقی یافتہ کے مراحل میں ہے۔خانم سے زیادہ خانساماؤں کا ذائقہ لائق اعتبار ہے۔زبان کو جس طرح کھٹے میٹھے نمکین تیکھے کڑوے کسیلے اور چٹخارے دار ذائقوں کی تخصیص کا افتخار حاصل ہے اسی طرح اسے مخاطب گفتگو سے حلاوت،نرمی،شیرینی،سختی اور درشتی کے اظہار کا سلیقہ بھی خوب آتا ہے۔زبان کی بدولت ہی معاشرے میں اہلِ زبان سے انسیت،حمیت اور محبت اور تعلقات ہوتے ہیں لہٰذا زبان ہی عصبیت،علاقائیت اور تہذیب وتمدن کی ترجمان بھی گردانی جاتی ہے۔ہمارے معاشرے میں زبان دینے اور زبان لینے کی روایت بھی خاصی قدیم اور مستحکم تھی۔گو زبان دینے کا مفہوم ایفائے عہد و پیماں،وعدہ وفا کرنا نیز زباں کا پاس ولحاظ رکھنا ہوتا تھا۔مگر اب زبانوں کا تبادلہ بھی محاورتی حیثیت،کہاوت بہ لفظ دیگر لفاظی کا متحمل ہو کر رہ گیا ہے۔مشہور یا بدنام ہونا بھی زبان زدِ خاص وعام ہونے کا مرہون منت ہے۔یہ تنہا زبان کا اعجاز ہے کہ وہ دو جبڑوں کے مابین بتّیس نوکیلے،تیز اور خطرناک دانتوں کے حصار میں رہ کر بھی کمال برق رفتاری سے لچکتی،مچلتی،لپکتی اور لٹکتی ہے۔بالخصوص جب وہ زنانہ زبان ہو تو اس کی شر انگیزیاں اور حشر سامانیاں دو چند بلکہ سہ چند ہو جاتی ہیں۔زبان اپنے الفاظ اور طرز ادائیگی سے ہر قسم کی فتنہ پردازیاں کرتی ہیں۔کبھی زبان سے پھول جھڑا کر سامع کا دل باغ باغ کر دیتی ہے۔زبان اگر مکھن لگانے پر آئے تو خوشامد اور چاپلوسی سے ہر بگڑے کام کا مداوا کر دیتی ہے۔کبھی انگارے اُگل دے تو غیظ وغضب حتیٰ کہ تشدد کا نشانہ بنا دیتی ہے۔زبان ہی مختلف معاشروں،تہذیبوں،تمدنوں کے مابین اپنے مافی الضمیر کا موثر لسانی ذریعہ ہے۔زبان ہی شخصیت کے اعتبار کا پیمانہ مقرر کرتی ہے۔زبان کی سالمیت سچ کا بین ثبوت ہے وگر نہ جھوٹ کہے تو زبان کٹ کر گر جانے کے دعوے زمانۂ قدیم سے اکثر و بیشتر سنے جاتے رہے ہیں۔مگر زبان کو تالو سے لگانے کا شعار جاری ہے اب بڑے پیمانوں پر۔

زبان کسی کی قصیدہ خوانی میں تر ہوتی ہے اور تعریف کرتے نہیں سوکھتی ہے تو کبھی کسی کے عیوب ونقائص کو اجاگر کرنے میں پچھلی سات پشتوں کو بھی نہیں بخشتی۔زبان بھی ہڈی سے محروم انوکھا انسانی جزو ہے جو بے لگام ہو جائے تو تیر وتلوار اور خنجر و نیزے کو مات دے دیتی ہے۔زبان کا گھاؤ بہر کیف مہلک ہتھیاروں کے گھاؤ سے زیادہ گہرا،موثر اور خطرناک ہوتا ہے۔چونکہ مذکورہ مہلک ہتھیاروں کا گھاؤ جلد یا بدیر بھر جاتا ہے،البتہ زبان کا گھاؤ تاعمر نہیں بھرتا۔لہٰذا یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ زبان سنبھالنے کے فوائد بے بہا ہیں اور اسے بے لگام چھوڑ دینے پر تشدد کی ہنگامہ خیزیاں بھی اتنی ہی مضر اور نقصاندہ ہوں گی۔یوں تو زبان کو پھسلنے اور دانتوں کے بیچ آکر غلطی کا احساس دلانے کا شوق بھی ہوتا ہے۔زبان کی حفاظت جنّت میں مقام کی ضامن ہے۔غالباً ہمارے اسلاف اسی لیے پان کی گلوریوں سے شغل کیا کرتے تھے تاکہ زبان قابو میں رہے۔وہ زبان کو ہمہ وقت پان،زردہ اور چھالیہ سے نبرد آزما رکھتے تھے۔اسی اثنا میں انہیں تدبیر و تفکر،حکمت و دانشمندی کے گھوڑے سرپٹ دوڑانے کا موقع میسر آجاتا تھا۔وہ جو کہتے تول مول کر کہتے تھے۔ان کی باتوں میں دوراندیشی کی رمق اور مصلحت کی چمک اور حق گوئی کی دمک برقرار ہوتی تھی۔مگر دورِ جدید میں جہاں تمام اقدار زوال پذیر ہیں گز بھر کی زبان کے حامل حضرات اپنی زبان درازی،زود گوئی اور زبانی جمع وخرچ پر ہی تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔انہیں اپنی بے وقعتی اور بے ثباتی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔چونکہ انہیں علم وادراک ہے کہ جس کی زبان چلے

www.urduchannel.in

اس کے ستر ھل چلے۔ لہٰذا خاموش طبع حضرات کے حصّے میں اکثر گوشہ نشینی یا ناکامی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ زبان ہی شخصیت و خیالات کی آئینہ دار ہے۔ زبان عموماً دو قسموں کی ہوتی ہے۔ ہر دو نوں قسموں کی صفات اور عادات بھی مختلف و جداگانہ ہوتی ہے۔ مردانہ زبان بالکل نستعلیق ہوتی ہے یعنی جو بات دل میں وہی زبان پر۔ اس لیے اسے جلد اعتبار کا درجہ مل جاتا ہے۔ مگر ٹیڑھی پسلی کی طرح زنانہ زبان میں جا بجا بل پڑے ہوتے ہیں۔ زنانہ زبان کے نخرے، غمزے، عشوے، اشارے، کنائے و مفاہیم خاصے قابل غور اور فہم طلب ہوتے ہیں۔ ان سے ایک تیر اور کئی شکار کے فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا دورانِ گفتگو (خانہ جنگی) جوں جوں زنانہ زبان کا بل کھلتا جاتا ہے توں توں مردانہ پیشانی پر بل پڑتا جاتا ہے۔ غصہ کا پارہ بھی چڑھتا جاتا ہے۔ جو اکثر وقتی غصے، رنجش و تنازعے کا سبب بن جاتا ہے۔

زبان کو حرص، طمع اور لالچ سے بھی خاصی رغبت ہے۔ لہٰذا ایسے جذبات طاری ہوتے ہی زبان بے قابو ہو اٹھتی ہے اور قفس دہن سے باہر لٹکتی ہے۔ زبان کو جمہوری اقدار سے بھی چاؤ کا رشتہ ہے۔ شاید اسی لیے زبان جمہوریت کی قائل نظر آتی ہے کہ زبانِ خلق، نقارۂ خدا۔ جسے راقم الحروف یوں محمول کرتا ہے کہ جو بات زبان زدِ خاص و عام ہوا سے مرضئ مولا تسلیم کر لینا چاہیے۔ تقسیمِ ہند کے بعد آزاد وطن میں ریاستوں کی تقسیم کی بنیاد بھی زبان بنی۔ زبان سے ادب ہے، صرف و نحو ہے، تخلیقات اور تخلیق کار ہیں، شعراء ہیں، ادباء ہیں، مقررین ہیں، صحافی ہیں اور ووٹ بینک بھی ہیں اور اقلیت و اکثریت کا فرق بھی ہے۔ زبان ہی ہمارا تہذیبی ورثہ ہماری میراث اور بالآخر ہماری ترجمان اور شناخت ہے۔ سفر میں اکثر و بیشتر صحبت، ناجنس سے واسطہ پڑ جاتا ہے، جہاں زبان کا مسئلہ حائل ہو جاتا ہے، تو یہی گلہ زبان پر آتا ہے، زبانِ یارِ من ترکی، و من ترکی نمی دانم۔ اگر ہم غلط کہیں تو بیشک ہماری زبان، گدی سے کھینچ لیں۔

www.urduchannel.in

۳۲۔ شرم ہم کو مگر...

عہدِ قدیم میں ملازمت کو غلامی تصور کیا جاتا رہا ہوگا۔ بعض اب بھی ملازمت کو غلامی کہہ کر اپنی ناکامی کی تلافی کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اکثر وہ جن کو ملازمت میسر نہیں ہوتی۔ ہر چند کہ اوّل الذکر خیال اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ ملازمت، نوکرشاہی سے متجاوز ہو کر شہنشاہی کے زمرے میں شمار ہو چکی ہے۔ غالباً اسی لیے سرکاری، نیم سرکاری و خانگی شعبہ جات میں بھی ملازمت کے حصول کی خاطر رشوت، سفارشات اور وسیلے جیسے حربے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ چند دنوں میں 'بروئے' تو غائب ہو جاتا ہے البتہ 'کار' لائی جاتی ہے۔ چونکہ ملازمت کی ماحاصل تنخواہ تو محض دودھ کے مترادف ہے۔ جس میں عموماً نااہلی، تساہلی، غفلت، اور کامچوری کے پانی کی آمیزش ہوتی ہے۔ البتہ بالائی کی تہہ بہ تہہ اس کے پُرکشش ہونے کی دلیل ہے۔ مثلاً تنخواہ سے منسلک مالی منفعت و مراعات میں مکان کا کرایہ، کرایہ آمد و رفت، طبّی اخراجات، مہنگائی بھتّے، سالانہ اضافے، بونس، گریجویٹی، PF کے علاوہ خدمات سے سبکدوش ہونے پر ماہانہ وظیفے (پینشن) کی سہولت، غیر محسوس مالی مراعات میں بانتخواہ، ناغے، طبّی تعطیلات کے علاوہ ازیں مذہبی، رسمی و قومی تعطیلات کے علاوہ دیگر سہولت۔ گویا حکومت ملازمین نہیں چہیتے داماد پال رہی ہو۔ کم و بیش اتنی ہی مراعات خانگی شعبے میں بھی باآسانی مل جاتی ہے۔

اس کے برعکس ہمارے پیش امام و موذنِ مسجد کی حالتِ زار خاصی دگرگوں اور قابل رحم حد تک تشویش ناک ہے۔ جنہیں یوں بھی غالباً دنیاداری کا فن نہیں آتا تو وہ اسی بہانے خانۂ خدا کے خدمت گار و محافظ بن جاتے ہیں کہ دنیا نہ سہی کم از کم رضائے الٰہی کے ذریعے اپنی آخرت ہی سنوار لیں۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

شاید یہی مجبوری ان کو خطِ افلاس سے نیچے زندگی گذارنے پر قانع وشاکر رکھتی ہے۔ نہ ان کو اوروں کی طرح پُرکشش تنخواہ کی حرص ہوتی ہے نہ مذکورہ بالا مراعات کا فہم وادارک۔ بیچارے عمر رسیدہ، کمرخمیدہ اور حال رنجیدہ سے اپنے پیشے کا حق ادا کرتے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ عبادات و ریاضت کو معمول بنالیتے ہیں۔ اکثر ان کے حواس مختل ہونے کی شکایت زبانِ زدِ خاص وعام ہوتی ہے۔ جس کے مخصوص عوامل ہیں۔ ناکافی تنخواہ، کام کا اضافی بار، عمر کا تقاضہ اور لامحدود جوابدہی۔ یوں تو مذکورہ بالا سرکاری ملازمین کی جوابدہی ان کے افسرانِ بالا تک محدود ہوتی ہے۔ جس میں حیل حجت، اور رعایت کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ مگر پیشِ امام اور موذن حضرات کو متولیانِ مسجد کے عتاب کے علاوہ مصلیان کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دینا لازمی ہوتا ہے۔ بعض اوقات مصلیان کی شکایات کا ردعمل بھی متولیوں کی تنبیہ (دھمکی) کے زمرے میں جھیلنا پڑتا ہے۔ جو مسجد میں ہر بات پر اعتراض کرنے کے مجاز ہوتے ہیں اور اسے اپنا ملّی فریضہ گردان کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں

ابلیس تیری اِک خدا سے نہ نبھ سکی — آ مجھ کو دیکھ کتنے خداؤں کی زد میں ہوں

لہٰذا پیش امام اور موذن حضرات کو بھی بدلتے موسم کی طرح متولیانِ مسجد کا مزاج سمجھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ان کے گھریلو تنازعات کا اثر جھیلنا پڑتا ہے۔ جن کی گھر میں کوئی ایک بات سننے کا روادار نہیں ہوتا ہے۔ اسے بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اتنی افتاد، مصائب سے دلبرداشتہ ہو کر وہ اگر جھلاہٹ کا اظہار بھی نہ کریں تو کیا کریں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ وساغر نہیں ہوں میں

باوجود تمام کلفتوں کے وہ عوام الناس کی ہر مذہبی تقریب میں باہزاراں

www.urduchannel.in

اشتیاق وصد ہزاراں اخلاص ومحبت سے پیش پیش رہتے ہیں۔ خواہ وہ نکاح خوانی ہو یا فاتحہ خوانی، قران خوانی ہو یا نمازِ جنازہ، سوم (تیجہ) ہو یا چہلم، دعائے مغفرت ہو یا دعا برائے افتتاح (خیر وبرکت) علیلوں کی بازیابی کی دعا ہو یا مرحوم کے لواحقین واقارب کو تسلّی دینا، صبر کی تلقین ہو یا دعائے خیر تمام امور ان پر عائد فریضے سے زیادہ وعلاحدہ کام ہیں۔ جسے مجازی دنیا میں اوورڈیوٹی قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی محدود دوقفے میں ضرورت سے زیادہ کام جو کسی علاحدہ معاوضے کے بغیر ہوتا ہے۔ مگر بندگانِ خدا کا حوصلہ اور نیک خلقی کا جذبہ ہے۔

دِل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا — آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں

اس کے برعکس محدود عرصۂ کار کے بعد کے اضافی کام کو اوورٹائم کہا جاتا ہے، جس کا معاوضہ بھی دگنا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہی اوورٹائم ملازمین کو محدود عرصے کے بعد بھی کام پر آمادہ کرتا ہے، بلکہ مزید کام کی تحریک فراہم کرتا ہے۔ مسجد کے متولیان نے پیش امام وموذن حضرات کو اوورڈیوٹی کی ہی ترغیب دی اور اوورٹائم کے منفعت بخش نظام سے انہیں نا آشنا رکھا۔ ایک معمولی وظیفہ مخلص خادمانِ الٰہی کے دامن میں ڈال کر پہلوتہی کر لینا متولیان کا وطیرہ بن چکا ہے۔ اس وظیفے سے ایک عام آدمی کا گذر اوقات تقریباً ناممکن ہے۔ اس پر ستم بالائے ستم کے اپنی تنخواہ کے حصول کے لیے چندہ جمع کرنا، اس کا حساب کتاب رکھنا اور اسے بطور امانت متولیان کو سونپنا بھی انہیں برگذیدہ بندوں کے اضافی فرائض کا حصّہ ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ بجلی، پانی ودیگر محکموں کے بلوں کی ادائیگی متعلقہ دفاتر تک موذن حضرات ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ متولیان کا معمول ہے، اختیارات کا استعمال کرکے حکم صادر کرنا۔ بقول قتیل شفائی

اَن گنت میرے خدا اور مَیں اکیلا آدمی — ایک ہی سر ہے جھکا سکتا ہوں کس کے لیے

اللہ نے اپنے مخلص، متّقی اور خدامِ مسجد، عبادت گذار بندوں سے روزِ جزا میں بہترین اجر

کاوعدہ کیا ہے۔ مگر دنیا میں زندہ رہنے کے لیے مالی وظیفہ لازمی ہے ورنہ ہر روز سزا ہے۔ چونکہ دنیا دارالاسباب ہے، یہاں حیات محض مذہبی جذبات کی نہیں معقول مالی وظیفے کی محتاج ہے۔ ہم اپنے لیے تو اعلیٰ وارفع معیارِ زندگی پسند کرتے ہیں، مگر ان خدامِ الٰہی کو توکلت علی اللہ کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اب اسے طوطا چشمی کہیں یا کورچشمی فیصلہ کر پانا مشکل ہے۔

بوجھ وہ سر پہ پڑا ہے کہ اُٹھائے نہ بنے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

اکثر مساجد کے خزانے چندے کی رقوم، ماہانہ کرائے و دیگر وظائف سے پُر ہوتے ہیں۔ ان خطیر رقومات کا اسراف مرصع و منقش گنبد و مینار اور منبر و محراب کی تعمیرات پر ہوتا ہے۔ جس کی نہ تو شرعی حیثیت ہے نہ ضرورت۔ البتہ متولیان کے ذوقِ نظر کی تسکین اور آرائش عمارت کے ذوق و شوق کا سبب ضرور ہیں۔ چونکہ ان خداپرست جیتے جاگتے، شاکر و قانع حضرات تو یوں بھی رعب اور دبدبے تلے لب نہیں کھولتے تو سوال کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ بس اسی موقع کی افادیت ہے کہ خدا کی خوشنودی کے پس پردہ عوام کی خوشنودی اور داد و تحسین کا نذرانہ ملتا رہے۔ نیک نامی بھی حاصل ہوتی رہے اور خدامِ الٰہی اسی خیال پر تکیہ کر لیتے ہیں

؎ ہے غنیمت کہ بہ اُمید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

اکثر نمازِ جمعہ سے قبل اور اذان کے بعد موذن حضرات و پیشہ ور، تمام مصلیوں عطر، سرمہ، کاجل و مسواک فروخت کرتے نظر آتے ہیں جو اوورٹائم یعنی منفعت بخش ہوتا ہے۔ لہٰذا موذن حضرات بڑے انہماک و تندہی سے اپنے کاروبار میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ قرانِ حکیم نے سورۃ جمعہ کے حوالے سے ممانعت فرمائی ہے مگر مالی فقدان کی تلافی کا خیال ان برگزیدہ بندگانِ خدا کو بھی حرص و طمع اور طلبِ زر کا غلام بنا لیتا ہے۔

؎ مے پرستاں، خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

www.urduchannel.in

اوّل الذکر سرکاری ملازمین کو ہر دس سال بعد پے کمیشن گرانی کے پیشِ نظر از سرِ نو تنخواہ میں اضافے دیتی ہے۔ ادھر ماہِ رمضان میں حافظِ قران کے طفیل امام و موذن کو بھی چند روپئے اور جوڑا دے کر متولیان فارغ ہو جاتے ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ اس رقم کا منبع بھی جمع شدہ چندہ ہی ہوتا ہے۔ سرکاری ملازمین کے سبکدوش ہونے کی عمر متعین ہے۔ سبکدوشی پر انہیں زبردست مالی منفعت کے ساتھ ماہانہ مالی وظیفہ (پینشن) بھی میسر ہوتا ہے۔ مگر پیش امام اور موذن کی سبکدوشی کی نہ تو کوئی عمر متعین ہے نہ کلیہ ہی ہے۔ بس جب تک وہ متولیانِ مسجد سے نباہ کر سکیں ورنہ پھر ضعیفی یا امراض کا عذر پیش کر کے ان سے نجات حاصل کی جاتی ہے۔ البتہ سبکدوشی کے وقت جوڑا اور نذرانہ دیئے جانے کا رواج ہے۔ سرکاری ملازمین کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور کیسۂ زر سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پیش امام و موذن حضرات کو محض حسنِ ظن کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے کہ ؎ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ سرکاری ملازمین کی ہر فرمائش کی فہمائش کے لیے احتجاج ہڑتال، ستیہ گرہ، منظم تحریک چھیڑ کر اربابِ حکومت سے اپنے مطالبات منوا لیتے ہیں۔ ادھر حکومت بھی بسر و چشم ان کے مطالبات کو اوّل، آخر شرفِ قبولیت دے کر معاملہ رفع دفع کر دیتی ہے۔ ادھر آئمۂ مسجد و موذن کا موقف ہے کہ

؎ منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

۳۳۔آستین

بات بے بات پر آستین چڑھانا ہمارا غیر ارادی فطری عادات کا حصہ ہے۔ جس سے مراد مردانہ شجاعت کا مظاہرہ یا محض رعب داب (گیدڑ بھبکی) کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر مختلف ممالک میں آستین چڑھانے کے مفاہیم بھی عین اسی طرح جدا جدا ہوتے ہیں جیسے ان کے زبان ولباس ،رنگ ونسل اور طرز معاشرت۔ مثلاً برطانیہ اور ہالینڈ میں آستین چڑھانے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی کام کو انجام دینے کیلئے مکمل طور پر مستعد اور تیار ہیں (جو ان کی ترقی سے بھی جگ ظاہر ہے) ان کے برعکس جرمنی میں آستین چڑھانے سے مراد فرصت، فراغت اور مکمل آرام (ممکن ہے وہ کام میں اسقدر منہمک ہوتے ہوں کہ آستین چڑھانا یاد نہ رہتا ہو) لیکن ان اقوام کے مقابلے میں ہم اہل برصغیر ہندو پاک کی عادات اور نظریات اپنے جد و امجد کی وراثت پر موقوف نظر آتا ہے۔ ہمارا حسب نسب بھی ماضی کے ان حملہ آوروں سے ضرور جا ملتا ہے۔ لہذا ہمارے ہاں آستین چڑھانے کا مفہوم دو۔ دو ہاتھ کرنا ہے، سر دھڑ کی بازی لگانا ہے، براہ راست تشدد پر آمادہ ہوجانا ہے۔ غالباً یہی ایک موئثر وراثت ہمیں خوب راس آئی ہے۔ جو باہمی رسہ کشی، آپسی زور آزمائی اور خانہ جنگی پر ہمیں کمربستہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اغیار پر خاک ہمارا زور نہیں چلتا۔

آستین چڑھانا ہمارے معاشرے کا خاصہ ہے بلکہ ایک ہی دن میں ہم کئی کئی بار آستین چڑھانے سے باز نہیں رہتے مگر خدارا اس کا مفہوم یہ ہرگز نہ اخذ کر لیا جائے کہ مبادا ہم دہشت گرد ہیں یا ہم نے اس جنت نشاں خطہ ارض کو دہشت کا اکھاڑہ یا پانی پت کا میدان بنا رکھا ہے۔ ہم آستین ضرور چڑھاتے ہیں وضو کیلئے، انجکشن لینے کیلئے، محنت کا پسینہ پونچھنے کیلئے، بعض اوقات آستین چڑھا کر عادتاً دھمکانے اور تیور دکھانے کیلئے اکثر اوقات مار آستین پالنے کیلئے بھی

www.urduchannel.in

آستین کو زیر استعمال لاتے ہیں۔ ہمارے آستین چڑھاتے ہی مخصوص طبقے کے دشمنوں کی پیشانی پر بل پڑتے ہیں۔ بعض اعدا کو مارے خوف کے زبردست دردزہ ہوتا ہے اور نتیجتاً وہ نت نئے فتنوں کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن انکی موٹی عقل میں یہ معمولی سی بات نہیں آتی ہے کہ آستین بہت سے ان کہے، سربستہ اسرار کا پردہ فاش کر دیتی ہے۔ جو بعض اوقات سراغ قتل کے انکشاف کیلئے اہم ثابت ہوتے ہیں۔ بقول شاعر ؎ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین سے

سفید پوشی اور نفاست پسندی کا بھرم قائم رکھنے والے حضرات نصف آستین کی قمیض پہنتے ہیں تا کہ بار بار پسینہ پونچھنے اور ہر بار کف کے بٹن کھولنے اور بند کرنے کی علت سے نجات مل جائے،، فیشن کی تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی رہے اور آستین چڑھا کے چڑھائی کرنے اور شکست ہونے پر آستین بھی غصے کی طرح اتارنے کی زحمت سے بچ جائیں۔ صرف سینڈو بنیان مین آستین کے استثنی کے علاوہ مرد ہر قسم کے لباس میں آستین یا مار آستین کا پابند بن کر رہنا پسند کرتا ہے۔ مار آستین وہ خطر ناک چوہے ہیں جو ملت کا بیڑہ غرق کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ ان مار آستین حضرات کی گوناگوں خصوصیات اور عادات و اطوار کی بنیاد پر یہ حلقۂ سیاست میں خاصے مقبول و مرغوب ہوتے ہیں۔ جنہیں کل معاشرہ نہ صرف کج نگاہی سے دیکھتا ہے بلکہ گاہے گاہے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے بھی باز نہیں آتا۔ بقول مرحوم جلیل سازؔ

بفضل ایزدی وہ راہبر ہیں　　لہو میں آستینیں جن کی تر ہیں

موصوف کے علاوہ سکندر علی وجد نے بھی آستینوں کو اپنے کلام میں بخوبی برتا ہے۔ ایلورہ کے غاروں مین ایستادہ بتوں سے ان کا وجدان بھی قابل ذکر ہے۔

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں　　دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نور ازل بت ہیں آستینوں میں　　حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں

خیر یہ تو احوال واقعی رہا مردانہ آستینوں کا اب جائزہ لیتے ہیں زنانہ آستینوں کا تا کہ توازن برقرار رہے اور کوئی جنس عدم توجہی اور جانب داری کی شکایت نہ کرے۔ عہد قدیم میں زنانہ ہتھیلیوں کی پشت بھی پوشش یا پردے کی سزاوار ہوتی تھیں۔ شرم وحیا خواتین کا لازمہ تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ہوائے مغرب کی آندھی نے ساری اقدار اڑا کر زنانہ ذہنوں سے فراموش کر دیا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے مثلاً کاموں کی الجھن، موسم کا تقاضہ، فیشن اور بالخصوص دعوت نظارہ کے شوق نے جذبہء رقابت کو پروان چڑھایا اور آستینوں کی طوالت میں بتدریج تخفیف شروع ہوگئی۔ کل سے پون، پون سے نصف، نصف سے پاؤ اور پاؤ سے عدم۔ گویا آستینیں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح یکسر غائب ہوگئیں یا ملک عدم کی راہی ہوگئیں۔

الا ماشا اللہ جو آستینیں کسی غیرت وناموس کے نتیجے میں رہ گئیں وہ فی زمانہ آرائش وزیبائش، اختراع وایجاد کی تجربہ گاہ بن گئی ہیں۔ کہیں آستینوں میں جملہ اشکال کے روزن ودریچے آویزاں کئے جارہے ہیں، کہیں رنگین کشیدہ کاری سے متوجہ وملتفت کرنے کی سبیل تلاش کی جارہی ہے تو کہیں چمکیلے نگ، آبگینے ٹانک کر کہیں جھالریں اور بھڑکیلے رنگ وڈیزائن بھی مذکورہ مقصد کے تحت آراستہ کیا جارہا ہے۔ بغیر آستین کے بازو تو عابدین وزاہدین کو بھی توبہ شکنی پر مجبور کر دیں تو عام آدمی کی کیا بساط؟ خیر ہم سکے کے محض ایک رخ کو ہی مطمع نظر نہیں بناتے نہ ہمیں خواتین سے کسی قسم کا بغض یا عناد ہے نہ عداوت۔ حسین، خوبصورت، پرکشش اور ممتاز نظر آنا خواتین کی فطرت ہے۔ حسن ظن کے تحت یہ ضرور خیال کرتے ہیں کہ فیشن کے نام پر مرد حضرات نے ان کی ناقص العقلی کا خوب فیض اٹھایا وہیں ان کی ہم صنف بنت حوا نے مار آستین کا کردار ادا کر کے ان کو اس قدر زک پہنچائی ہو۔ شاید اسی لئے ان خواتین نے آستین سے ہی توبہ کر لی کہ نا ہوگی آستین نہ ہوں گی مار آستین۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ رہیگا بانس نہ بجے گی بانسری۔

www.urduchannel.in

۳۴۔۔۔۔غم سے نجات پائے کیوں

ہماری ساس محترمہ کو ہم آنٹی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں چونکہ ہماری امی کی جگہ کوئی اور خاتون نہیں لے سکتیں (برصغیر ہندو پاک میں کوئی بھی خاتون اسے لعنت سمجھتی ہے)۔ آنٹی یوں تو اول درجے کی تیز وطرار خاتون ہیں، زودگو، صاف گو اور رعب دار شخصیت ہیں مگر فطرتاً ناقص العقل اور جلد باز بھی ہیں۔ لہذا عجلت میں حماقت ان کا خاصہ ہے اور عام عورتوں کی طرح وہ اپنی حماقتوں کا الزام بھی دوسروں کے سر منڈھ دینے کی ماہر واقع ہوئیں ہیں۔ انہیں اپنی پختہ قوت ارادی اور منصوبہ بندی پر بڑا ناز ہے مگر ان سے کب کون سی حماقت سرزد ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات انہیں بھی اس کا ادراک نہیں ہوتا۔

ایک روز کسی دفتری کام سے ہمارا اتفاق اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ موصوفہ کو لے کر سکریٹریٹ جانا ہوا۔ واپسی میں انہوں نے بازار سے سودا سلف اور خریداری بھی کرنے کی ٹھان لی جو بیشک کفایت شعاری کا تقاضہ بھی تھا۔ وہ تو بھلا ہو بلدیہ کا اس نے واپسی کے راستے کو ون وے مقرر کر رکھا تھا اس لیئے جاتے ہوئے تو بازار سے گزرنا ممکن تھا لیکن واپسی کے دوران ناممکن۔ کئی رکشہ والوں کو روکنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی آمادہ نہ ہوا۔ آخر ایک رکشہ والے کی شامت آن پڑی جو رک گیا۔ اس سے معاملات طے ہوئے۔ ہمیں سکریٹریٹ جانا ہے لیکن بھئی ہمیں تو واپسی بازار کے راستے ہی کرنی ہے اور کرایہ بھی معقول ہو۔ رکشہ والے نے دوہرے چکر سے معذوری ظاہر کی یا پھر دوہرے معاوضے کا مطالبہ کیا، قانون کا واسطہ دیا، پولس چالان کا خدشہ ظاہر کیا جرمانے کی دہائی دی مگر موصوفہ نہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہلنے کو تیار ہوئیں اور نہ اپنے مقررہ بجٹ کے اضافے پر راضی ہوئیں۔ اس بیچارے کی بھی موت اسے گھیر کر لائی تھی کہ وہ

تیار ہو گیا۔

رکشہ اپنی منزل کو رواں دواں ہوا موصوفہ کی نشست و برخاست کا طور طریقہ اور چہرے کے تاثرات ضرورت سے زیادہ متصنع ،شاہانہ اور تکبر آمیز تھا۔اس رکشہ والے کو ان کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ادھر رکشہ کی حالت زار اور چال ڈھال بھی عمر دراز اونٹنی سے کم نہ تھی ۔ہر حرکت پر رکشہ کے پرزوں سے چوں چرا کرنے اور پناہ مانگنے کی آوازیں برآمد ہوتی رہیں اور ہر لمحہ کہیں رکشے کی آخری ہچکی نا ثابت ہو یہ خوف بھی لاحق تھا۔لہذا رکشہ کے ہر دھچکے اور جھٹکے کا اثر راست دل ناتواں اور طبع نازک کو لرزاں و پریشاں کرنے کو کافی تھا۔ان دھکوں کے علاوہ سڑک کے اسپیڈ بریکر کے نشیب و فراز موصوفہ کے رخ تفاخر پر ناگواری کی شکن چھوڑ جاتے۔چنانچہ ذہنی طور پر ان کے بیچ اختلاف کا بیج پڑ چکا تھا۔

سکریٹریٹ کے معمولات،قطاروں اور بابوؤں کی لن ترانیوں پر کس کا زور چلتا ہے۔وہ تو سرکاری تنخواہ کھا کر سرکار کو ہی آنکھ دکھانے سے گریز نہیں کرتے تو بھلا عام شخص کا کیا مقام و مرتبہ؟ وہاں توقع سے کچھ زیادہ ہی تاخیر ہوگئی۔رکشہ والے نے فوراً کاروباری حربہ آزمایا اور صدائے احتجاج بلند کی۔"خالہ جان!انتظار کا اضافی کرایہ دینا ہوگا۔

موصوفہ نے جھٹ یہ کہہ کر بات مسترد کر دی۔"بیٹا کرایہ پیشگی طور پر طے ہے اس لئے اس میں رد و بدل ہوا تو فوراً اس رکشہ کو بلا معاوضہ الوداع کہہ کر اگلا رکشہ طے کرلوں گی۔"

موصوفہ کا تیور اور دھمکی کارگر ثابت ہوئی رکشہ والا بیچارہ خاموش رہ گیا مرتا کیا نہ کرتا اسے راضی ہونا ہی پڑا۔اگر چہ رکشہ والا تاؤ میں آتا تو اسے کرائے اور ضائع شدہ وقت کے ساتھ ساتھ پٹرول کا بھی نقصان ہو جاتا۔

واپسی کے سفر میں جوں ہی بازار آیا موصوفہ کو طے شدہ منصوبے کے پیش نظر قسم قسم کی

www.urduchannel.in

سبزیاں اور پھلوں کی خریداری کرنا تھی۔سوانہوں نے ملکہ عالیہ کے شایان شان رکشہ میں بیٹھے بیٹھے ہی خریدی شروع کر دی۔رکشہ والا تو پہلے ہی ان سے بیزار تھا اسے بھی موقع مل گیا۔

اس نے کہا۔خالہ جان!واپسی بازار کے راستے طے ہوئی تھی ماہانہ خریداری کا وعدہ نہیں شامل تھا آپکی پیشگی شرائط میں۔"

آنٹی بھی کہاں خاموش رہنے والی تھیں،ہاتھ نچا کر فوراً گویا ہوئیں۔"اے ہے تو میں کیا بازار کی سیر کی خاطر تمہاری رکشہ میں بیٹھی ہوں۔اچھا خاصہ کرایہ لے رہے ہو،کوئی مفت کام کر رہے ہو کیا؟"

اس بات پر رکشہ والے کا خون کھول اٹھا مگر وہ عورت ذات دیکھ کر خاموش رہا۔ہم بھی حسب مراتب کا لحاظ کر کے خاموش رہ گئے۔بیگم کو اپنی والدہ کی عادات و اطوار سے بھلی واقفیت تھی۔لہذا وہ بھی چپ سادھے رہیں۔اب آنٹی کے حوصلے بلند ہو گئے۔انہوں نے سر راہ رکشہ میں براجمان رہ کر کیلے،تندوری روٹیاں، پاپڑ کے پیکٹ اور جو بھی اشیاء ان کے منصوبے اور فہرست خریداری میں شامل تھیں اسے حتی المقدور پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی کہ رکشہ میں اب انسان کم اور سامان زیادہ ہو گیا۔ہم نے سوچا مگر سوچ کر رہ گئے کہ سامان سو برس کا ہے۔۔۔

لیکن ایک مقام ایسا بھی آیا جب تو آنٹی نے حد کر دی۔سڑک کے دوسری طرف کھڑے ٹماٹر والے سے رکشہ میں بیٹھے بیٹھے ہی آواز دے کر دام دریافت کئے"۔ارے بھئی ٹماٹر والے! ٹماٹر کیسے دیئے؟"

ٹماٹر والے نے پہلے آواز کی سمت معلوم کرنے کیلیئے ادھر ادھر تجسس سے نظر دوڑائی تو اسے سراغ مل ہی گیا کہ سوال رکشہ سے پوچھا گیا ہے۔وہ بھی بلا کا منہ زور اور حاضر جواب تھا کہنے لگا۔"آنٹی جی موبائل نمبر لے جایئے ایس ایم ایس کر کے پوچھ لیا کریں۔"

موصوفہ نے خفگی مٹانے کیلئے پھر سوال کا اعادہ کیا تو بولا۔"تیس روپے کلو ہیں۔"

موصوفہ حسب عادت بولیں۔ ''بیس کا دام صحیح ہے۔ ٹماٹر والا گویا ہوا آنٹی جی! آج کل یہی پیکیج چل رہا ہے۔ بیس روپئے والا پیکیج پچھلے سال تھا''۔

موصوفہ نے رکشہ والے سے کہا۔ ''بھئی ذرا تم ہی تکلیف کرو میں عورت ذات کہاں جالی پھلانگ کر جاؤں اور داماد کو یہ معمولی کام کہتے شرماتی ہوں۔''

یہ سن کر رکشہ والے کی حالت غیر ہوگئی مگر بیجا بحث و مباحثہ بھی اسی کے حق میں مضر تھا۔ مزید وقت کا زیاں ہوتا اس لئے صبر کا دامن تھامے رکھا اور خاموشی سے ایک کلو ٹماٹر کے دام لے کر جالی سے رقم و مال کا تبادلہ کرنے لگا۔

آنٹی نے روزمرہ کے سامان کی فہرست بھی رکشہ والے کو ہی تھمادی اور کہا۔ ''بیٹا! یہ فلاں دوکان پر دے آوتا کہ مال دوسرے دن خود بخود ہمارے مکان پر پہنچ جائے'' ۔ پھر انہیں کسی جوڑے کا میچنگ دوپٹہ اور لیس بھی خریدنا تھی۔ سو موقعہ غنیمت جان کر انہوں نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ادھر رکشہ والے کا پارہ نقطہء اشتعال کو پہنچ رہا تھا اور آنٹی کی بے نیازی و سادگی کا انداز اور کاموں کا انہماک اس بیچارے کو زندہ ذبح کر رہے تھے۔ مگر وہ بیچارہ طوعاً و کرہاً خاموش رہا۔

آنٹی نے موبائل فون پر نہ جانے کس سے کیا کہا کہ دو حمال چاول کی دو بوریاں لے کر رکشہ تک آگئے۔ اب معاملہ برداشت کی حدود سے متجاوز ہوگیا تھا۔ لہذا رکشہ والا پھٹ پڑا یہ رکشہ ہے بیل گاڑی نہیں۔ اگر آپ کو سامان لے جانا ہوتو دوسرا رکشا کرلیں ورنہ اضافی کرایہ دیں میری سواری پہلے ہی کمزور ہے۔ موصوفہ بھی تیوری چڑھا کر بولیں سواری کمزور ہے تو اس کا علاج کرواو یا پھر نئی لے لو اور تمہیں کون سا سر پر بوجھ ڈھو کر لے جانا ہے جو شور مچا رہے ہو؟ اگر میرے ساتھ مہمان نہ ہوتے تو ایسا مزہ چکھاتی کہ یاد رکھتے۔ کیا تم پولس کے سامنے بھی یہی مطالبے کرتے؟ اور یہ کیا تم نے اضافی

www.urduchannel.in

کرائے کی رٹ لگا رکھی ہے؟ جو کرایہ طے کیا تھا وہی دوں گی۔ اس سے ایک روپیہ بھی زیادہ ملنے کی امید نہ رکھنا۔ تم اپنے بال بچوں کو ایسا رزق کیوں کھلاتے ہو جو جائز نہیں ہو۔ رکشہ والے نے بھی آنٹی کے منہ لگنا اور حلال و حرام کی بحث کو عبث جانا اور خاموشی کو عافیت سمجھا۔ اب جہاں ہمارے قدم تھے وہ جگہ چاول کے تھیلوں نے لے لی اور ہم سب نے اکڑوں بیٹھ کر بقیہ سفر طے کیا۔

خدا خدا کرکے ہم خیر سے بدھو گھر کو آئے کے مصداق اپنی سسرال پہنچ گئے۔ آنٹی نے وہی طے شدہ کرایہ ادا کیا اور ریزگاریاں تک اس سے وصول لیں۔ میں نے رکشہ والے کی حالت زار پر تاسف کا اظہار کیا اور میری نگاہوں نے از راہ ہمدردی دور تک رکشہ کا تعاقب کیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے خسر موصوف کے حوصلے، قوت برداشت، بردباری، تحمل اور صبر کی داد دے رہا تھا کہ وہ کشہ والا تو عارضی طور پر آنٹی کے چنگل میں گرفتار ہوا تھا جس کی چند گھنٹوں میں گلو خلاصی ہوگئی۔ مگر انکل (خسر محترم) تو تار عنکبوت کے جال میں جا پھنسے ہیں۔ جہاں ان کے احساسات اور جذبات بھی بقول مرزا غالب یوں رہے ہوں گے۔

قید حیات، بندوغم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔

ایک تبسم کے لئے۔

www.urduchannel.in

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	۵
۲	مفت اخبار بینی	۷
۳	نمک	۱۲
۴	دم	۱۷
۵	دودھ	۲۰
۶	کان	۲۵
۷	نقطہ	۲۹
۸	وقفے سے پہلے، وقفے کے بعد	۳۲
۹	راستہ	۳۵
۱۰	چابک	۳۸
۱۱	انگلی	۴۱
۱۲	اندھیر نگری چوپٹ راج	۴۵
۱۳	کاگا	۴۹
۱۴	پاپی پیٹ۔۔۔۔۔۔	۵۶
۱۵	گدھا	۵۹
۱۶	کوائف مصنف	۶۲

پیش لفظ

غنچے تیری زندگی پہ دل ہلتا ہے
صرف ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے ہنس کے کہا اس چمن میں
بابا! یہ تبسم بھی کسے ملتا ہے

درج بالا رباعی میں جوش ملیح آبادی نے مسکرانے کے عمل کو حاصل حیات قرار دیا ہے لہذا یہی رباعی اس کتاب کا وجہ تسمیہ بنی۔ دور حاضر کی خود غرضی، حالات کی کاکشی اور نفسانفسی مادیت پرستی کا شاخسانہ ہے جو پیہم دل و دماغ کو زیر بار اور مضمحل رکھتی ہے۔ اس بے آب وگیاہ کار زار حیات میں اگر طنز و مزاح کی مختصر سی ایک کوشش بہار بن کر آجائے تو کیا عجب کہ ماحول کی یکسانیت اور معمول کی گھٹن سے فرار کی سبیل نکل آئے اور ہلکی سی مسکراہٹ بھی قاری کے چہرے پر نمودار ہو تو میری دانست میں یہ حقیر کاوش اپنی معراج پالے گی۔ یوں بھی مسکراہٹ کو صدقے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مسکراہٹ دلی کدورت کے دھو دینے کا اہم وسیلہ بھی ہے۔ قارئین کی آرا کا شدت سے انتظار رہے گا۔

میری طنز و مزاح کے مضامین اور انشائیے پر مشتمل سابقہ دونوں تصانیف ''ہوئے جی ہم جو رسوا'' اور ''نمک پاشیاں'' کی کامیابی اور اہل نقد و نظر کی پذیرائی نے تیسری تصنیف کی تیاری پر آمادہ کیا اور مختصر عرصے میں ''ایک تبسم کے لئے'' آپکے ہاتھوں میں ہے۔ جس میں میں نے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ شاید کسی لائق ہوں اور قاری کی توجہ و دلچسپی کا باعث بن

www.urduchannel.in

سکیں۔ اگر پسند کے پیمانے تک رسائی حاصل کرسکیں تو دعاوں سے نوازنے کی درخواست ہے۔

کامیابی کسی واحد عامل کی سزاوار نہیں ہوتی بلکہ ہمہ جہت عوامل کا مرکب ہوتی ہے۔ میں اپنے قارئین، خیر خواہوں اور تنقید نگاروں کا ممنون ہوں جن کے گرانقدر مشورے، پذیرائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کیلئے آمادہ کیا۔ میں 'قلمدان'، 'شیشہ و تیشہ' اور دیگر واٹس اپ گروپس کے منتظمین نیز مقامی تمام انجمنوں ادارۂ نثری ادب، انجمن محبان ادب، مالیگاوں، انجمن ترقی پسند مصنفین، ادارہ ادب اسلامی، انجمن ناموس ادب، انٹرنیشنل افسانچہ فاونڈیشن، مالیگاوں کے صدور و اراکین کا بھی ممنون و سپاس گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تخلیقات پیش کرنے کی اجازت دی اور اس پر مجھے اپنی آراء، تنقید و تبصروں اور مشوروں سے مستفید کیا۔ اسی طرح ان تمام اخبارات و رسائل کے مدیران کا بھی ممنون ہوں۔ جن کی بروقت اشاعت کے سبب احقر کی تخلیقات کو عوامی ترسیل نصیب ہوئی۔

اخیر میں اس کتاب کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت نشر و اشاعت اور پیشکش کے سلسلے میں درجہ بدرجہ جن افراد کا خلوص اور عملی شمولیت حاصل ہے ان کا بھی دست بستہ شکرگذار ہوں۔ اپنے بھانجے اورارد و ادب اطفال کے ابھرتے، شاعر و ادیب و محقق ابو اسامہ (ابن آدم) ہارون الرشید ماسٹر کے علاوہ ڈاکٹر نخشب مسعود صاحب اور میم۔ نون انصاری (عبدالمجید ماسٹر) صاحب کا میں بصمیم قلب ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور نادر مشوروں کے سبب زیر نظر کتاب کی تکمیل ہوسکی۔

احقر: شہزاد بخت (شبؔ) انصاری
۲۳۸، نیو وارڈ، مالیگاوں ضلع ناسک مہاراشٹر
۰۹۳۲۶۵۹۵۷۵۳

۳۵۔مفت اخبار بینی

بے شک روزانہ اخبار بینی احسن و مفید اعادات اور بیداری کا علامیہ ہیں۔ اس سے نہ صرف روزمرہ کی خبروں سے آگہی ہوتی ہے بلکہ اخبار بینی سے بہترین وقت گذاری، ذہنی مٹرگشتی اور اپنے معمول کے ذہنی تناؤ سے عارضی فرار کی سبیل بھی نکل جاتی ہے نیز مفت اشتہارات، اعلانات اور فلموں کی نمائش کے سینما گھر نیز اوقات سے واقفیت اور مطلب براری بھی ہوجاتی ہے اور صحافت کے پیشے کی لاج رہ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ کام بھی مفت ہوجائے تو گویا ہلدی لگے نا پھٹکری رنگ آوے چوکھا۔ لہٰذا مفت اخبار بینی ہمارے معاشرے کا سب سے محبوب مشغلہ ہے۔ اگرچہ ماضی کے تجربات و مشاہدات شاہد ہیں کہ اس مشغلے سے ہماری عادات و اطوار، شعور و افکار یا چال چلن میں قدرے فرق واقع نہیں ہوتا ہے، چونکہ ہم نے نصیحتوں اور فرامین پر عمل نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ بلکہ جہاں تک مفت اردو اخبار بینی کا تعلق ہے یہ عمل اب ملی فرائض اور معاشرتی آداب کی حدود میں شامل ہوچلا ہے۔ ہم محض اس شوق پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ملکی، غیر ملکی، یہودی اور فرقہ وارانہ تعصبات کی سازشوں کے ہاتھ تلاش کرنے اور ان کے پردے فاش کرنے پر بھی تکیہ کرتے ہیں پھر اس پر ستم بالائے ستم ہم اس پر اپنا بخار بہ شکل تنقید و تبصرہ، فقرے بازی، طعنہ زنی پر ہی نہیں نکالتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ چٹکیاں لینے اور بحث و مباحثے پر بھی آمادہ اور تیار رہتے ہیں۔ اس قسم کے کئی کئی گروہ ایک دوسرے کی حمایت اور مخالفت میں برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

اکثر چائے خانوں، حجام کے سیلونوں اور کتب خانوں میں مفت اخبارات بکثرت میسر ہوتے ہیں بہ لفظ دیگر مفت اخبارات کی موجودگی کے سبب مذکورہ مقامات آباد ہوتے ہیں۔

www.urduchannel.in

جنھیں خرید کر پڑھنا ہم اہل اردو کو وبالِ جاں اور عبث معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ہمیں پسماندہ قوم و ملت قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ اردو معاشرہ بہ نسبت اغیار کے زیادہ زبوں حالی کا شکار ہے۔ بقول غالب، مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔ مذکورہ مقامات کے مالکوں کو بھی اپنے گاہکوں کو رجھانے اور باندھے رکھنے کی یہی سبیل ارزاں اور کارگر معلوم ہوتی ہے۔ حال تو یہ ہے کہ چائے فروشوں کی چائے کی کھپت کا میزان اخبارات کی تعداد کا رہین منت ہے۔ جہاں مفت اخبارات کے قاری اخبارات کو نہ صرف اپنا حق جانتے ہیں بلکہ گھنٹوں مفت کی کرسیاں توڑتے کبھی اخبار بینی میں مصروف تو کبھی منتظر فردا نظر آتے ہیں بلکہ انتظار کی کوفت بھی بخوشی برداشت کرجاتے ہیں۔ جہاں وہ ایک پیالی چائے قیمتاً پی کر متعدد اخبارات کا مزہ بالکل مفت اٹھاتے ہیں جس پر آم کے آم، گٹھلیوں کے دام سے موزوں ضرب المثل یوں ہوگی ایک گٹھلی کے عوض کئی قسم کے ذائقہ دار آم۔ پھر اتنے رنگا رنگ اخبارات خریدنے، ان کے سالانہ خریدار بننے کیلئے خلوص، قوت ارادی، سخاوت، سرمایہ اور وقت خرید جیسے عناصر بھی درکار ہوتے ہیں جس کا سب سے زیادہ فقدان اردو معاشرے کو میسر ہے۔ جنھیں پالنا ہماری قوم کے نزدیک فضول خرچی، وقت، سرمائے اور قوت کا زیاں سمجھا جاتا ہے۔

حال تو یہ ہے کہ جوں ہی اخبار چائے خانے تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ مندرجہ بالا کلیہ کی طرح پہلے سے منتظر قارئین اس کے اوراق بلا امتیاز اور اختلاف نہ صرف باہمی رضامندی سے تقسیم کرلیتے ہیں، بلکہ ان کا باہمی تبادلہ بھی خاموشی اور اتفاق سے کرلیا جاتا ہے گویا وہ اخبار نہ ہوا کٹی پتنگ ہوگیا ہو جسے بڑی شائستگی، بردباری و سنجیدگی سے لوٹا گیا ہو۔ آپ کو اتنی باہمی فہمائش اور رواداری کا مظاہرہ شاید ہی کہیں نظر آئے بس اخبار کا الٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا جیسے عمل کی نوبت باقی رہ جاتی ہے، لیکن بے چارے اخبار کا حال زار یہ ہے کہ

پھاڑ کر میرا کفن آدھا ادھر آدھا ادھر

یوں بھی گھر میں اخبار خرید کر تنہا اخبار بینی اور چار دیواری میں سر ماری کا کیا خاک مزہ کہ سوائے خود کلامی کے کوئی چارہ نہ ہو، اپنی آرا ہی صدا بہ صحرا محسوس ہو بقول قاری جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا اور کیا فائدہ ایسی اخبار بینی کا جب اس پر سر محفل سیر حاصل گفتگو اور تبادلہ خیال نہ ہو اور ہم اپنا عندیہ بھی پیش نہ کر سکیں۔ اخبار میں موجود مفت ادبی معمے حل کر سکیں یا سوڈوکو کا لطف لے سکیں۔ ہم اخبارات پر اہم موبائل نمبر، پتے اور دوسری ضروری اہم معلومات درج کر سکیں۔ اخبارات کے املے کی غلطیاں اور کتابت کی خامیوں پر نکتہ چینی کر سکیں۔ خبروں کی صداقت پیشکش اور سیاق اور سباق پر سوال اٹھا سکیں، ان کا باہم موازنہ کر سکیں اور ان پر اپنی زریں آراء کا اظہار کر سکیں۔ اخبار کو دائیں اور بائیں سیاسی میدانوں کا ترجمان نہ گردان سکیں؟

اہل اردو، اہل دانش، اہل علم اپنی زبان کی ترویج و اشاعت، ثقافت اور تہذیب و تمدن کی بقا کیلئے ہمہ وقت نوحہ خواں، دبلے اور فکر مند ہوئے جاتے ہیں۔ جہاں تک اردو صحافت کے پیشے کا تعلق ہے فی زمانہ اردو اخبار جاری کرنا اور اس پر استقامت سے قائم رہنا بہت دشوار گذار عمل ہے، بلکہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے جس کیلئے فرہاد کوہ کن سا جنوں بھی کارفرما ہونا چاہئے بقول علامہ اکبر الہ آبادی

کھینچو، نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو   جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

سنا ہے اخبار کے صحافی بڑے نڈر اور بہادر ہوتے ہیں چونکہ حق کے علم بردار ہوتے ہیں، ہم آنکھیں موند کر ان پر اور ان کی خبروں پر اعتبار کر لیتے ہیں البتہ صحافی حضرات صرف سرکار سے ڈرتے ہیں، ورنہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ لیکن مصلحت کی مجبوریوں تلے دبے پاؤں کب سیاست کا عفریت صحافت کو نگل جاتا ہے اس کی سادہ لوح عوام کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ پہلے یہ حادثات کبھی کبھی رونما

www.urduchannel.in

ہوتے تھے اب تو ہر دوسرا تیسرا اخبار اس دوڑ کا شریک ہے بقول شاعر

تم نے مجھے خرید کے انمول کر دیا

چونکہ صحافت نے بھی سفیدی ترک کر کے زرد چولا دھار لیا ہے۔ ظاہر ہے ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل جیسی سریع الحرکت اور مفت ذرائع ابلاغ کے مقابل اردو اخبارات کا کیا مقام؟ بقول شاعر اعظم مرزا طوسی

ایسے صحافیوں کو بھی، ایوارڈ دیجئے   رائی کو فونٹین سے بناتے ہیں جو پہاڑ

اہل علم کے نزدیک اردو زبان کی بقا، ترویج و اشاعت کا تعلق اخبارات اور رسائل کی خریداری اور مالی منفعت پر موقوف ہے۔ اسی لئے اکثر بیشتر اخبار رسالوں، مجلوں پر کتابوں یا اخبارات پر خرید کر پڑھنے کی تلقین درج ہوتی ہے۔ جسے ہر مدیر بڑے اہتمام سے شائع کر کے اپنے ملی، پیشہ ورانہ اور لسانی فریضے کی تکمیل ضرور کرتا ہے تا کہ اردو زبان و ادب ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے۔ خدا کرے ان کی خوش فہمی نظر بد سے محفوظ رہے۔ (آمین) لیکن مدیران پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ صحافت کے حقوق اگر چہ ادا کرتے ہیں لیکن کاتبوں (دور جدید میں کمپوزر) کی اجرت میں چھرا تیز رکھتے ہیں۔ بقول علامہ گنبد

اخبار چھپانا ہے سو بار چھپا لیکن   اک بات ہے کاتب کی اجرت نہ دبایا کر

جبکہ عام طبقہ اسے اردو دانوں کی خورد و نوشت (دال روٹی) کے مایا جال سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن ہم عوام اسے سگریٹ کے پیکٹ پر درج تعزیری اطلاع (تنبیہ) سگریٹ پینا صحت کیلئے مضر ہے کی طرح عادتاً نظر انداز کر کے پھر سے اپنے معمول کی تعمیل میں مصروف ہو جاتے ہیں گویا آپ نے کچھ پڑھا یا سنا ہی نہیں یہ تو حال ہے عوام کا۔ لیکن اہل علم و فن کی ستم ظریفی دیکھئے یہ کلیہ اور اخلاقی آداب عموماً دوسروں پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر خود اردو دانوں اور اردو کی روزی سے

وابستہ اردو نواز افراد کا جائزہ لیں تو ادراک ہوگا وہ خود بھی اردو اخبارات و رسائل کے خریداروں کی صف سے باہر ہی نہیں کوسوں دور ہوتے ہیں بلکہ اسے شجر ممنوعہ تسلیم کرتے ہیں ۔اب اسے منافقت سے تعبیر کیا جائے یا کفایت و مصلحت سے اس کا فیصلہ ہم قارئین کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ہم اسے صرف بے حسی، لا پرواہی یا عدم بیداری کا شاخسانہ تسلیم کرنے کو ہر گز تیار نہیں ہیں ۔یہ مفید عادت خصوصاً ہماری سرشت میں داخل ہوگئی ہے ۔بقول شوکت تھانوی ہماری قوم کو مفت کی لذت اتنی عزیز ہے کہ ہم صرف ایک روپئے کی پتنگ مفت میں لوٹنے کیلئے کروڑوں کی جان جوکھم میں ڈال دینے سے بھی نہیں چوکتے ہیں ۔لہٰذا مفت اخبار بینی کے مشغلے میں تو کوئی جاں جوکھم کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا پھر اس سے کیوں کر گریز کیا جائے ۔روح فیضؔ سے معذرت کے ساتھ عرض ہے ۔

مفت اخبار بینی محض الزام ہی تو ہے ۔
دشنام تو نہیں ہے یہ اکرام ہی تو ہے ۔

www.urduchannel.in

۳۶۔ نمک

نمک کے نمکین موضوع کا انتخاب کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ نمک کا حق ادا کرنا گویا پلکوں سے نمک چننے کے مترادف ہے اور پھر من آنم کہ من دانم ۔نمک کا خیال کہیں شوریدہ خیال نہ ثابت ہو جائے اس خوف کے زیر اثر ابتدا کرتا ہوں ۔

بھیگے ہوئے پروں سے پرواز کر کے دیکھ
انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کر کے دیکھ

نمک کے کیا کہنے ہیں؟ نمک چکھنے، نمک مرچ لگا کر پیش کرنے، نمک کا قرض اتارنے، نمک کا حق ادا کرنے اور زخموں پر نمک پاشیاں کرنے کیلئے کارآمد ہوتا ہے ۔گو نمک بڑا ارزاں، کارآمد، زود حاصل مگر پکوان کا لازم جزو ہے ۔ہر کس و ناکس کی دسترس میں اور اس کے دسترخوان کی زینت ہوتا ہے ۔جہاں وہ ہر طعام سے قبل تبرکاً چٹکی بھر نمک چکھ کر کھانے کی ابتداً کرتا ہے ۔اگرچہ مقدار میں کم استعمال ہوتا ہے، بس یوں کہ دال میں نمک کے برابر، البتہ نمک کے بغیر غذا کا ذائقہ پھیکا، بے کیف اور چٹخارے مفقود ہو جاتے ہیں ۔اسی طرح نمک اگر میزان سے زیادہ بھی ہو جائے تو اولاً منہ کا مزہ خراب ہو جاتا ہے، مزید کہ اضافی نمک سے خون کا دباؤ بھی اضافی ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے ۔اسلئے نمک کے معاملے میں توازن شرط ہے ۔ورنہ عزت و ناموس پر بھی حرف آ جاتے ہیں ۔یوں تو نمک کی کئی اقسام مشہور و معروف ہیں اور بقدر ضرورت زیر استعمال لائے جاتے ہیں ۔مثلاً کالا نمک، چینی نمک (اجینوموٹو)، سیندھا نمک اور سفید نمک ۔عرف عام میں سفید نمک کو عام نمک کہا جاتا ہے ۔لیکن اسے عام نمک نا سمجھنا ہی دانشمندی کی دلیل ہے ۔اسے عام سمجھنے کی غلطی کرنے والا شخص پانچ ستارہ اسپتالوں کی خصوصی توجہ اکائی (انٹینسیو کیئر یونٹ) میں جگہ پاتا ہے ۔

نمک نا صرف معدنی دولت ہے بلکہ پکوان کے ذائقے کی ضمانت ہے، لیکن شکر ہے اسکے حصول کیلئے کان کنی جیسے دشوار گذار مرحلے کی مشق کی ضرورت پیش نہیں آتی ورنہ یہ شعبہ ہائے پیداوار بھی وزراء اور اہل سیاست کی طمع کی بھینٹ چڑھ جاتا، بلکہ اسے سمندر کا جزو لاینفک کہنا بھی درست ہوگا۔ یہ سمندر سے بے حساب کشید کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے کاروبار سے بے حساب دولت کشید کی جاتی ہے۔ جسے آیوڈائزڈ اور فری فلو نمک کے نام پر اونچے داموں میں فروخت کرنا یا خریدنا ہماری امارت کا علامیہ ہے، نئے امراض کو دعوت دیتا ہے۔ نمک کا قانون بغیر ہتھیار کے بھی توڑا جاتا ہے۔ آزمائش شرط اور تاریخ شاہد ہے۔ نمک کو وہ قدر و منزلت، عزت و شرف حاصل ہے کہ سارے رزق کو ہی نمک پر محمول کر دیا جاتا ہے مثلاً نمک خوار، نمک حلال، نمک، حرام نمک کا حق ادا کرنا اور نمک کا راس آنا وغیرہ۔ نمک خوار کو نمک کا حق ادا کرنا چاہیئے۔ نمک حلال ہونا اور نمک کا حق ادا کرنا عزت اور شرف کی بات ہے، نا کہ نمک حرامی کر کے نمک کو بدنام کرتا پھرے۔

فی زمانہ نا صرف میدان سیاست میں نمک کا حق ادا کرنا حماقت اور موقع سے فیض حاصل کرنا لیاقت کا معیار بنتا جا رہا ہے بلکہ اب دیگر شعبہ جات میں بھی یہی روش کر فرما ہے۔ صرف میدان سیاست میں نمک حلال، نمک حرام، نمک خوار اور نمک فروشوں اور وطن فروشوں میں امتیاز کرنا ناممکن حد تک مشکل ہے۔ اس میدان میں نمک کا اعتبار کرنا ماضی کی روایت تھی اب ان قدیم باوفا افراد جنہوں نے نمک کا حق ادا کیا ان کی تصاویر پر تازہ پھولوں کی مالا بھی نظر نہیں آتی۔ چونکہ زمانہء حال میں یہ تمام واقعات وقت اور وقت کی نزاکت پر منحصر ہیں اور ابن الوقتی ان حضرات کا بنیادی وطیرہ۔ لہٰذا ان سے نمک کا حساب تو یوم حساب پر اٹھا رکھیں۔ یہ سخن دیگر ہے کہ نمکین غذاؤں، چہروں، دوشیزاؤں پر رال ٹپک پڑنا یا ان سے رغبت رکھنا بھی تو انسانی فطرت کی

www.urduchannel.in

کمزوری ہی گردانی جائیگی، جہاں خود پر قابو پانا اور بعض اوقات دل کو سمجھانا مجبوری بن جاتا ہے۔

برسبیل تذکرہ نمک کی ادبی افادیت اور خصوصیت کا ذکر بھی ہو جائے۔ زخموں اور نمک دانوں یعنی نمک پاشیوں کا تعلق بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ ناصح کا مجنوں سے۔ گویا کہ زخموں پر نمک پاشیاں کرنا غمگسار دوستوں اور ہمدردوں کا اہم فریضہ ہوتا ہے ورنہ وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں یا پھر دوستوں کی سازش کا شائبہ محسوس ہوتا ہے۔ نزاکت خیال میں بھلا چچا غالب کا کیا جواب؟ بقول غالب

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا / آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق / سامان صد ہزار نمک داں کئے ہوئے
فراغت اس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے / بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمک داں پر
جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی / نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

سوصوف کی قادرالکلامی اور پختہ سخنوری کو سہ فرشی سلام۔ مرزا غالب کو نمک پاشیوں کا وہ اچھوتا تجربہ رہا کہ نمک کو ردیف جان کر نمک کے متنوع خصوصیات پر مکمل غزل ہی کہہ دی۔ لہٰذا اس غزل کے اشعار کا ذکر موضوع کا متقاضی معلوم ہوتا ہے۔

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلاں بے پرواہ نمک / کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گرد راہ یار ہے سامان ناز زخم دل / ورنہ ہوتا جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو / نالہء بلبل کا درد اور خندہء گل کا نمک
شور جولاں تھا کنار بحر پر کس کا کہ آج / گرد ساحل ہے بہ زخم موجہء دریا نمک
داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ / یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک
چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے / دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضاء نمک
غیر کی منت نا کھینچوں گا پئے توفیر درد / زخم مثل خندہء قاتل ہے سرتاپا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

زمانہء ماضی میں برطانوی تسلط کے دوران نمک کا اچانک مزاج بگڑ گیا۔نمک جو ہمیشہ غربا اور مساکین کے درد کا درماں اور غم کا آنسو ہوا کرتا تھا صرف امرا کو راس آنے لگا تھا۔نمک کے عام دسترس اور غریبوں کے دسترخوان سے دور ہوتے ہی ذائقے پھیکے اور بدمزہ ہونے لگے تھے۔ہمارے پدر قوم گاندھی جی بڑے غریب پرور اور خدا ترس انسان تھے۔ان سے نمک کی بے رخی برداشت نہ ہوسکی۔ پتامہ نے آناً فاناً اپنی ڈنڈی لی، مع قافلہ ڈانڈی کی راہ لی، ستیہ گرہ کر کے بغیر ڈنڈے بازی (عدم تشدد) کے نمک کا قانون توڑ کر برطانوی سامراج کو ڈنڈے کی طاقت دکھا دی۔آخر کار عام نمک کو عام دام پر فروخت ہونے پر مجبور کر دیا۔اہل برطانیہ ہمارے نمک خوار ہو کر ہمارے ہی نمک کا حق ادا کرنے سے منکر تھے۔شاید ان کو ہمارا نمک راس نہ آیا اور بلآخر یہاں سے کوچ کرنا پڑا۔

راشٹر پتامہ کے بعد نمک کے داموں نے تو دوبارہ سر نہیں اٹھایا۔البتہ مذہبی تعصب، علحدگی پسند تحریکوں، فرقہ پرستی، فرقہ پروری، رشوت ستانی، وطن فروشی، خود غرضی اور بے حسی کا فتنہ زبردست طور پر سر ابھارنے لگا ہے اور جنگل کا قانون نافذ ہو رہا ہے اس قانون کو کون توڑے گا؟ یا ہمیں ان تمام کی نمک پاشیوں کو روزانہ مسلسل عذاب کی شکل میں سہنا ہوگا؟ یا یہ عفریت ایک دن ہمیں ہی نمک مرچ لگا کر چٹخارے لیکر اپنا لقمہ بنالے گی؟۔۔۔اور شاید ہی ڈکار بھی لے۔

www.urduchannel.in

۳۷۔دُم

قدرت نے دم تمام جانوروں، حشرات الارض، چرند، پرند، درند اور آبی حیوانات یعنی غیر انسانی مخلوق کو عطا کی ہے صرف حضرت انسان کو مستثنی رکھا کہیں وہ تنازعے، مذاق اور خرمستی کی صورت میں ایک دوسرے کی دم کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔جسم میں دم کا مقام جغرافیائی طور پر جسم کے اخیر حصے پر واقع ہوتا ہے۔جس طرح حضرت انسان کے چہرے بشرے سے تاثرات کی ترجمانی اور جذبات کا اظہار ممکن ہوتا ہے اسی طرح حیوانات کی دم کی حرکت سے ہر قسم کے احساسات اور جذبات کی عکاسی ہو جاتی ہے۔کتے کی ہلتی ہوئی دم وفاداری کی علامت ہے، البتہ انسانوں میں دم ہلانے کا عمل متواتر جاری ہے لیکن اب وفا سے شجر ممنوعہ کی مانند توبہ کر لی ہے۔کتے کی دم جسے ازلی طور پر ٹیڑھے ہونے کی مثال دی جاتی ہے جو سوئے اتفاق بیشتر انسانوں خصوصاً زنانہ فطرت و عادات اطوار سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔کیا کہنے ہیں کتے کی دم کی ضد، اڑیل پن اور ہٹ کہ جسے شائستہ زبان میں مستقل مزاجی کہتے ہیں۔اس کے باب میں کہتے ہیں سو سال بھی پھونکنی میں رکھی جائے تب بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی ہوتی ہے البتہ مردوں کو راہ راست پر لے آتی ہے۔گائے، بیل یا بچھڑے جب مستی میں آجاتے ہیں یا بدک جاتے ہیں تو دم کو بل دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ان کی خرمستی کی علامت ہوتی ہے۔مگر مچھ کی دم شکار میں کارآمد ہوتی ہے، جس کے ایک وار سے شکار کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔چھپکلی کی دم میں کس قدر جان ہوتی ہے کہ وہ چھپکلی کے جسم سے منقطع ہو کر بھی بڑی دیر تک ناخواندہ بیوی کی زبان کی طرح محو رقص رہتی ہے۔گوہ کی گرفت اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ ماضی میں مرہٹہ دور میں گوہ کی دم سے رسی باندھ کر قلعوں میں نقب زنی کی جاتی تھی۔اب ایسی حکمت عملی کی بجائے دم چھلوں کے

سہارے سیاسی جماعتوں میں بہ آسانی نقب زنی کی جاتی ہے

دم سے تمام جانوروں کی آن بان، شان اور پہچان ہے۔ اکثر قصاب اور مویشیوں کے بیوپاری دم اٹھا کر ہی تذکیر و تانیث کا امتیاز کرتے ہیں پھر اس لحاظ سے ان کی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ سفر کے دوران جب مویشی سست روی کا مظاہرہ کرتے ہیں تب دم کو پیچ دے کر ہی مویشیوں کو مہمیز دی جاتی ہے سیاسی قائدین کو انتخابات کے زمانے میں عوام کی دم کے ساتھ یہ عمل خوب تر کرنا ہوتا ہے۔ قدرت نے گلہری، خرگوش اور مور کو دم کی بدولت خوبصورتی عطا کی ہے۔ جس سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔۔ عام مویشیوں کی دم مکھیوں، مچھر اور پسوؤں کے حملے سے بچاؤ کی خاطر کارآمد ہوتی ہے اور دم ہی کے دم سے آبی و ہوائی حیوانات کو سمت وغیرہ تبدیل کرنے میں معاون ہوتی ہے لیکن اہل سیاست جن کے لئے کوئی حد ادب و اخلاق مقرر نہیں کی جا سکتی ہے، دم کے بغیر بھی بڑی خوبصورتی سے اپنے بیانات سے یوٹرن لے لیتے ہیں اور بقدر فائدہ دوسری سیاسی جماعتوں کا رخ اور اقتدار کی سمت کوچ کر لیتے ہیں۔ حتی کہ قدرت نے دمدار ستارے کو بھی دم عطا کی ہے جو برسوں بعد مخصوص اوقات میں ہمارے قائدین کی طرح نظر آجاتا ہے۔

لہذا گو قدرت نے حضرت انسان کو قوت گویائی سے نوازا مگر دم جیسی نعمت سے محروم جانور بنا دیا۔ لیکن انسان کو اپنی اس محرومی کا ہمیشہ احساس ہوتا رہا ہے۔ جسے وہ وقتاً فوقتاً بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے اور یاد دہانی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ مثلاً اگر کسی انسان کو اولاد نرینہ سے محروم ہو تو مستقبل میں اس کی افزائش نسل جاری نہیں رہتی ہے ایسے شخص کو بھی دم کٹا ہوا بزبان عربی ابتر کہتے ہیں۔ جب کسی کی چاپلوسی، خوشامد اور بے جا تعریف درکار ہو تو دم ہلانے کا استعارہ خوب جچتا ہے اگر چہ یہ عمل کتوں کا وطیرہ ہے لیکن مدمقابل کی خوشنودی کی خاطر اور اپنے مفاد کے حصول

www.urduchannel.in

کیلئے یہ عمل کتوں سے مستعار لینے میں ہم کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ جب مشکل حالات میں گرفتار ہوں، راہ فرار اختیار کرنا ناگزیر ہو تو دم دبا کر بھاگ کھڑے ہونا بھی لازمی ہو جاتا ہے اور دانشمندی کا تقاضہ بھی۔ کسی صاحب مال و زر و اختیار کی مصاحبت، ماتحتی یا زیر نگرانی ہونے کو بھی دم چھلا ہونے کا خطاب بھی کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتا ہے۔ عقل سے عاری افراد کو الو کی دم فاختہ کہہ کر ان کو چغد ہونے کا احساس سے باور کرایا جاتا ہے۔ اگر کسی کی کمزوری یا مجبوری کا کوئی پہلو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ آجائے تو اسے اس شخص کی دم ہاتھ میں آجانے پر محمول کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کی کمزوری پر ہاتھ رکھنے کو دم پر پاؤں رکھنے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ تلملا اٹھتا ہے، یہ صفت بھی سانپ کی ہے لیکن اکثر انسانوں پر صد فی صد منطبق ہوتی نظر آتی ہے۔ حتی کہ عاشق کو بھی معشوق کی آمد سے یہی خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں اسے اس معشوق کے انتظار کی قیمت میں اپنی جون ہی نہ تبدیل کرنی پڑ جائے۔ معمولی ترمیم کے ساتھ بقول انور مرزا پوری ملاحظہ فرمائیں۔

مری زندگی کے مالک، مرے دل پہ ہاتھ رکھنا　　ترے آنے کی خوشی میں، مریُ دم نکل نہ جائے

ایک لائق فائق سائنسداں ڈارون کا یہ نظریہ تھا کہ ہمارے جد امجد بھی دم دار تھے جن کی دم کے عدم استعمال کے سبب آہستہ آہستہ معدوم ہوگئی۔ یہ اگر چہ اس کا ذاتی خیال تھا اور غالباً اسی کے آبا و اجداد پر صادق آتا ہوگا۔ ہم اور ہمارے اسلاف اس عجیب الخلقت خیال اور نظریئے سے مبری و مستثنیٰ ہیں۔ رامائن میں دم کی فضیلت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ دم کی بدولت ہی ہنومان نے راون کی لنکا کو نذر آتش کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ لہذا رام راجیہ قائم کرنے کا سہرا دم کے سر جاتا ہے۔ ہماری حالیہ حکومت نے رام راجیہ قائم کرنے کا اعادہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ دیکھئے اب کتنوں کے شامت اعمال اور کتنوں کی دم کی شامت آتی ہے۔

۳۷۔ دودھ

دودھ وہ نعمت الٰہی ہے جسے مالک حقیقی نے بطن مادر سے خالص حالت میں جاری کر کے اپنی مخلوق پر بے پناہ احسان کیا ہے۔ دودھ جسے ہر جاندار کو اس عالم رنگ و بو میں وارد ہوتے ہی بطور پہلا غذائی وظیفہ پیش کیا جاتا ہے۔ دودھ کی وجہ سے بھی ماں کا احترام اور تقدس کیا جاتا ہے لیکن مدمقابل کی غیرت کو للکارنے کیلئے ماں کے دودھ پینے کا تصدیق نامہ بھی طلب کرلیا جاتا ہے کہ ماں کا دودھ پیا ہو تو سامنے آ، یا دو دو ہاتھ کرلے۔ دودھ کو مقدس، لطیف، پاک اور صحت بخش غذا ہونے کا شرف حاصل ہے دودھ میں خصوصاً پہلوانوں کی صحت کا راز پنہاں ہے۔ اسی نسبت سے دودھ رشتوں کے بندھن کا کارآمد جزو ہے۔ معبود حقیقی نے اہل جنت کو دودھ کی نہروں کا وعدہ کیا ہے۔ ماضی میں دودھ شریک بھائی اور دودھ شریک بہن کا رشتہ عام ہوتا تھا۔ فی زمانہ تو حقیقی بھائی اور بہنوں کے جائز حقوق کی ادائیگی کرنا بھی گراں بار گذرتا ہے۔ تو رضاعی رشتوں کے حقوق کا کیا اعتبار۔ لیکن شکر ہے کہ ان کی حرمت اور عزت کا معیار اب بھی قائم و دائم ہے۔

اتفاقاً ازل سے دودھ کا رنگ سفید ہوتا ہے لیکن اس کے کاروبار میں سفیدی سے زیادہ سیاہی کا دخل ہونے سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ شاید سفید رنگ کے ضمن میں مزید تحقیق، مداخلت و ایجاد کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دودھ میں جسقدر بھی پانی ملائیں اس کے سفید رنگ میں واضح فرق نظر نہیں آتا۔ دودھ کی اس خاصیت کا خاطر خواہ فائدہ براہ راست کاروباریوں کو میسر آجاتا ہے۔ لہذا عام گفت وشنید اور ادب میں دودھ کو سفید رنگ کیلئے صنعت تشبیہ کی مضبوط علامت تسلیم کیا گیا ہے مثلاً چاند کو دودھیا روشنی کا منبع اور سفید رنگ کو دودھ کی نسبت بیان

www.urduchannel.in

کیا جاتا ہے۔ بچپن کے ابتدائی دانتوں کو دودھ کے دانت کہا جاتا ہے۔ سفید دانتوں کو بھی دودھ جیسے سفید دانتوں کی تشبیہ دی جاتی ہے۔

دودھ ہماری غذا کا اہم حصہ اور روزمرہ کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر مویشیوں کے دودھ میں گائے، بھینس، اونٹنی، بھیڑ اور بکری کے دودھ عموماً استعمال کرتے ہیں یا مذکورہ مویشیوں کا دودھ کہہ کر فروخت کئے جاتے ہیں بقیہ مویشیوں کے دودھ کو استعمال نہیں کیا جاتا (اگر کیا بھی جاتا ہو تو ہم اس سے نابلد ہیں) البتہ جہاں تک نہ روی پہنچے وہاں تک صدا کوی پہنچے کے مصداق پاگل انصاری کا فرمان ہے

انسانیت کا، دعوی وہ کس، منہ سے کرے — گھٹی میں جس کی شامل ہے دودھ تک گدھی کا

ہے۔ جہاں ہر آن مصنوعی طریقہء کار جیسے انجکشن اور دواؤں پر طبع آزمائی کر کے دودھ کی مقدار میں اضافہ کرنے کی قواعد پر زور دیا جاتا ہے۔ یوں بھی سارے مویشی مل کر جس کثیر مقدار میں دودھ کی پیداوار کرتے ہیں، وہ دنیا کو درکار دودھ کی مقدار کے اعتبار سے ہمیشہ کم پڑ جاتی ہے۔ اسلئے گوالے باقیماندہ دودھ دے کر قدرتی فقدان کا مداوا کرنے کی بھرپور کوشش بطور خدمت کرتے ہیں جو خلقت پر بڑا احسان ہے، ورنہ خلقت کی اس قدر اہم ضرورت کی تلافی اور ڈیمانڈ اور سپلائے کا توازن کیسے ممکن ہو پاتا؟ یہ اور بات کہ محکمہ کے افسران بعد میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے فرائض کبھی کبھی اپنے فریضے کے مطابق انجام دیتے ہیں یا بہ سبب بالائی آمدنی بھول جاتے ہیں۔ لیکن شومئی قسمت سے وہ جب محکمہء انسداد رشوت ستانی (اینٹی کرپشن بیورو) کے ہاتھوں دھر لئے جاتے ہیں۔ بقول مرزا غالب:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

پھر تو دودھ کا جلا بھی چھانچھ پھونک کر پیتا ہے۔

بالائی دودھ کے کاروبار کالازم اور منفعت بخش جزو بلفظ دیگر حاصل عمل ہے۔خالص دودھ سے بالائی، مکھن، اصلی گھی، پنیر، کھویا، لسی، چھانچھ اور دیگر اہم مصنوعات تیار کی جاتی ہیں لیکن باوجود ان مصنوعات (منافع) کے کشید کرنے کے دودھ کا نام خالص اور دودھ کے دام جوں کے توں قائم رکھے جاتے ہیں۔یہ گوالوں کا اپنے صارفین پر احسان ہے۔افسران اعلی و بالا اور بالائی آمدنی کا ساتھ چولی دامن کا ہوتا ہے، بطور مادہ بشکل مائع پانی کے بعد سب سے اہم غذا دودھ ہے۔بقول ابن انشاء دودھ مائع ہے اور مشہور ہے کہ مائع کو مائع ملے، کر کر لمبے ہاتھ۔کیا عجب کہ مائع کو مائع سے ملانے پر بڑا ٹھوس نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔چنانچہ بعض گوالوں نے اسی فارمولے پر عمل کر کے بڑے بڑے مکان کھڑے کر لئے ہیں۔بعض اوقات ٹھوس کو ٹھوس سے ٹکرا کر بھی مائع حاصل کرتے ہیں۔بھینس کو ڈنڈا ٹکرانے سے مائع (دودھ) دیتی ہے۔(بحوالہ: اردو کی آخری کتاب)

دودھ کے خواص سے متاثر ہو کر دودھ سے متعلق چند دعائیں بھی مشہور ہو گئیں تھیں۔دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔شکر کہ یہ دعا بھی ماضی کی گم گشتہ روایت کی مانند عنقاء ہو گئی ہیں۔وہ تو خیر زبانی جمع خرچ کا معاملہ ہے تو قبول وگوارہ ہے ورنہ اس گرانی کے عالم میں اس قدر مہنگی دعا کی عملی تکمیل کے خیال سے ہی چھٹی کا دودھ یاد آجائے، جہاں دودھ پینے کیلئے میسر نہ ہو تو نہانے کا عمل کیونکر ممکن ہو۔آج کا دور پر فطن دور مصروف اور ہنگامی دور ہے، جہاں نا تو خالص دودھ میسر ہے نا ماں کا پیار ہی خالص ہے۔دودھ پیتے بچوں کو ڈبے کے دودھ اور فیڈر سے بہلایا جا رہا ہو، وہاں ملازم پیشہ، مصروف زمانہ ماں کو دولت سمیٹنے اور فیشن پرستی سے اسقدر فرصت، فراغت اور فراوانی کیونکر میسر ہو۔ماں تو خود صبح وشام بھینس کے دودھ کی طلبگار اور خواستگار ہے تا کہ کیلشیم کی کمی پر قابو پاسکے اور حسن کے تحفظ کا سامان بھی ہو۔بچے کا باپ بھی مجبور ہوتا ہے جسے دودھیلی گائے کی

www.urduchannel.in

دولتیاں بھی بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔اس بیچارے کو آخر مالی مفاد اور اقتصادی بجٹ کا معاملہ درپیش ہوتا ہے ورنہ مساوات اقتصادیات اور رشتوں کا توازن بگڑنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔بعض حضرات دوسروں کے مال پر تکیہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔جب ان کو اس قبیح فعل پر ٹوکا جائے تو دوٹوک اعتراف کرنے بھی باز نہیں رہتے کہ جب مانگنے سے دودھ مل جائے تو بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے۔

ہم خاص مذہبی رسومات میں دودھ اور دودھ کی مصنوعات کو ترجیح دیتے ہیں حتی کہ مار آستین کو دودھ پلاتے رہنا اور بلآخر اس سے ڈسا جانا بھی ہماری قدیم عادت ہے۔ہم سال میں ایک مرتبہ ناگ پنچمی کا تیوہار منا کر اپنی اس عظیم عادت کہیں یا غلطی کا جشن بھی منعقد کر لیتے ہیں تا کہ یہ مقدس روایت قائم و دائم رہے۔کھوجہ گری کی چودھویں (پورن ماشی) کی رات کو ابن انشاء کی طرح شب بھر محبوب کے حسن کا چرچہ کرتے ہوئے چاند کو دیکھ کر دودھ بھی پی لیتے ہیں اور اسے محبوب کے چہرے سے مشابہ قرار دے کر خوش بھی ہو جانا بھی باعث اجر وثواب تصور کرتے ہیں۔عیدین میں شیر خورمہ اور سویاں بھی دودھ میں ہی بناتے ہیں، محرم میں دودھ آمیز شربتوں سے پیاس کا مداوا کرتے ہیں اور شہدائے کربلا کو یاد کرتے ہیں ہر چند کہ اپنے والدین کو بھول جاتے ہیں، گنپتی جی کو بھی دودھ پلا کر خوش کر دیتے ہیں رشوت کے لین دین کا رواج ہی ایسا ہے ورنہ کاموں کی تکمیل مشکوک ہو جاتی ہے، کرشن کنھیا کی چور کے مال مکھن، دہی، پنیر اور چکہ وغیرہ دودھ کے بغیر ناممکن ہے اور مادھو کے لنگ مندر پر دودھ کا ابھیشیک (غسل) بھی مقدس مذہبی عقیدہ ہے اگر چہ ہزاروں بچوں کو دودھ میسر نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں سادہ لوحی اور روایات پرستی کا عجیب عالم ہے کہ ہم ہندوستانی روزانہ بھینس کا دودھ بکثرت پیتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے۔لیکن گائے کو ماں تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی دعوی

کرتے ہیں کہ گائے میں تینتیس کروڑ دیوی دیوتا بستے ہیں ۔وہ تو بھینسوں کی اعلیٰ ظرفی ،دریادلی اور رواداری کے صدقے جائیں جو کوئی اعتراض یا حسد کا برتاؤ نہیں کرتی ،ورنہ اگر چہ بھینسیں اس گستاخی پر دودھ کا قافیہ تنگ کردیں یا ہڑتال پر چلی جائیں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے اور عوام کو چھٹی دودھ یاد آجائے ۔یوں بھی رائج ہے کہ بھینس کے آگے بین بجائے اور بھینس بیٹھی پگھرائے ۔

۳۹۔کان

قدرت نے دیواروں کو بھی کان عطا کئے ہیں لہٰذا کچھ بھی کہنے سے قبل اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے ۔قدرت نے انسان اور حیوان کے بشرے کو دو عدد دو کانوں سے دونوں طرف آراستہ کیا تاکہ انسان صرف کام کی بات جذب کرے اور بے مصرف بات کو ایک کان سے سنے اور دوسرے سے باہر نکال کر نظر انداز کردے تاکہ ذہنی تناؤ سے آزاد رہے ۔دونوں کانوں سے نہ صرف چہرے کا توازن اور حسن ووجاہت کا معیار برقرار رہے بلکہ جسم کے مختلف اعضا کا توازن بھی قائم رہے جو کان کا اہم فریضہ بھی ہے ۔کان حسی عضو کا کام کرتے ہیں جو قوت سامعہ کا مظہر ہے ۔حیوانات کے کان تو ان کیلئے خطرات کی حفاظت کیلئے اینٹینا اور راڈار کا کام کرتے ہیں جن سے وہ خطرات کو بھانپ کر حفظ ما تقدم کا نظم کرتے ہیں ۔کان بے حد حساس، کارگر اور اہم حسی عضو ہے جس پر اپنے فائدے کی بات ،کام کی بات ،موسم ،ضرب اور سحر انگیز موسیقی کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے ۔زنانہ اور مردانہ کان بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں ،بلکہ ان کے افعال بھی یکساں ہوتے ہیں البتہ صفات میں قدرے فرق ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں

مردوں کی یہ عام شکایت ہے کہ خواتین کی لن ترانیاں سن سن کر کان پک جاتے ہیں جبکہ خواتین کی عام رائے یہ ہے کہ ہر خاص وعام معاملے میں مردانہ کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی ۔
اس خیال کو شاعر مشرق کی حمایت بھی حاصل ہے   مرد ناداں پر کلام نرم نازک بے اثر ۔
بعض مرد کچے کان کے ہوتے ہیں اور کانوں سنی بات کا یقین اس طرح کر لیتے ہیں گویا اگر کوا کان لے گیا ہو تو ہاتھ سے کان کا وجود محسوس کرنے کی بجائے کوے کے پیچھے بے تحاشہ دوڑ پڑتے ہیں ۔لہٰذا ایسے مرد جلد مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔مرد بارہا خواتین کو کان کھول کر سننے کی

www.urduchannel.in

تاکید کرتے ہیں اور جواباً خواتین کانوں کے بند ہونے کا طعنہ دے کر اپنا پہلو محفوظ کر لیتی ہیں۔ البتہ خواتین کان کی بڑی پکی ہوتی ہیں بالخصوص زنانہ کان بے حد حساس اور تیز ہوتے ہیں جو سردی و گرمی، طمانچے، افواہوں، سربستہ رازوں، اور چٹپٹی خبروں کا اثر بہت جلد قبول کرتے ہیں اور ان باتوں میں حسب عادت نمک مرچ کے اضافے کے بعد چپکے سے کانوں کان فوراً ارسال کر دیتے ہیں گویا حلق سے نکلی فلق کو پہنچی۔ زنانہ محفل یا گفت شنید کے دوران سرگوشیوں (کانا پھوسیوں) کو بھنویں اچکا کر، آنکھیں مٹکا کر، کان لگا کر سننا پھر اللہ کو یاد کر کے اپنی تجربہ کار مخلصانہ آرا دینا اور توبہ توبہ کے اظہار کیلئے دونوں رخساروں پر یکے بعد دیگرے ہلکی ہلکی چپت رسید کرنا بھی زنانہ اعادات واطوار میں شامل ہوتی ہے۔ کان کے دوسرے کئی اہم افعال بھی ہیں جو روزمرہ کے معمول کا حصہ ہیں مثلاً خواتین کا کان چھیدنا تاکہ زیب وزینت کیلئے زیورات آویزاں کئے جاسکیں، بیویوں کا پسندیدہ شیوہ ہوتا ہے اور اپنے سے کمتر ہم جنس خواتین کو طنز بھی کرنا کہ ثابت نہیں ہیں کان لیکن بالیوں کا ارمان۔

شوہروں کے ہمہ وقت کان کھانا وقتاً فوقتاً کان بھرنا اور اس کے برعکس شوہروں کا انداز بے نیازی سے ایک کان سے سننا اور دوسرے کان سے نکال دینا۔ شوہروں کا بیویوں کی فضول باتوں اور روز آنہ کی نت نئی فرمائشوں پر کان نہ دھرنا، جب تشدد برپا نہ کرنا ہو تو سزا کے زمرے میں خاموشی سے کان کا استعمال کرنا مفید ہوتا ہے۔ ماضی میں خاطیوں کے کان کاٹ کر گدھے کی سواری کرا کے عمومی سزا دینے کا رواج تھا۔ بیویوں کی بوقت ضرورت شوہروں کے کانوں کو کھینچ کر سرزنش کرنا کہ دھوبی کا بس نہ چلے تو گدھے کے کان اینٹھے اور اپنے شوہروں کے کان پکا ڈالنا اور نہ سننے پر ان کے کانوں کو پیچ دے کر سزا کا عمل کرنا۔ شوہروں کا غصے کی کیفیت میں حسب ضرورت بیوی کے کان کا ناپ لینا۔ استاد کا اپنے شاگردوں کو کان پکڑ کر مرغ

www.urduchannel.in

بنانا یا اٹھ بیٹھ کروانا، کان کو پیچ دے کر یاد دہانی کروانا وغیرہ۔ بیوی کا شوہر کی اہم معلومات پر کان لگانا، اہم انکشافات پر کان کھڑے کرنا اور اسے مطلوبہ شخصیت کے کان پر ڈالنا اور از راہ راز داری کان میں پرونے کی عادت بھی رائج ہے اور اگر مزید راز داری مقصود ہو تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اس امر کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔

کان کو درجہ ومراتب کی کسوٹی قرار دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کان کے نیچے کا، یعنی زیر دست ہے اور فلاں شخص کان کے اوپر کا ہے سے مراد زبردست ہے۔ کان پر عینک رکھ کر اپنی قوت باصرہ کو درست رکھا جاتا ہے۔ کان ہی کی خاطر مدارت میں آلات موسیقی اور اصلی ونقلی زیورات کی صنعت آباد ہے جن سے کروڑوں افراد کی روزی روٹی کا نظام رواں دواں ہے۔ کان کی لو تک ہاتھ اٹھا کر نماز کی نیت کی جاتی ہے، کان کی لو کھجا کر بھی انکساری کا اظہار نیز التجا واستدعا کی جاتی ہے۔ کان سے اونچا سننے والوں کو کان کی مرمت (ضرب) کی دھمکی دینا، کان میں تیل ڈالنے، کان کا میل صاف کروانے کا مشورہ دینا نیز کان کے علاج کی تلقین کرنا اخلاقی خدمت بھی کہی جاتی ہے۔ کانوں کو سہلا کر بچوں سے اظہار محبت بھی کیا جاتا ہے۔ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ اور معذرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کان میں انگلی ڈال کر حرکت دے کے کان کھجایا جاتا ہے، اذان دی جاتی ہے اور وضو کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ جب کان پڑے آواز سنائی نہ دے تب کان میں انگلی ڈال کر بے ہنگم شور سے پناہ لی جاتی ہے۔ کان کو ہاتھ لگا کر قوالی یا نغموں کا الاپ لیا جاتا ہے۔ کان پر قلم رکھ کر اور قلم کو لبوں میں دبا کر غور، فکر اور تدبر کیا جاتا ہے اور مرزا غالب نے کان پر قلم رکھ کر عام عاشقوں کو اپنے معشوق کی نامہ نگاری کا اعلان یوں کر دیا۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح ، اور گھر سے، کان پر رکھ کر، قلم نکلے

البتہ کان کے درج بالا افعال سے اسے صرف لٹکنے اور لٹکانے والا حسی عضو ہی سمجھنا نہیں

چاہئے۔کان سے کرہ زمیں میں پوشیدہ خزائن الارض مثلاً پتھر کا کوئلہ مختلف دھاتیں، معدنی گیس اور بیش قیمت ہیرے بھی برآمد ہوتے ہیں جن پر ملکوں کی معیشت اور سیاست دانوں کی وزارت اور مالی منفعت کا انحصار ہوتا ہے۔لیکن قربان جائیے حرص وطمع کے بیچارے فضول میں کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالا کرتے کرتے خواری مول لیتے ہیں۔سیانے کہتے ہیں کہ ہیرا کوئلے کی کان میں ہی ملتا ہے چنانچہ کان کھودنے کا عمل جاری رکھا جاتا ہے جب تک زمین کھوکھلی نہ ہو جائے۔لہٰذا کان کنی کی بدولت معدنی دولت اور ان کو غیر مما لک میں فروخت کرکے مزید غیر ملکی دولت حاصل ہوتی ہے۔

www.urduchannel.in

۴۰۔نقطہ

نقطہ یا نکتہ کا املا دو ہی قسم ہوتا ہے لیکن معنویت یکسر جدا جدا ہوتی ہے۔ایک نکتہ صرف دوسروں پر نکتہ چینی کرنے، میں کارآمد ہوتا ہے۔بقول غالب

نکتہ چیں ہے غمِ دل ان کو سنائے نہ بنے

اپنا نکتہ سمجھانے یا سمجھنے اور سیاست دانوں کے عوام الناس کی فلاح کی خاطر چند نکاتی منصوبے بنانے سے زیادہ کارآمد نہیں ہوتا۔اور اس نکتے کی افادیت نکتہ دانوں کو نکتہ بینی اور نکتہ چینی پر آمادہ کرنا بھی ہے بقول غالبؔ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے
ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ داں

اس نکتے کے طبعی وجود پر تحقیق اور منصوبوں کے نکات پر عمل درآمد کا انتظار پیہم جاری رہنے والا عمل ہے۔البتہ دوسرا نقطہ اضافی افادیت اور زود استعمال کے سبب خاصہ مشہور ہے طبعی وجود کا حامل بھی ہے۔باوجود اس کہ ایک نقطہ ءنظر ہوتا ہے جسے خاص عینک کیا خوردبین سے دیکھنے پر بھی کبھی نظر نہیں آتا کیونکہ یہ ذہن کی اپج ہوتا ہے۔یوں تو نقطہ ءنظر ذاتی ملکیت قسم کی شے ہوتی ہے ضروری نہیں کہ دوسرا شخص بھی اس سے اتفاق ہی کرلے چہ جائے کہ اس کا اپنا فائدہ بھی ملحوظ ہو۔ایک نقطہ آغاز ہوتا ہے جہاں سے کسی مرحلے کیلئے شروعات ہوتی ہے پھر انجام چاروناچار خدا کے سپرد کرنا پڑتا ہے کیوں کہ نقطہ انتہا کا ذکر بمشکل تمام کہیں سننے میں آتا ہے،اس کی طبعی حیثیت بھلے ہی کچھ نہ ہو مگر معنوی طور پر ضرور اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔نقطہ بھی عجیب وغریب جادوئی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ہر شعبہ ء حیات میں اپنا انفرادی عمل دخل لیکن معنویت کا جامہ تبدیل کرکے برابر رکھتا ہے۔

عہد قدیم سے ماہرین علم ہندسہ کی متفقہ رائے نقطے سے متعلق یہ ہے کہ نقطہ

سب سے کم جگہ گھیرتا ہے لہذا حسینوں و مہ جبینوں کے رخسار زیبا پر مصنوعی تل بھی اسی نقطے کی رہین منت ہے جو بقول ایک شاعر صاحب نقطے بڑھا رہے ہیں خدا کی کتاب میں ۔ بسا اوقات ایک اور شاعر صاحب کے مطابق یہ نقطہ دولت حسن پر دربان کے فرائض بھی انجام دیتا بھی نظر آتا ہے ۔ نقطے سے تل بنانے کے فن میں اگر غلطی سرزد ہو جائے تو کیا قیامت برپا ہوتی ہے سیاہ مائل رنگت کی خواتین کو دیکھ کر ایک من چلے شاعر نے یہاں تک کہہ دیا کہ

کیا حسن ہے ترا یا فرشتوں کی بھول تھی   وہ تل بنا رہے تھے، سیاہی پھسل گئی

نقطے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک نقطہ سے بے شمار خطوط گذر سکتے ہیں جیسے انسان کے سر سے روزانہ بے شمار مصائب کے تیر گذر جاتے ہیں اور دو نقطوں سے صرف ایک ہی خط گذر سکتا ہے ۔ اس خط کو آپ زوجین میں خط مفاہمت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں ۔ خط بھی نقاط کا مجموعہ ہوتے ہیں جیسے زندگی دکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے ۔ دائرے کا مرکز بھی نقطہ ہوتا ہے، زاویہ و مثلث کا راس بھی نقطہ ہی ہوتا ہے ۔ یہی نہیں خط، زاویئے، مثلث، مربع، مستطیل، مخمس، معین، مسدس، استوانہ اور غرض کہ دیگر اشکال ہندسہ کی تخلیق کا ایک بنیادی جزو یہی نقطہ ہے، خط بھی ایک دوسرے کو کسی نہ کسی نقطے پر ہی قطع کرتے ہیں یعنی ذرا سے نقطے کی حشر سامانیاں دیکھتے جائیں کہ ذرا سی جان ہے مگر کیا کیا نہیں کرتا ۔ علم ہندسہ میں نقطہ بھی زندگی کے حقائق کی مانند اپنے آپ میں منفرد حیثیت اور اہم خصوصیات کا حامل ہے ۔

چنانچہ اردو زبان میں جو صفات بابرکات نقطہ کو حاصل ہیں وہ کسی بھی حرف تہجی کو میسر نہیں ہے جس کے بغیر حروف تہجی بھی یتیم و مسکین اور تلفظ و مفہوم کے زیور سے محروم بھی ہو جاتے ہیں ۔ ایک نقطے کا فرق خواہ وہ اضافہ ہو یا تخفیف قاری اور راقم کے باہمی ذہنی ربط کو منزل مقصود سے گمراہ کر کے دونوں کو تگنی کا ناچ نچانے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ الفاظ کے مفہوم کچھ سے کچھ

www.urduchannel.in

اور ہو جاتے ہیں ۔ قاری اپنی توجہ بار بار مرکوز کرنا چاہتا ہے کہ وہ راقم کا مافی الضمیر سمجھ سکے لیکن نقطے کا فرق مفہوم کو کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جاتا ہے بقول شاعر

ایک نقطے نے کیا، رسوا ہمیں، تو عمر بھر   ہم دعا لکھتے رہے اور وہ دغا پڑھتے رہے

علم حساب میں نقطہ عشری مقام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ گویا ہر نقطے کے اضافے پر اکائی سے دہائی، دہائی سے سیکڑہ، سیکڑہ سے ہزار اور اسی طرح قیمتوں میں لا محدود اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ گویا نقطے کا فرق براہ راست فائدہ اور نقصان کا علامیہ ہے ۔ نقطے کی یہ خصوصیت بینکوں، بنیوں اور سود خوروں کا پسندیدہ ہتھیار ہے جس سے وہ گلا کاٹے بغیر بآسانی بکرے ذبح کر لیتے ہیں اور ان بسمل سود کو علم بھی نہیں ہوتا ۔

علم طبیعات میں نقطہ کبھی گرمی کھا جائے تو کبھی نقطہ ابال یا نقطہ جوش تک رسائی حاصل کر لیتا ہے ۔ جب معاملہ زیادہ گرم ہو تو کبھی نقطہ اشتعال کو پہنچ جاتا ہے جیسے گھروں میں بیویوں کا دماغ اکثر نقطہ اشتعال کی زد میں ہی ہوتا ہے، شوہروں کی خاطر تواضع یا فرضی وعدوں کے بعد مستورات کے دماغ کا پارہ نقطہء انجماد کی طرف بہ مشکل تمام مائل ہوتا ہے ۔ عدسوں کا طول ماسکہ اور بصری پیمانوں کا تعین اسی نقطہء ماسکہ کا رہین منت ہے ۔ علم طبیعات میں نقطہء ابال نقطہ انجماد یا نقطہ جوش، نقطہء پگھلاو اور نقطہ ماسکہ ایک منفرد معنویت و مفہوم کے حامل ہیں ۔

عدالت میں بھی وکیل اپنے مقدمات کی فہمائش، بحث اور عدالتی کاروائی کبھی دفاعی نقطہ ہوتا ہے کبھی استغاثہ کے نقاط کی بحث و مباحثہ قانونی نقطوں کی بنیاد پر ہی کرتا ہے ۔ الغرض نقطے کی اہمیت سے انکار کرنے والا آخر صفر حیثیت کا حامل ہوتا ہے ۔

۴۱۔وقفے سے پہلے،وقفے کے بعد

کسی بھی تقریب میں اگر وقفہ آجائے تو اس دولخت تقریب کے مآثرات بھی مختلف النوع ہوتے ہیں وقفے سے پہلے کی نوعیت خاصی جدا اور وقفے کے بعد کی صورتحال یکسر مختلف اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ یہ تجربہ اکثر فلم بینی کے دوران رہا ہے۔وقفے سے پہلے کا منظر تفریحی ،حوصلہ افزا، قدرے مزاحیہ اور خوش کن ہوتا ہے۔لیکن اصل کہانی اور اس کے المیاتی انجام وقفے کے بعد ہی ترتیب دیئے جاتے ہیں تا کہ ناظرین نصف فلم سے ہی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب نہ ہو جائیں یا جدھر سینگ سمائے ادھر کا رخ نہ کر لیں۔تقریباً یہی کلیہ ہماری ادبی وشعری نشستوں پر بھی یکساں طور پر منطبق ہوتا جاتا ہے۔ابتدائے محفل میں وقفے سے پہلے تو شائقین اردو کا جم غفیر اردو کی محبت میں سخن نوازی، سخن فہمی اور ادب نوازی کے ضمن میں اس جوش وخروش کا مظاہرہ کرتا ہے کہ

اردو کی محبت میں، ہم آشفتہ سروں نے   وہ قرض چکائے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

کی عملی تفسیر نکھر کے سامنے آجاتی ہے فی زمانہ مادی دنیا میں اردو ادب میں دامے درمے قدمے سخنے کی روایت نام ونمود کے قالب میں جلوہ گر بلکہ غالب ہوتی جارہی ہے۔شرکائے میزان اور مہمانان میں صاحب ذوق اور سخن فہم حضرات کی بجائے،میدان دیگر کے جغادریوں مثلاً اصحاب سیاست اور اصحاب مال وزر کو فوقیت حاصل ہوتی ہے جنہیں باون گز کا قد نیز لقب اردو نواز زیادہ عزیز ہوتا ہے۔شرکائے محفل کا عالم شوق اس قدر فزوں تر ہوتا ہے کہ ھال کی گنجائش،نشستوں اور کرسیوں کو بھی تنگی داماں کی شکایت ہو جاتی ہے۔منتظموں کی تگ ودو، میزبانی اور انداز خشونت قدرے بڑھ جاتی ہے۔اس ماحول کو دیکھ کر اردو کا مستقبل تاریک کہنے

www.urduchannel.in

والوں کی عقل پر ترس آتا ہے ان کی کوتاہ بینی کبیدہ خاطر گذرتی ہے۔

وقفے سے پہلے، محفل ادب کے ابتدائی رسوم وقیود کے بعد جب سارے اہل تلامذہ ،مبتدی،نومشق اور سکہ رائج الوقت کہلانے والے شعراوادبائے اردو یکے بعد دیگرے کلام کی پیش کش اور داد و پذیرائی کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔آہستہ آہستہ محفل رنگ پر آجاتی ہے اور ان فنکاروں کو وہ تمام پذیرائی وواہ واہی میسر ہوتی ہے گویا یہی حضرات آبروئے اردو ادب ہوں۔اسی دوران ناظم محفل کا گلا خشکی کا گلہ کرتا ہے تو از راہ ضیافت چائے کا درمیانی وقفے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔لیکن جوں ہی چائے کا وقفہ شروع ہوتا ہے،سامعین محفل ادب خول ادب سے نکل کر مچھلی بازار اور تھیئٹر کے انٹرول کی تصویر بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے،ادب نواز حلقوں میں از راہ فوقیت فلک شگاف قہقہے، بے تکلفانہ مذاق اور سگریٹ نوشی کے دور پوری ادبی فضا کو متعفن کرنے نیز صوتی آلودگی پھیلانے سے قطعیٔ نہیں چوکتے۔معاشرتی اقدار، پاس، لحاظ اور ادب کو تہہ کر کے بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔

وقفے کے بعد پھر ناظم محفل کو ماحول کو احیائے محفل کے لئے سازگار،سنجیدہ،سخن فہم اور بردبار بنانے کی خاطر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانی پڑتی ہیں۔تمہیدی کلام کا اعادہ کرنا پڑتا ہے سامعین کو ان کا ادب نواز اور سخن فہم ہونا بار ہا یاد دلانا پڑتا ہے۔کچھ غیرت دلانی پڑتی ہے تا کہ وہ حلقہ ادب میں لوٹ آئیں اور مقدمین،کہنہ مشق استاد شعراوادبا کو سننے کے لئے حلقہ بگوش اور مستعد ہو جائیں۔لیکن سامعین کی کثیر تعداد (دوتہائی اکثریت جو جوش میں آجائے تو حکومتوں کے رخ تبدیل کر دیں نشستوں سے روگردانی کر کے چل پڑتے ہیں) چائے کی چسکیاں لے کر،سابقہ کلام کو دھوئیں کے مرغولوں میں اڑا کر اپنا راستہ لیتی ہیں۔گویا اردو سے محبت کا سارا دعوی کا تعلق محض چائے نوشی،سگریٹ نوشی اور وقت گذاری اور خوش گپیوں کی نذر ہو جاتا ہے نا کہ گیسوئے اردو کو

سنوارنے اور نکھارنے کے لئے تھا۔ جس مقصد کے تحت یہ محفل برپا کی گئی تھی وہ قحط الرجال کا شکار ہو کر اب وہ صرف ایک تہائی سامعین ادب کے تفنن طبع کی سبیل ہی رہ جاتی ہے۔

وقفے کے بعد سامعین کے حوالوں سے سب سے زیادہ مایوسی ان قادر الکلام، کہنہ مشق اور استاد شعرا و ادبا کو میسر آتی ہے جو سب سے زیادہ توجہ، داد اور حوصلہ افزائی کے سزاوار ہوتے ہیں چونکہ ان کا مقام پیشکش ناظم کی فہرست میں سب سے اخیر میں ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کی جذبہ داد طلبی کہیں یا قوت ارادی کہیں، یا ان کا صبر و استقلال کہیں انہیں اپنی نشستوں پر پامردی سے جمائے رکھتا ہے۔ وہ مقدمین جن سامعین کیلئے خون جگر کشید کر کے لائے تھے وہ تو دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مسکرا کے چل دیئے کی مصداق روانہ ہو جاتے ہیں۔ لہذا بعض جہاندیدہ فنکار ان جنہیں گرم لوہے پر کب ہتھوڑے کی ضرب لگانا ہے اس بات کا درک و شعور ہوتا ہے وہ دیگر مصروفیت کے بہانے اپنا کلام عین اسی وقت پیش کرتے ہیں جب رنگ محفل عروج پر ہوتا ہے۔ بقول شاعر اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے۔ چونکہ وہ وقفے کے بعد کی محرومیوں، ناسپاسیوں اور مایوسیوں کو جھیلنا نہیں چاہتے اور اس کرب سے گذرنا عبث جانتے ہیں لہذا کمال ہوشیاری سے اپنا کام کر جاتے ہیں ورمقدمیں، کہنہ مشق استاد فن حضرات کو وقفے کے بعد کی افتاد کا ہر وہ عذاب سہنا ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ناچار کیا کرے

www.urduchannel.in

۴۲۔ راستہ

راستہ چلنا منہ کا کھیل نہیں ہے، راستے کے درمیان سے چلنا تو گویا جان جوکھم کا کام ہے۔ ذرا توجہ ادھر کی ادھر ہوئی تو راستہ چلنے والے کا پتہ تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ منزل مقصود کی بجائے اسپتال میں سرجنوں کا تختۂ مشق یا ابدی دنیا میں فرشتوں کا مہمان بن کر دائمی مقیم ہو رہتا ہے۔ انسان کے دو ہاتھوں کی مناسبت سے راستے کے دو ہی سرے ہوتے ہیں جن کی وجہ تسمیہ بھی ان ہاتھوں کے ناموں پر ہی موقوف کر دی گئی، مزید تحقیق کو فضول جانا گیا ہے۔ انہی سروں کے درمیان چل کر ہم راہی یا مسافر کی تعریف کے جامے میں آجاتے ہیں۔ لیکن راستے کے کس ہاتھ کے سرے کے سہارے چلنا چاہیئے دنیا کے بیشتر ممالک میں اس موضوع پر حسب عادت اختلاف رائے قائم ہے اور مسافرین شش و پنج میں مبتلا محو سفر ہیں، ہم باشندگان برصغیر ہندو پاک برطانوی روایات کے اسیر ہیں اسلئے بائیں ہاتھ کو ترجیح دے کر اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرتے ہیں، اور اپنی ذہنی غلامی کا کھلا اعتراف کرتے ہیں

راستہ تو عموماً سرکاریں بناتی ہیں اور عادتاً عوام الناس کو ہمیشہ کے لئے ٹیکس ادا کرنے کے راستے پیدا کر دیتی ہیں، لیکن درحقیقت راستوں کا تعین ہمیں از خود کرنا ہوتا ہے تا کہ منزل مقصود تک بآسانی رسائی ہو جائے ورنہ جس گاؤں جانا نہیں اس کا راستہ کیوں پوچھنا بلآخر پشیمانی کے ساتھ راستہ ناپنا پڑتا ہے۔ راستوں میں سنگ میل، راہبر، رہبر، رہزن اور ہمسفر افراد سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ سنگ میل مسافت کی نشاندہی کرتا ہے اور عزم سفر کی دعوت دیتا ہے۔ ہمسفر اچھا ہو تو سفر نہ صرف آسانی سے اور جلد کٹتا ہے بلکہ یادگار اور خوشگوار بھی ہوتا ہے۔ راہبر کو زاد راہ لوٹنے سے علاقہ ہے لہذا جان و مال کا خطرہ لینا ہوتا ہے۔ رہزن کا کردار بھی زبان زد عام ہے کہ راستے سے

بھٹکا دیتے ہیں۔اور کچھ رہروان عشق یہ تمنائے خام رکھتے ہیں کہ

اے رہزن کامل، چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے   اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آجائے

اگر رہبر کی رہنمائی میں منزل مل جائے تو خوش نصیبی جانیئے ورنہ غالب کی طرح شکوہ ہوگا کہ اب کسے راہنما کرے کوئی۔اگر حالات موزوں نہ ہو تو اپنا راستہ لینا بھی عافیت کے لئے مفید ہوتا ہے۔یوں بھی جب حالات ناسازگار اور گنجلک ہوں اور تمام راستے مسدود ہو جائیں تو روایات و معمولات سے پرے نیا راستہ نکالنا پڑتا ہے جس کے لئے گز بھر کا کلیجہ درکار ہوتا ہے جو ہما شما کے بس کا روگ ہرگز نہیں ہوتا۔راستے الگ کرنا اچھے امر کی علامت نہیں ہوتی مگر مفادات کے پیش نظر راستے بہرحال الگ کر لئے جاتے ہیں۔سیانے کہتے ہیں راستے کا اختتام منزل پر ہوتا ہے لیکن گلزار صاحب کا خیال بھی ناقابل تردید ہے کہ

ان عمر سے لمبی سڑکوں کو، منزل پہ پہنچتے دیکھا نہیں یہ
دوڑتی پھرتی رہتی ہیں، ہم نے تو ٹھہرتے دیکھا نہیں

سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ جس کا راستہ سیدھا ہوتا ہے اس کی منزل آسان ہوتی ہے۔غالباً اسی لئے ہم ہر نماز میں اھدنا الصراط المستقیم کہہ کر اللہ سے سیدھا راستہ ہی طلب کرتے ہیں لیکن جونہی نماز سے فارغ ہوتے ہیں دریائے معاصیت میں غوطہ زنی شروع کر دیتے ہیں۔ ماسوا ان ڈیڑھ سیانے اشخاص کے جن کے نزدیک سیدھے راستے کا قطب نما ناک ہے لہٰذا ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جائیے جہاں تک راستہ میسر ہو البتہ جہاں تک منزل ملنے کا سوال ہے یہ مقولہ رائج الوقت ہے کہ فیشن کی دنیا میں گارنٹی کی امید کرنا فضول امر گردانا جاتا ہے، زیادہ اصرار کرنے پر انجام کار کیلئے کسی اسپتال کا پتہ ضرور جیب میں سنبھال کر رکھ لیں، ورنہ بھٹکے ہوئے کو راہ راست پر لانا خاصہ محنت طلب اور دقت کا کام ہوتا ہے بقول فضا ابن فیضی

www.urduchannel.in

ہمارا ضابطہ وہی روایتیں اصول کی   کسی نے اپنا راستہ الگ بنا لیا تو بھول کی

یوں تو انسانی فطرت اور طبیعت کے پیش نظر راستوں کی اپنی کئی اشکال یعنی ٹیڑھے، میڑھے، اونچے، نیچے، لمبے، چوڑے کچے، پکے، شاہراہ، پگڈنڈیاں، موڑ، دوراہے، سہ راہے، چوک، شارٹ کٹ، گول، آڑے، ترچھے، ہموار اور ناہموار جانے، انجانے قسم کے ہوتے ہیں اسی طرح راستے آسان، دشوار اور چھوٹے، بڑے بھی ہوتے ہیں ان راستوں پر قدرتی طور پتھر اور خار بشکل آزمائش بھرے پڑے ہوتے ہیں البتہ ہمارے خیر اندیش اور بہی خواہان بھی ان پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ از راہ خلوص مزید روڑے اٹکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کی صوابدید کے مطابق آبلہ پائی نمک پاشیاں ان کا محبوب ترین مشغلہ اور اظہار عقیدت و محبت کی سبیل ہے۔لہٰذا راستوں کی اپنی عادات و اطوار بھی ہوتی ہیں انہیں نستعلیق جاننا حماقت اور انہیں دشوار جاننا کم ہمتی کی علامت ہوتی ہے۔راستہ چلتا انسان بھی عام آدمی کے حوالے کیلئے استعمال ہوتا ہے ورنہ خاص حضرات و خواتین کی تخصیص کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے بقول ساحر چلنا جیون کی کہانی، رکنا موت کی نشانی ہے۔انسان راستوں سے فرار حاصل کرنا بھی چاہے تو راہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں بقول گلزار

ایک راہ مڑ گئی تو، اور جڑ گئی   میں مڑا تو ساتھ ساتھ راہ مڑ گئی

قدیم داستانوں میں سنا ہے، بحری سفر میں جل پریاں ملاحوں اور ماہی گیروں کو راستے سے بھٹکا دیتی تھیں اور بالآخر انہیں ڈبو دیتی تھیں۔لہٰذا اصل زندگی میں خوابوں کی پریاں بھی انسان کو عشق کے انجان راستوں پر گمراہ کر دینے سے باز نہیں آتیں۔تمام راستوں میں سب سے پُرخطر راستے تو محبت و عشق کے راستے ہیں جن پر اچھے بھلے انسان کی مت ماری جاتی ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

راستے یاد نہیں، راہنما یاد نہیں   کہ مجھے اب تری گلیوں کے سوا یاد نہیں

۴۳۔ چابک

سواریوں میں جتنی اہمیت اس کے اجزائے ترکیبی کی ہوتی ہے جن کے بغیر سواری کی تعریف مکمل نہیں ہو پاتی ان اجزا میں سب سے اہم جزو ہارن ہے۔اگرچہ اس کے بغیر بھی سواریاں چل سکتی ہیں لیکن گونگی سواریوں کو گونگی بیویوں کی طرح ناپسند کر دیا جاتا ہے۔جس کا مقصد سواری کے چلنے سے زیادہ بھیڑ کو قابو کرنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانوں میں یہی کام چابک، کوڑوں اور دیگر ذرائع سے لیا جاتا تھا،اب جسمانی ایذارسانی کی بجائے صوتی یا سمعی ایذارسانی قدرے آسان،تلذذ آمیز اور توجہ مرکوز کرنے کا باعث بھی ہے

راستوں پر ٹریفک کی نکاسی یا کسی حادثے کی پیشگی طور پر اطلاع دینا ہارن بجانے کا مقصد ہوتا تھا۔اب ہارن بجانے کا عمل شوقیہ،شیطانیت کے اظہار،اپنے وجود کا احساس دلانے اور مخصوص اشارے دینے کی سبیل بھی ہو چلا ہے۔پہلے یہ عمل سریلی گھنٹیوں یا ربر کے بھونپو سے لیا جاتا تھا جس سے عوام جنہیں موسیقی سے خاص تعلق ہوتا ہے راستے سے ہٹنا تو درکنار اس سے لطف اندوز ہونے کے راستے تلاش کرنے میں محو ہو جاتے تھے۔لہذا اس عوامی بے رخی اور بے حسی (تجاہل عارفانہ) کے ردعمل میں تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اب بے حد تیز، بے ہنگم، نا شائستہ اور کریہہ قسم کی آوازوں سے لیس ہارن آپ کی سماعتوں پر ضرب لگانے (ہتھوڑے برسانے)،چونکانے،آپ کو جھنجھوڑنے اور عالم ہوش میں لانے کی سبیل بنتے جا رہے ہیں۔فی زمانہ ہارن کی تنوع،اقسام،شدت اور عدم موسیقیت کے کیا کہنے،ہارن کی آواز راہگیروں کے حواس پر یوں سوار ہوتی ہے جیسے روز محشر کا صور پھونکا جا رہا ہو،حضرت اسرافیل بھی مشکوک ہو

www.urduchannel.in

جائیں کہ کس نے میرا رول اڑا لیا ہے۔جدید ہارن ایسے درندوں اور چوپائیوں کی عجیب وغریب آوازوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ مردے بھی قبر سے بھاگ کھڑے ہوں۔بقول انور مسعود

ہو سکتی ہے، کچھ ثقل سماعت، کی شکایت
بے کار کوئی کان بھی ہو سکتا ہے اس سے

اس تنبیہہ کے قطع نظر نوخیز بچے بالے اسے متواتر شرارتاً بجا کر اپنے شیطانی جذبات کی تسکین کر لیتے ہیں۔ پہلے ہارن کی اقسام بھی گاڑیوں کی ساخت پر موقوف ہوتے تھے،اب تو آئے دن مغالطوں کی واردات ہو جاتی ہے اور راہگیر کو اپنی سبکی کا احساس ہو جاتا ہے،جب ہارن بجتا ہے تو گمان ہوتا ہے دیو پیکر گاڑی کی آمد کا لیکن عقب میں دیکھنے پر مریل سا رکشہ یا ایک مکروہ قسم کا اسکوٹر رونما ہوتا ہے اور بے اختیار زبان کہہ اٹھتی ہے ”ہٹ ترے کی۔۔۔۔کھودا پہاڑ نکلا چوہا“

پہلے کچھ مخصوص قسم کے ہارن خاص سواریوں کیلئے مختص تھے۔جن کے دم سے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں،ایمبولنس اور پولس کی گاڑیوں کی شناخت تھی اور اس شناخت سے وابستہ سامعین میں احترام یا احتیاط کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔بقول شاعر

یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا،

اب انہیں بھی ہر خاص وعام نے اپنے معمول کی سواریوں میں زیر استعمال لے لیا ہے۔ہارن بجانے والا بیچارہ بھلا مانس بلکہ معصوم ہوتا ہے۔فی زمانہ اسے محض اپنی وقتی غرض عزیز ہوتی ہے کہ راستہ مل جائے اور سفر مسلسل یکساں رفتار میں جاری رہے۔اسلئے اس کو اپنے ساز عزیز کے کریہہ اور کرخت ہونے کا نہ اندازہ ہوتا ہے اور نہ وہ اس کا احساس ہی کرنا چاہتا ہے کہ اس کے سامع اس ہارن کی سماعت پر کتنے افراد کس قدر اذیت کا شکار ہوتے ہیں۔نہ قرب وجوار کی مساجد اور دیگر عبادت گاہوں کی خموشی اور سکون کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے نہ کسی کی نیند و آرام کا خیال ہی گذرتا ہے، نہ مریضوں کی تکالیف کا احساس کیا جاتا ہے، نہ ہی اس بات سے کوئی سروکار کہ

سامعین کے ذوق لطیف پر یہ ہارن کس طرح شاق گذرتا ہے ۔کاش ایسا کوئی ہارن بھی ایجاد ہو جائے جو قرار واقعیٔ اس قوم کو غفلت سے بیدار کر دے ایک شاعر مشرق علامہ اقبالؒ تھے سو تحریر و تقریر کے حوالوں سے زیادہ کارآمد نہ ثابت ہو سکے ۔

۴۴۔انگلی

انسان کے دونوں ہاتھوں میں اگر چہ انگلیاں دس ہوتی ہیں جو سوئے اتفاق یکساں نہیں ہوتیں لہذا یہ رائج ہے پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ۔ورنہ عدم مساوات کی اس سے بہتر اور تیر بہدف مثال کا ملنا تقریباً ناممکن تھا لیکن ان کے افعال لاتعداد ہوتے ہیں اور ان کی حرکات وسکنات کی معنویت بھی لامحدود ہوتی ہیں ۔ یہ تو انسان کے جذبات، احساسات، رجحانات اور خیالات پر منحصر ہے کہ وہ بے اختیار اور با اختیار انگلیوں کی حرکات وسکنات سے ان کا اظہار کر بیٹھتے ہیں ۔انگلیوں کی افادیت دیکھئے کہ یہ سمت دکھانے، اشارہ کرنے، اعداد وشمار، کے اظہار کے علاوہ تسبیح وتحلیل کام آتی ہیں حتی کہ کیلا فروش بھی مشابہت کے لئے صدائیں لگا تا گذرتا ہے کہ

لیلی کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں، کیلا لے لو کیلا، کیلا لے لو کیلا

چونکہ مرد و زن کے معاملات یکسر (ایک سو اسی درجہ) جدا ہوتے ہیں لہذا انگلیوں کے برتاو میں بھی واضح فرق در آنا نہایت فطری بات ہے یہ زنانہ مخروطی انگلیوں کی صوابدید پر منحصر ہے، وہ ان کو نچا کر اپنا عندیہ ظاہر کرے یا کہ مرد پر انگلی اٹھائے ۔بقول شاعر

جو اٹھاتے تھے مرے حال پہ کل تک انگلی آج وہ دانت میں خود انگلی دباتے ہیں نا

،مرد کو کس طرح انگلی کرے، اسے تگنی کا ناچ نچائیں یا اسے انگلیوں کے اشارے پر نچپائیں یوں تو انگلی دبانا عاشقوں کا وطیرہ ہوتا ہے اور دانتوں تلے انگلی دبا کر تعجب کا اظہار کرنا معشوق کا ردعمل ہوتا ہے بقول غالبؔ

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے

اسی خیال کی نزاکت کو مولانا حسرت موہانی نے اس انداز میں شعر میں باندھا ہے کہ

www.urduchannel.in

تجھ سے ملتے ہی وہ کچھ بیباک ہو جانا مرا　　اور، ترا دانتوں میں وہ، انگلی دبانا یاد ہے

،مرد کے احسانات کو انگلیوں پر شمار کرے، اپنی کرم فرمائیوں کی طویل فہرست گھنٹوں گوش گذار کردے، انگلی کے لبوں پر اشارے سے مرد کی بولتی بند کروادے، انگلی کے اشارے پر بیچارے مرد کو کٹھ پتلی کی طرح نچائے۔ انگلی کی حرکت سے اسے باہر جانے یا اندر آنے یا لوٹ جانے کا اشارہ دے انگلی اٹھا کر اس پر الزم تراشی کرے۔ انگلیاں چٹخا چٹخا کر اسے بد دعاوں اور صلواتوں سے نوازتی رہے اور وقتاً فوقتاً اس کی عیب جوئی کرتی رہے جسے ہر چند کہ یہ چنداں اچھی اعادات واطوار میں شمار نہیں کیا جاتا۔ بقول ناظم انصاری

وہ جامہ زیبی، تمہاری، ارے معاذاللہ　　دانت میں انگلی دباتے ہو کیا کرتے ہو

اساطیری حوالوں میں حسن یوسف کا اعجاز بھی مشہور ہے کہ حضرت یوسف کو دیکھ کر زنان مصر نے انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم معجزے شق القمر میں بھی سرکار کی انگلی کے اشارے پر چاند کے دو لخت ٹکڑے ہوئے اور پھر جڑ گئے۔

جس شوہر کی انگلی پکڑ کر بیوی ازدواجی زندگی کی شروعات کرتی ہے۔ بہت جلد وہ پوہنچوں ہاتھ پکڑ کر شوہر کے کاندھوں تک جا پہنچتی ہے اور شوہر پر حکومت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ خاصہ قدیم قول ہے کہ مرد کدال لے کر بھی گھر کھودنا چاہے تو گھر کھودنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور عورت چاہے تو انگلیوں سے بھی گھر کھو سکتی ہے۔ یہ بات بھی سو فیصد سچ ہے کہ عورت بخوبی جانتی ہے کے سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ گھی نکالنے کے لئے ٹیڑھی انگلی کرنی ہی پڑتی ہے۔ خواتین کو سرخ رنگ سے رغبت ہوتی ہے خواہ وہ سرخ عروسی جوڑا ہو یا حنا سے اپنی انگلیاں سرخ کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے خواہ وہ رنگ حنا یا عاشق کا خون جگر ہو۔ بقول غالبؔ

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور　　دل میں نظر آتی ہے اک بوند لہو کی

www.urduchannel.in

مردوں کا انگلی دکھانا تنبیہ، سرزنش یا دھمکی کی علامت ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انگلی دکھانے والا یہ بھول بیٹھتا ہے کہ بقیہ تین انگلیاں بھی اسے اپنی اصلاح کی دعوت فکر دیتی ہیں۔ انگلیاں چٹخانا احساس کمتری، تذبذب اور شش وپنج کی علامت ہے۔ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں کہہ کر خوش حالی کی داد دی جاتی ہے۔ انگلی سے ہتھیلی پر نسوار یا تمباکو گھستے ہیں، انگلی سے منجن لے کر دانتوں کا خلال کرتے ہیں، انگلیوں سے زلفوں میں خلال کر کے ذہنی تناو کم کیا جاتا ہے، وضو کے دوران مسح کیا جاتا ہے، کسی سے اظہار محبت وشفقت کیا جاتا ہے۔ انگلیوں کی حرکت سے مالک حقیقی کی تسبیح وتحلیل کی جاتی ہے انگلی اٹھا کر اللہ کی توحید کی شہادت دی جاتی ہے،۔ انگلی کی حرکت سے قلم کو جنبش دے، کر منصف مقدموں کے فیصلے رقم کرتا ہے، تمام دفتری بابو اپنا کام بھگتاتے ہیں، بنیا حساب وکتاب کرتا ہے۔ دو انگلیوں کے اشارے انگریزی حرف وی سے فتح مندی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مصور ہو یا سنگتراش، شاعر ہو یا ادیب انگلیوں کی جنبش سے ہی اپنی تخلیق کے عمل سے گذرتے ہیں جن میں ان کا خون جگر شامل ہوتا ہے

درد دل لکھوں کب تک، جاوں ان کو دکھلاوں　　انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

اہل قلم کی پذیرائی ہو یا نہ ہو یہ مجاہد قلم اپنی کوشات میں مصروف ہوتے ہیں۔۔ فیضؔ نے یہ انقلابی شعر کہہ کر تمام اہل قلم کی لاج رکھ لی ہے کہ

متاع ،لوح وقلم، چھن گئی، تو کیا غم ہے　　کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

کچھ سرقہ وچربہ باز ادیب اور متشاعر دن دہاڑے دوسرے شعرا اور ادبا کے کلام کو بغیر ڈکار ہضم کر کے ادبی دنیا میں انگلی کٹا کے شہیدوں کی صف میں شامل ہونے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جن کی قلیل مدت کمیابیوں کو دیکھ کر کہنہ مشق شعرا واد با بھی انگشت بدنداں ہیں۔

۴۵۔اندھیر نگری چوپٹ راج

اندھاپن یوں تو قدرتی عذر ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اندھوں کی کئی قسمیں اپنی ضروریات، ابن الوقتی اور موقع محل کے مطابق وقوع پذیر ہوگئی ہیں۔جن میں کچھ تو قرار واقعی قدرتی طور پر آنکھ کے اندھے ہوتے ہیں اور بعض مصنوعی قسم (مطلب) کے اندھے ہیں۔جو سیاہ عینکیں لگا کر اپنے علاماتی اندھے پن کا برملا اعتراف بھی کرتے رہتے ہیں۔جیسے کچھ عقل کے اندھے اور بعض ساون کے اندھے ہوتے ہیں۔کچھ عقیدے کے اندھے اور بعض تقلید کے اندھے ہوتے ہیں۔فی زمانہ اندھا بن کر گرد وپیش کے ماحول سے ہمدردی کے طفیل مطلب براری کا بہانہ ہاتھ آئے تو وہ خوش بختی کی علامت گردانا جاتا ہے۔شاید ایسے اندھے افراد جو اندھے پن کا سوانگ رچا کر موقع سے فائدہ اٹھانے کے درپے ہوتے ہیں۔یہ افراد اندھوں کے ہاتھ میں لاٹھی تھما کر خود چین کی بانسری بجانا چاہتے ہیں۔لہٰذا انہیں پر یہ ضرب المثل صادق آتی ہے کہ اندھا بانٹے ریوڑیاں ہر پھر اپنوں کو دے۔مذکورہ قسم کے اندھے جس قدر فائدہ اپنے اقربا کے حق میں کشید کرنا چاہیں کشید کرلیں اور بظاہر اندھے پن کا ڈرامہ بھی کرتے رہیں۔بقول رئیس امروہوئی

نگاہوں میں تنزل کے مظاہر　　زبانوں پر ترقی کے فسانے
سیاست کا درخت بے ثمر ایک　　قیادت کے ہزاروں شاخسانے

جس مملکت میں اندھا قانون رائج ہو اور ملک کے تمام افراد کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انہیں اندھا بنانے کے مخصوص سیاسی شائق، اندھوں میں کانے راجہ قبیل کے قائدین اور سیاستدانوں کی بہتات ہو۔ایسی حکومت کو اندھیر نگری چوپٹ راج ہی کہا جاتا ہے۔یوں بھی

www.urduchannel.in

ریاست بے سیاست نہیں ہوتی ہے۔حد تو یہ ہے کہ ہمارے ہی منتخب کردہ آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے سیاست داں قانون کے اندھے پن سے فائدہ اٹھا غیر ملکی دباؤ اور پالیسیوں کے تحت اندھا دھند ایسے اندھے قانون کی تشکیل کر رہے ہیں کہ ساون کے اندھے ملکی وغیر ملکی تاجروں اور سرمایہ داروں کو ملک کی زرخیز منڈی میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آرہی ہے۔بقول رئیس امروہوئی

کون کہتا ہے، معاشی مسئلے ہیں لاعلاج　　ہم اگر چاہیں تو کر سکتے ہیں اپنا علاج
عقل بخشی تھی۔خدا نے حل مشکل کے لئے　　عقل پر بھی ٹیکس لگ جائیں تو اس کا کیا علاج

جہاں تک غفلت میں غرق عوام کا تعلق ہے اب جھوٹ موٹ کے سوتے ہوئے کو کیا جگانا؟ آپ جتنا انہیں سمجھانے اور بیدار کرنے کی کوشش کریں گے یہ اتنا ہی اینٹھیں گے گویا اندھے کے آگے روئے اور اپنے نین کھوئے۔جبکہ ان کا نصب العین غریب عوام کو غربت و ناداری کے اندھے کنویں میں ہمیشہ ہمیش کے لئے ڈھکیل دینا ہے اندھی گلیوں میں ان اندھی راہ کا اندھا مسافر بنا دینا ہے تاکہ کوئی ان کی گہری سازش تک نہ پہنچے۔یعنی آپ ڈوبے تو ڈوبے سنگ اپنے اوروں کو بھی لے ڈوبے۔اس طرح آنکھوں کے سامنے اندھا بنانے کی سازش اندھی قیادت کی اندھی نگرانی میں کر کے عوام کو بنام ترقی اندھا بنانے کا دھندہ شب و روز جاری ہے۔اس خیال کی ترجمانی شاعر مشرق علامہ اقبال نے یوں کی

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

ان حالات پر مگر مچھ کے آنسو بہا کے اندھا ہونے سے بہتر یوں لگا کہ ان حقائق کو ااشکارا کر کے ہمیں بھی سیاہ عینک پہن کر اندھے پن کا سوانگ رچانے اور تمام ذمہ داریوں کا بوجھ کسی اور کے کاندھوں منڈھ دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔بقول شاعر

کاروبارِ سیاست میں کچھ ایسے ہیں بندے   ہیں کردار کے گندے اور عقل کے اندھے
بس ان کو غرض باقی ہے، مال سے زر سے   پبلک کو پھنسانے کے نئے نئے پھندے

ہم بھی بلآخر انسان ہیں سہو ہو جانا بھی فطرت کا تقاضہ ہے۔ لہٰذا ہم میں جب بھی حب الوطنی کا جذبہ جوش مارنے لگے تو ایسی تحریریں بھی قلم سے پھسل ہی جاتی ہیں۔ ہماری حالت زار کچھ یوں ہے کہ آٹے کا چراغ گھر رکھوں تو چوہا کھائے اور باہر رکھوں تو کوا لے جائے۔ جسے عموماً قارئین کی جانب سے پرانا راگ الاپنے پر محمول کیا جاتا ہے یا اندھوں کے شہر میں آئینہ فروخت کرنے کے مترادف تسلیم کیا جاتا ہے۔ سچ ہے جب کاجل میں کوٹھری میں دھبے کا خوف ہی نا ہو تو وطن عزیز کے مفاد کی پرواہ کون کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ اندھی پیسے کتا کھائے اندھوں کی لاٹھی دفتری بابو ہوتے ہیں جو وطن عزیز کی مال و متاع عزت و آبرو کو قسطوں میں فروخت کر رہے ہیں، پھر بھی وفاداری کا دعویٰ قائم رکھتے ہیں گویا آگ لگائے اور تماشہ دیکھے۔ ان میں باہم اتحاد و اتفاق بھی بھلا کا ہوتا ہے، ایک شخص رشوت سے اپنی جیب بھرے گا تو دوسرے کی راہ بھی آسان کر دے گا۔ چونکہ مثل مشہور ہے کہ اندھے کی دعوت کیجئے تو دو آدمی اضافی بلانے پڑتے ہیں۔ لیکن وہ ناداں خدا کی لاٹھی کو بھول جاتے ہیں کہ کسی روز اگر یہ نادیدہ لاٹھی ان پر برس پڑے تو ان کے لئے آسماں پھٹ پڑے گا اور زمیں تنگ ہو جائے گی۔

جب کبھی اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ جائے تو اسے خوش نصیبی کی علامت کہیں گے لیکن یہاں اندھا بننے کا سوانگ ہی اس لئے رچایا جاتا ہے کہ نت نئی بٹیریں روزانہ میسر آئیں اور خوب مزے لے لے کر اڑائی جائیں۔ اگر اس امر کے لئے حالات سازگار ہوں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھ۔ اس کا مزہ جس نے چکھ لیا وہ ہیرا پھیرا کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ اس کام کے بغیر اسے چین میسر نہیں آتا۔ وہ شخص جسے آپ منع کرنے جائیں وہ الٹا آپ کو پند و نصائح کا

www.urduchannel.in

درس دینے لگتا ہے کہ اندھا کیا جانے لالہ کی بہار۔ صحیح ہے جس نے کبھی اس کارگاہ مکر و فریب میں اندھا دھند کمایا نہ ہو وہ اس کی کیفیت اسے کس طرح روشناس ہو سکتا ہے۔ اسے ان باتوں کی لذت کا کیا احساس۔ لیکن ایک بات واضح رہے کہ جس کی ہو سیدھی راہ اس کی منزل آسان۔ اللہ کے دیر ہے اندھیر نہیں ہے

۴۶۔ کاگا

کوا بنیادی طور پر ملنسار طبیعت کا حامل انسانی بستیوں کے قرب و جوار میں رہنے بسنے کا قائل ہے تا کہ وہ انسانوں کو چالاکی عیاری مکاری اور ہوشیاری کی مسلسل تعلیم دیتا رہے۔اسے گرم مرطوب ہوا اور انسانی معاشرے کی جھوٹھن خوب راس آتی ہے۔اسی لئے یہ ایشیائی مما لک کا باشدہ ہے۔اس کے برعکس یورپ کے سرد مما لک اور ان کے باشدوں کی سرد مہری سے کوئے کو قطعی رغبت نہیں ہے۔یوں بھی بچپن سے جوانی اور اخیر عمر تک جس قسم کا رشتہ و رویہ ہم ایشیائی عوام نے کووں سے استوار کیا ہے وہ یورپ کے غیر مجلسی اور خود غرض معاشرے میں کہاں میسر ہو سکتا ہے؟ لہذا کووں سے ہماری دیرینہ رفاقت اور اس کے حوالے ہماری زندگی سے وابستہ ہیں۔نہ بیچاروں کو شکار ہو کر بسمل غذا ہو جانے کا خوف ہے اور نہ ہی وہ حلال پرندوں کی فہرست کا رکن ہیں ورنہ دیگر پرندوں کی طرح کوئے بھی اپنے وجود کی بقا کے لئے رو رہے ہوتے۔

کوئے انسان کے خواص خمسہ کے علاوہ چھٹی حس کے سبب زیادہ حساس ،ہوشیار اور چالاک ہوتے ہیں۔کووں اور بنی نوع انسان کا بڑا دیرینہ رشتہ رہا ہے۔اسی لئے اللہ نے کووں کے ذریعئے ہمیں تعلیم دی جہاں کوے نے انسان کو پس مرگ تدفین کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے۔بصورت دیگر نصف سے زائد دنیا ٹاور آف سائلنس (پارسی طرز تدفین) میں تبدیل ہو چکی ہوتی جہاں بدبو اور تعفن سے دماغ بھر جاتے ،انسانی طبیعت صدا مکدر اور اجیرن ہوتی۔لہذا اس احسان عظیم کے لئے کوئے ہمارے محسن اور اولین استاد ہیں جنہوں نے ہماری آبرو پس مرگ بھی رکھ لی ہیں ورنہ نہ تو مرحومین کی تدفین ہوتی نہ متوفین کی قبریں ہوتیں پھر دوسرا اہم مسئلہ ہوتا پیشگی طے شدہ ملاقات کا ہوتا کہ منکر نکیر کیا آمد اور باز پرس ،جس کے لئے ہر متوفی کو پریشان ہونا

www.urduchannel.in

پڑتا۔بقول مرزا غالبؔ

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

کوئے سے متعلق مثل مشہور ہے کہ پتہ کھڑکا اور کوا سرکا۔لہذا چستی ، پھرتی ، چالاکی ، تیز حسی اور دوسرں کا شکار اچک کر فرار ہو لینے کا فن انسان نے کوے سے ہی سیکھا ہے۔کوا انسانی زندگی میں بچپن میں بھی تفریح طبع کا وسیلہ بنتا ہے اور بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ہمارے سیکھنے کے عمل میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔بچہ ڈیڑھ سال کی عمر میں ابھی مکمل قوت گویائی سے محروم ہوتا ہے تو کے سے رفتہ رفتہ تعارف ہو جاتا ہے۔بچہ توتلی اور معسوم زبان میں کوئے کو اپنی طرف بلاتا ہے۔لہذا بچپن کی تفریح طبع کا ابتدائی حصہ کوئے سے اس طرح وابستہ ہو جاتا ہے کہ نظموں ، کہانیوں اور حکایات کا سلسہ دراز ہوتا ہے جن میں مرکزی کردار کوا ادا کرتا ہے۔ان اصناف میں بھی کوے کی چالاکی انسان کو حالات سے مقابلہ کرنے کا درس دیتی ہے۔مثلاً

ایک کوا پیاسا تھا　　　جنگل جنگل پھرتا تھا
جگ میں پانی تھوڑا تھا　　　کوئے نے ڈالا کنکر
پانی آیا اوپر　　　کوئے نے پیا پانی
ہوگئی ختم کہانی

بچے کی عمر ذرا بڑھ جائے تو چڑیا کووں کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جہاں چڑیا کا گھر تو دال کا ہوتا ہے اور کوئے کا گھر نمک کا ہوتا ہے۔چڑیا کھچڑی بناتی ہے۔جس میں نمک کی مقدار اتفاقاً کم پڑ جاتی ہے لہذا وہ کوئے سے نمک طلب کرتی ہے۔کوا اپنے گھونسلے کی حفاظت کے پیش نظر نمک دینے سے انکار کرتا ہے۔خدا کا کرنا کہ رات بھے تیز بارش میں کوئے کا نمک کا گھونسلہ گھل گھل کر بہہ جاتا

ہے۔اس کہانی میں بچوں کے لئے سبق آموزیت یہ ہے کہ خود غرضی سے گریز اور اخوت اور امداد باہمی پر زور ہونا چاہیئے۔اس بات کا درس پنہاں ہے اسی طرح ایک اور نظم ہے جس میں کوئے کے وسیلے سے درس ملتا ہے۔

دو کوئے تھے ایک بن میں　　بن تھا پہاڑ کے دامن میں
ایک کوئے کو اخروٹ ملا　　مگر نہ اس کو توڑ سکا
دوسرے نے بولا سن بھائی　　اچھی حکمت یاد آئی
اخروٹ کو لے کر ہوا میں چل　　وہاں سے اس کو نیچے پٹک
ٹکڑے، ٹکڑے ہو جائیں گے　　اور ہم دونوں کھا جائیں گے
کائیں کائیں کر لے اڑ جائیں گے

جب بچے کی عمر مشاہدے اور تجزیئے کے ساتھ صحیح اور غلط کی شناخت کرنے لگتا ہے تو کوئے کی بہت تیز چھٹی حس بچے کو بہت متاثر کرتی ہے۔جو خطرات کو کسی بھی ذی روح سے قبل بھانپ کر محو پرواز ہو جاتا ہے۔لہذا کوئے کی اس صلاحیت کی بنیاد پر سیانوں نے اس کے نام کے آگے سیانے کی صفت کا سابقہ متصل کر کے باقاعدہ سیانا کوا قرار دے دیا۔انسان جا بجا حاضر دماغی، عیاری اور مکاری کے وصف سے اپنا مطلب تو نکال لیتا ہے لیکن ایسے شخص کو سیانا کوئے پر محمول کیا جاتا ہے جہاں انسان اپنی کوتاہی کوئے کے روئیے پر منطبق کر کے پاک صاف کردار کا دکھاوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اسی لئے کوئے کی ہر عادات پر اپنی برائیوں کو منڈھ کر انسان نے شرافت کا چولا پہن رکھا ہے۔انسان جب اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے تو کوئے کی صدا پر سدا خائف اور تشویش کا شکار ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کساد بازاری اور کمر توڑ گرانی کے دور میں مہمانوں کی بے وقت آمد کی افتاد نہ آن پڑے اور بجٹ کا توازن بگڑ نہ جائے۔کاندھے تو اول ہی معمول کے

www.urduchannel.in

اخراجات کے بوجھ سے جھکے جا رہے ہوتے ہیں۔ان ناتواں کاندھوں پر مزید بوجھ سے مہمانان گرامی کی آمد بجٹ پر گرانی کا جواز اور رحمت کی بجائے زحمت کا سبب بن جاتے ہیں۔البتہ کووں کے اڑا دینے سے نہ تو مشکل حل ہوتی ہے نا ان کی آمد ٹلتی ہے۔پھر بھی

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے۔

یہ تو برادران وطن کی کہنہ توہم پرستی کے مظاہر ہیں۔کوئے کا کام مہمان کی آمد کی بشارت دے کر انسان کا اقتصادی بجٹ متزلزل کر کے اڑ جانا ہوتا ہے، اسی توہم پرستی نے الووں اور کووں کو باعث نحوست قرار دیا ہے۔ہندو عقائد میں آنجہانی شخص کے شرادھ (برسی) میں متوفی کی من پسند غذا اور منشیات کسی درخت کی اونچی چوٹی سے باندھ کر کوئے کی راہ تکے جانے کا رواج ہے۔سوئے اتفاق کوئی کوا ادھر قریب سے بھی گذرا تو گمان غالب ہو جاتا ہے کہ متوفی کی روح نے اپنی مرغوب غذا اور منشیات سے استفادہ کر لیا ہے۔اس طرح کوئے نہ صرف مردے کے گوشت استفادہ کرتے ہیں بلکہ اس کے نام پر حلوہ پوریا اور منشات بھی ہضم کر لیتے ہیں۔یہ ادا سیاسی لیڈران کو بہت بھائی بلکہ راس آئی ہے پھر کوئے انسان کو دوہرے فائدے کشید کرنے کا ہنر سیکھا دیتے ہیں۔کوئے سے وابستہ یہ واہمہ بھی مشہور ہے کہ سرف کوئے اور گروڈ (شاہین) نے امرت کا مزہ چکھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔اسی لئے کوئے ہمیشہ حادثاتی موت کا شکار ہوتے ہیں اور طبعی موت مرنے سے گریز کرتے ہیں۔یہ تو اچھا ہے ان کے معاشرے میں لائف انشورس کی اسکیم نہیں ہے ورنہ ان کی منڈیروں پر بھی کوئے ہی بولتے نظر آتے اور لائف انشورس کمپنیاں سر پر پیر رکھ کر یا تو فرار ہو جاتیں یا پھر رقم کی ادائیگی کے نام پر کوئے اڑاتیں، چونکہ انسان کو لالچ دے کر فریب دینا آسان ہے سیانے کووں کو ہرگز نہیں چونکہ استاد سے استادی نہیں چلتی۔لیکن ازلی حقیقت یہی ہے کل نفس ذائقۃ الموت

کو ابنیادی طور پر امن پسند پرندہ ہے کائیں کائیں کر کے کان ضرور کھاتا ہے لیکن دیگر پرندوں کی طرح لڑتا جھگڑتا نہیں ہے۔ بہر کیف اگر کوئی کوا مر جائے تو ساری کوا برادری اس کے اطراف جمع ہو کر اجتماعی سوگ و ماتم میں پکار پکار بین کرتے ہیں اور آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔ بقول شبنم کارواری

تارے تمام الو کی آنکھوں میں بس گئے　　چمگادڑوں نے چاند پروں میں چھپا لیا
مرغا کھڑا ہے چونچ میں سورج لئے ہوئے　　کووں نے آسمان ہے سر پر اٹھا لیا

سارا دن اطراف کے پیڑوں پر بسیرا کر کے پورے علاقے کو عارضی طور پر کوا بستی بنا لیتے ہیں۔ انسان نے کووں سے نہ صرف اجتماعی سوگ و ماتم کا طریقہ بھی سیکھا بلکہ اس سے چار قدم آگے بڑھ کر کر احتجاج کے مختلف طریقے زندا مردہ باد، ہرتال اور چکہ جام جیسی تحریکوں سے انقلاب برپا کیا۔ اس طرح پھر کوا انسان کے استاد کے درجے پر فائز نظر آتا ہے

اردو ہندی ادب میں کووں کی ذات اور صفات پر مبنی بیشتر محاورے رائج ہیں جن کے مفہوم بھی دلچسپ ہیں جیسے اکثر بے کار افراد کووں سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں جنہیں کوئے اڑانے کے سوا کوئی کام نہیں۔ کان کے کچے ناسمجھ افراد کو جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ کوا کان لے گیا اس قول کے مترادف، کوے کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ خود ہاتھ سے اپنے کان کی موجودگی محسوس نہیں کرتے۔ دولت کی بے وفائی اور عارضی چمک دمک کے طفیل اسے منڈیر کا کوا ہے کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ حاسدین اور کم ظرف افراد کی بابت کوا اڑتا ہی ہے دھان پکتے ہی ہیں یا کوے کو سا کریں کھیت پکا کریں کی ضرب الامثال بھی معاشرے میں رائج ہیں۔ کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول گیا ایسے تصنع پسند افراد پر صادق آتا جو نقالی کرنے کی بھی اہلیت سے عاری ہیں۔ جھوٹ بولے کوا کاٹے ایسے دروغ گو افراد کی تنبیہ کے لئے کہا جاتا ہے جو اپنی غرض کی

www.urduchannel.in

خاطر فریب دینے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اسے ایک عدد ادبی نام "کاگا" سے سرفراز کیا گیا ہے۔ گو کوا مردہ خور پرندہ ہے لیکن میراں جی کے اس مشہور زمانہ دوہے میں کوئے کے اسی وصف کو علامت بنا کر کہا گیا کہ

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس　　دو نیناں مت کھائیو، ان میں پیا ملن کی آس

علامہ اقبال کی شاعری میں جو وقعت شاہین کو حاصل ہے میر ہاں گل و بلبل کو غالب کے ہاں عندلیب کو میسر ہے اسی طرح بابا غلام فرید گنج شکر کی شاعری کا علامتی پرندہ کاگا ہے۔ جہاں بنی نوع انسان اپنے سیاہ کارناموں کو کالے کوئے کے استعارے کا قالب عطا کر کے خود خوب اجلا بن جاتا ہے۔ سب کے دن پھرتے ہیں کووں کے دن بھی پھر جائیں گے۔ کووں سے متعلق رام چندر جی کا سیا کو کئے گئے ارشاد کے مطابق

رام چندر کہہ گئے سیا سے، ایسا کل جگ آئے گا　　ہنس چگے گا دانہ دنکا، کوا موتی کھائے گا

گو دنیا میں بیشمار تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن ایسا کلجگ کبھی نہ آیا کہ کوئے موتی پر ہی گذر بسر کرتے ہوں۔ کووں کو تلاش بسیار کے بعد بھی بمشکل تمام دانے میسر آتے ہیں، موتی میسر نہیں آتے۔ لہذا یوں سمجھا جائے کہ کلجگ ابھی دور اور سور اسرافیل میں ابھی قدرے تاخیر ہے۔ لہذا سیانے کوئے کی طرح موقع غنیمت جان کر ہمیں بھی کچھ بھلے کام کر لینا چاہیے۔

دوشیزاوں کے ارمان بھی کوئے کے کائیں کائیں کر کے منڈیروں پر بیٹھنے سے متاثر ہوتے ہیں شاید کہیں سے ان کے خوابوں کا شہزادہ ان کی محبت کی تلاش میں سرگرداں آئے گا اور ان سے گھٹنے ٹیک کر ان ہاتھ مانگے گا

مائیں رے مائیں منڈیر پہ تیری بول رہا ہے کاگا
جوگن ہوگئی تیری دلاری، من جوگی سنگ لاگا

بہر کیف انسان نے ازل کائنات سے ہی کووں سےبہت کچھ سیکھا ہے۔مختلف مواقع پر اس کے نمایاں اوصاف کو اجاگر کر کیا پنے مافی الضمیر کا اظہار کیا جاتا ہے۔کہیں کوا کوا خوشخبی دینے والا مبشر بن جاتا ہے۔کہیں نحوست اور کی علامت بن کر جورو جفا کا مستحق کہلاتا ہے۔کبھی چالاک عیار مکار اور ہوشیار کے قالب میں نظر آتا ہے،کہیں اتحاد و اتفاق کا درس دیتا ہے۔البتہ خلاصہ یہ ہے کہ کوے کے نہایت ذہین اور حساس ہونے کے باوجود اس سے متعلق اختراعی قیاسات میں انسانی عقل کا دخل زیادہ ہے۔جو بابے بات میں کووں کا استعارہ استعمال کر کے اپنے عیوب کی بخوبی پردہ پوشی کر لیتا ہے۔آپ خود مشاہدہ وتجربہ کر لیں اگر ہم جھوٹ کہیں تو ہمیں بھی کوا کاٹے۔

www.urduchannel.in

۴۷۔ پاپی پیٹ۔۔۔۔۔

انسان کا دائمی رونا پیٹ کا ہوتا ہے۔اپنے ہر کام کی تکمیل وہ پیٹ کی آڑ لے کر بآسانی کر لیتا ہے۔اس کا ہر پیشۂ عمل خواہ نیک ہو یا بد،تجارت ہو یا شراکت،مضاربت ہو یا ملازمت اس کے اپنے پاپی پیٹ کا سوال ہی کہلاتا ہے یا پیٹ کی آگ بجھانے کا جواز قرار دیا جاتا ہے۔اس کا یہ عذر کہ اسے بال بچوں کے پیٹ پالنے ہیں۔لہٰذا وہ اپنے پیٹ کے لئے ہی سارے گناہ و ثواب کا ذمہ لیتا ہے۔لیکن اگر کسی بھی تناظر میں انسانی آمدنی اور اخراجات کے تناسب میں جو تناسب اسراف وہ درحقیقت پیٹ کے جہنم پر کرنے میں یا شکم پروری کی خاطر کرتا ہے وہ کل آمدنی کا وہ پانچواں حصہ بھی نہیں ہوتا۔بقیہ تمام اخراجات وہ بجائے پیٹ پالنے کے دنیا میں نام و نمود،بیجا رسوم و قیود کی ادائیگی میں،شہرت وعزت اور تصنع کی علامت لائف اسٹائل (معیار زندگی) کی خاطر،اپنی عزت نفس کیلئے جو ہر آن داو پر ہوتی ہے یا کسی متقابل کو متاثر کرنے،جلانے،دکھانے یا جتانے پر سرف کرتا ہے اور بلا وجہ اپنی سادہ زندگی پیٹ کی آڑ میں دوبھر اور معاشیات کو پیچیدہ بنا لیتا ہے۔

موٹا پیٹ (توند) جسے عموماً خوش حالی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ بدحالی کا ساخشانہ ہوسکتا ہے کہ نہ جانے کتنی بیماریوں اور آلائشوں کا مسکن ہو جسے ڈھونا اور اس کی ناز برداری کرنا انسان کی مجبوری ہے۔بقول جوش ملیح آبادی

کہنیاں تکیے کے اندر وزن سے پھولی ہوئی — چست صدری، دائرہ پر توند کے پھنسی ہوئی

جب موٹے پیٹ کا انسان کھلکھلا کر ہنستا ہے تو توند پر زلزلہ طاری ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے توند کی ساری کائنات جسم سے علحدہ متزلزل ومتحرک ہے۔یوں بھی ہنسنے ہنسانے کا سلسلہ جب بہت

زیادہ طول پکڑ لیتا ہے تو اسے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔کسی کے راز کی امانت وحفاظت بھی بات پیٹ میں رکھنے یا پیٹ کے پکے ہونے کی علامت ہے اس عادت سے انسان کا معیار بلند ضرور ہوتا ہے لیکن وہ چٹخارے میسر نہیں آتے جو پیٹ کے ہلکے افراد کا خاصہ ہیں۔جب کسی کے روزگار پر آنچ آتی ہے تو از راہ ہمدردی یہ کہا جاتا ہے کہ بندے کی پیٹھ میں مارو لیکن پیٹ پر نہ مارو۔بمشکل پس انداز کئے گئے مال کو پیٹ کاٹ کر جمع کی گئی رقم کہا جاتا ہے جسے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

کے مصداق جی کو مار کر رقم جمع کی گئی ہوتی ہے۔

پیٹ خواہ موٹا ہو یا نہ ہو مردانہ ہو یا زنانہ ہو، البتہ انسان کو پیٹ کا کھوٹا نہیں ہونا چاہیے ورنہ ہلکے پیٹ کا ہاضمہ بہت جلد خراب ہو جاتا ہے اور زبان خلق نقارہ خدا کے مصداق جا بجا وہ اپنی بدہضمی سے دوسروں کے راز کا افشاء عوام الناس میں تفریحاً کرتا ہے۔اپنے اس قبیح فعل کو بذات خود وہ فخر اور فوقیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔بہر حال یہ عمل مرغوب نہیں ہوتا۔اس کی باتوں سے لطف اندوز ہونے والے عوام نہ صرف پس پشت باتیں بناتے ہیں، بلکہ اسے بدنام بھی کرتے ہیں ۔ستم بالائے ستم اپنی باتیں راز میں بھی رکھتے ہیں اور دوسروں کو احتیاط کی تلقین بھی کرتے ہیں۔یہ اوصاف ناپسندیدہ خواتین میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اور کچھ مرد بھی اس علت کی گرفت میں مردہ خوری کا شغل انجام دینے سے نہیں چوکتے۔جو بات یا کسی کا راز ان کے کانوں پڑ جائے اس کی بلا تحقیق وتصدیق مفت تشہیر وترسیل میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے بلکہ پیٹ سے نئی نئی بات کی اضافت پیدا کر کے اس میں نمک مرچ اور مسالے کی آمیزش کے بعد اسے چٹخارے دار انداز میں چہرے پر مصنوعی حیرت ناک اور تشویش ناک تاثرات بنا کر پیش کرتے ہیں۔کروڑوں روپوں کی مالیت کی ذرائع ابلاغ کی کمپنیاں وہ کارنامے سرانجام نہیں دے سکتی ہیں جو صنف نازک کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے گویا حلق سے نکلی فلک کو پہنچی۔ایسے اوصاف کے حامل مرد و خواتین کو منہ کا میٹھا اور پیٹ کا کھوٹا کہہ کر یاد کیا جاتا ہے جن کے سامنے اہم باتیں کہنے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔اور خم ابرو کے اشارے سے منع بھی کیا جاتا ہے۔چونکہ کسی بات یا کسی کے پوشیدہ معاملات کو صیغہ راز میں رکھنا بھی پیٹ میں رکھنے یا پچانے کے مترادف ہوتا ہے۔حرص ورقابت، حسد ومنافقت بھی پیٹ دکھانے یا پیٹ میں درد اٹھنے کا امر طنزیہ طور پر کہا جاتا ہے۔جسے محاوراتی زبان میں یوں کہا جاتا ہے۔داتا دے اور بھنڈاری کا پیٹ پھوٹے۔

www.urduchannel.in

۴۸۔گدھا

گدھا بظاہر انتہائی مدبر، صابر، خاموش طبع، زبردست قوت تحمل و برداشت کا حامل معصوم ، وفادار اور پالتو جانور ہے لیکن اس تعریف کی جو قیمت گدھوں کی نسلوں نے ادا کی ہے وہ گدھے ہی بخوبی جانتے ہیں۔حضرت انسان تو اس کے دردناک تصور سے ہی کانپ اٹھیں۔اگر گدھے نہ ہوتے تو بنی نوع انسان کی سرزنش کے لئے مثالوں، گالیوں، استعاروں کے مہذب القاب کہاں سے میسر آتے۔محاوروں میں حماقت کے عمل کو گدھوں کی موجودگی کے بغیر کیونکر برتا جاتا۔گدھا کمہاروں، دھوبیوں اور محنت کشوں کا محنت کش ساتھی ہے۔انہیں کیلئے بلا معاوضہ واجرت کام کرتا ہے اور انہیں کی مفت لاٹھیاں بھی کھاتا ہے۔بس الزام حماقت کے سبب اپنی محنت کی صحیح سمت کا تعین نہیں کر پاتا ہے۔انسانی برادری نے حسب عادت گدھوں کی خدمات کا سدا استحصال کیا ہے۔ سخت ترین موسم اور ناگفتہ بہ صحت کے باوجود گدھوں کا تحمل و بردباری سے پیٹھ پر گران بار بوجھ اور موٹی موٹی سواریاں لے کر چلنے کی صلاحیت، خاموش منچلے عاشق کی طرح لات، گھونسوں اور لاٹھیوں سے تواضع۔گدھوں کے لئے دو لفظ شکریے کا کہنا تو درکنار باپ کا مال سمجھ کر انسان گدھوں سے کام تو ہر قسم کے نکال لیتے ہیں اور مطلب براری کے بعد کان پکڑ کر یا لاٹھی سے ہانک دیتے ہیں۔ بقول شاعر

کام اپنا لینے کی خاطر دقتیں کیا کیا نہ دیں
کیسے نظریں پھیر لیں مطلب نکل جانے کے بعد

کبھی کام چور اور ہڈحرام کہہ کر کفران نعمت کرتے ہیں اور اپنی بھڑاس نکالتے ہیں۔نہ جانے بے چاروں کی شکلوں پر یا تقدیر میں کیا لکھا ہوتا ہے؟ جنہیں گدھا ہی سمجھا جاتا ہے۔لہذا یہ کہہ کر گدھوں

www.urduchannel.in

کی تحقیر کرنا انسانی عقل کی طوطا چشمی ہے کہ گدھوں سے ہل چلیں تو بیل کیوں بسائیں۔بس گدھا جہاں ریت دیکھتا ہے جبلتی تقاضے کے سبب فوراً لوٹ پوٹ کر اپنے ذوق کی تسکین کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے۔وہ رینکنے اور دولتی جھاڑنے کی وجہ سے بدنام ہے۔اسے یہی درک نہیں کہ کسے دیکھ کر رینکنا چاہیئے اور کس پر دولتی جھاڑنا مناسب ہوگا، چونکہ وہ بہر حال احمق گدھا اور نرا گدھا ہے موقع پرست انسان تو نہیں ہے۔گدھا جسے عالمی پیمانے پر عمداً یا سہواً حماقت کی علامت قرار دیا جا چکا ہے۔پھر مثال بھی دی جاتی ہے کہ گدھا کیا جانے زعفران کی بہار۔ہر جانور کی اعلی وارفع اور ادنی اقسام ہوتی ہیں لیکن گدھے سے متعلق یہ کہہ کر دامن تہی کی جاتی ہے کہ خر عیسی اگر بنکہ رود چاں بیاید ہنوز کر باشد۔گدھا اگرچہ حمل ونقل میں بے حد کارآمد ہوتا ہے اور ایسے دشوار گذار راستوں کا راہی ہے جہاں اشرف المخلوقات کے قدم بھی ڈگمگا جائیں۔پھر بھی انسان کو یہی شکایت درپیش ہے کہ بڑے بڑے بہہ گئے گدھا بولے کتنا پانی۔گدھا سواری کے لئے بھی کارآمد اور مفید بھی ہے۔مفید ان معنوں میں کہ بوقت مصیبت گدھے سے کود کر فرار ہونا یا جان بچانا قدرے آسان اور کم جوکھم کا سودا ہے یوں بھی رائج ہے کہ گدھا پیٹے گھوڑا نہیں ہوتا۔چونکہ گدھے کی رفتار اور قد بہ نسبت گھوڑے کے کافی مختصر ہوتے ہیں۔اب ملانصیر الدین کو ہی لیجئے۔ملانصیر الدین کی پسندیدہ سواری گدھا تھی اس لئے ملانصیر الدین بھی گدھے کی عقل سے ہی استفادہ کر لیتے تھے۔چہ جائے کہ مشہور ہے کہ گدھوں کی عقل بھی گدھوں کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکی ہے۔برسبیل تذکرہ ایک انگریزی کہانی ''دی مین، ہو ٹرائیڈ ٹو پلیز ایوری بڈی'' کا ذکر بے جا نہ ہوگا جہاں باپ بیٹا گدھا فروخت کرنے کی غرض سے دور دراز کے بازار جاتے ہیں۔باری باری گدھے کی سواری کر کے اخیر میں گدھے کو کاندھوں پر سوار کر کے بلآخر دریا برد کر دیتے ہیں اور گدھے سے زیادہ اپنی حماقت کا اشتہار کر کے گدھا کھو دیتے ہیں اور اپنے گھر نا کام لوٹتے ہیں۔اکثر گدھا سواروں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سوار بڑا گدھا ہے یا اس کو ڈھونے والا بڑا گدھا ہے۔

لن ترانیاں

www.urduchannel.in

فہرست مشمولات

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ و تبصرات	۵
۲	جہیز یا تاوان عمری	۱۲
۳	آنکھیں۔۔۔دل کی ترجماں	۱۷
۴	منہ سے مجھے لگا کہ یوں	۲۳
۵	لسانی شرارت	۳۰
۶	کبھی خاک میں کبھی خاک پر	۳۳
۷	سر کی سرگذشت	۳۸
۸	صحرائی جہاز	۴۵
۹	بات کی بات	۴۹
۱۰	ہارن۔۔۔۔ایک شور ہے وگرنہ	۵۴
۱۱	قرض۔۔۔۔ایک مرض لینا فرض	۵۷
۱۲	شعرا کی چشمک	۶۲
۱۳	اشعار کی زمین پر	۶۷
۱۴	ہل من مزید	۷۱
۱۵	لکیر کا فقیر	۷۵
۱۶	ذوق کے بغیر بے کیف ہے حیات	۷۹
۱۷	تجاوزات (اتی کرمن) کی تجویز	۸۳
۱۸	لفاظیاں	۸۷
۱۹	اشتہار کی اشتہا	۹۲
۲۰	نغمہ ہائے سگاں	۹۷
۲۱	دل کے بہلانے کو۔۔۔۔	۱۰۲
۲۲	کراماتی لوٹا	۱۰۷

پیش لفظ

انشائیہ اگر چہ نئی اصناف سخن میں سب سے مقبول و مرغوب ترین صنف سخن ہے لیکن اس قلیل مدت میں جو آزادیٔ بیاں، شوکت الفاظ، زور بیاں، طنز و مزاح، معنی آفرینی، شگفتگی و ظرافت کا اظہار انشائیوں کے ذریعئے ہوا ہے اسے عوام الناس نے داد و تحسین کی سند سے نوازا ہے۔ کہتے ہیں مزاح مزاج کا حصہ ہے تب ہی وہ فطری بھی معلوم ہوتا ہے۔ انشائیہ انسانی نفسیات، سرشت اور بشری عوامل کا عکاس ہوتا ہے کسی بھی عنوان سے انصاف کرتے وقت انشائیہ نگار درج بالا عوامل کی جھلکیاں ضرور بروئے کار لاتا ہے اور شگفتہ انداز میں اپنا عندیہ پیش کر کے بڑی سرعت سے گذر جاتا ہے۔ اگر چہ مشکل صنف سخن ہونے کے باوجود دیگر اصناف سخن کی بہ نسبت اس صنف میں لکھنے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے، لیکن ان تمام قلم کاروں کو زبردست پذیرائی و پسندیدگی کا اعزاز حاصل رہا ہے۔

انشائیہ کے لطف سے حظ اٹھانے کے لئے اس کی تعریف سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ انشائیہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں لکھنے والا آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کو روانی کے ساتھ تحریر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں افسانے کا لطف، تنقید کا فکری کا عنصر، غزل کا اختصار غرض کھہمہ اقسام کے ادبی رنگ پائے جاتے ہیں۔ انشائیہ کی سب سے بڑی شرط یہ ہے انشائیہ نگار اپنی تمام باتوں میں ایک منطقی ربط پیدا کرتا ہوا دلچسپی برقرار رکھے تا کہ قاری اس کی گرفت سے آزاد نہ ہوسکے ہر چند وہ تحریر کے اختتام تک نہ پہنچ جائے۔ انشائیہ ہمیشہ نامکمل ہونے کا احساس رکھتا ہے۔ ہر صنف سخن کے بعض تقاضے ہوتے ہیں۔ لہذا انشائیہ نگاری کی نزاکت یہ ہے کہ اس صنف سخن میں انشائیہ نگار بات سے بات پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنے انشائیہ میں لطیفوں، نکتہ آفرینیوں اور مزاح سے دلچسپی پیدا کرسکتا ہے، کیوں کہ انشائیہ ایک ہلکی پھلکی صنف سخن ہے۔ اسلئے یہ مکالمے کی سنجیدگی اور بھاری بھرکم انداز کو برداشت نہیں کرسکتی۔ البتہ توازن مشروط ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار کا اسلوب بیان بے حد شگفتہ اور دلکش ہونا چاہیئے۔ تا کہ قاری اکتاہٹ محسوس نہ کرے انشائیہ میں بات کا ہر پہلو بیان ہونا نہیں چاہیئے بلکہ اس کے کچھ پہلو قاری کے ذہن کے لئے بھی چھوڑ دینے چاہئے۔ انشائیہ نگار کو اشاروں، کنائیوں کے تیر و نشتر سے کام لیتے ہوئے اپنی بات کہنا چاہیئے۔ ''کون کیا ہے'' سے ماخوذ

انشائیہ نگار اپنے گرد و پیش کے معمولات سے انشائیہ کے لئے مواد یکجا کرتا ہے۔ ان پر اپنی آرا اور منطقی پہلوؤں کو شگفتہ بیانی کی چاشنی اور طنز و مزاح کے کھٹے میٹھے اسلوب بیاں میں محاوروں اور اشعار کی دلفریب آمیزش سے انشائیہ کا ملغوبہ تیار کرتا ہے۔ اپنی آزادیٔ بیان سے نہ صرف وہ قاری کی تفریح طبع، شگفتگی اور مزاح کا موجب ہوتا ہے بلکہ اسے متن کے حوالے سے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انشائیہ نگار سے کون سا پہلو چھوٹ گیا ہے جو طبع آزمائی سے قاصر رہ گیا ہے۔

میری طنز و مزاح کے مضامین اور انشائیے پر مشتمل سابقہ دونوں تصانیف ''ہوئے جی ہم جو رسوا'' اور ''نمک پاشیاں'' کی کامیابی اور اہل نقد و نظر کی پذیرائی نے تیسری تصنیف ''ایک تبسم کے لئے'' کی تیاری پر آمادہ کیا اور مختصر عرصے میں ''لن ترانیاں'' آپکے ہاتھوں میں ہے۔ جس میں میں نے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ شاید کسی لائق ہوں اور قارئین کو متبسم کرنے نیز ان کی سوچ کو نئی سمت عطا کرنے نیز توجہ و دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ اگر پسند کے پیمانے تک رسائی حاصل کرسکیں تو دعاوں سے نوازنے کی درخواست ہے۔

www.urduchannel.in

کامیابی کسی واحد عامل کی سزاوار نہیں ہوتی بلکہ ہمہ جہت عوامل کا مرکب ہوتی ہے۔

میں اپنے قارئین، مبصرین و خیر خواہوں اور تنقید نگاروں کا ممنون ہوں جن کے گرانقدر مشورے، پذیرائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کیلئے آمادہ کیا جہاں تک مالی تعاون اور حوصلہ افزائی کا معاملہ درپیش ہے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر جملہ اراکین و عملے کا سراپا سپاسگذار و ممنون ہوں جنہوں نے احقر کی یکے بعد دوسری تصنیف کو بھی قابل اعتنا جانا اور شرف قبولیت بخشا۔ نیز مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی کے صدر و اراکین کا بھی ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی نے نئے بال و پر عطا کئے۔

میں مقامی طور پر ادبی نشستیں کے منتظمین، تمام مصنفین و شرکائے محفل کا بھی ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی کے طفیل احقر کی قلم سے مضامین طنز و مزاح و انشائیے رقم ہو سکے۔ 'قلمدان'، 'شیشہ و تیشہ' اور دیگر واٹس اپ گروپس کے منتظمین نیز مقامی تمام انجمنوں ادارۂ نثری ادب، انجمن محبان ادب، مالیگاؤں، انجمن ترقی پسند مصنفین، ادارہ ادب اسلامی، انجمن ناموس ادب، انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن، مالیگاؤں کے صدور و اراکین کا بھی ممنون و سپاس گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تخلیقات پیش کرنے کی اجازت دی اور اس پر مجھے اپنی آراء، تنقید و تبصروں اور مشوروں سے مستفید کیا۔ اسی طرح ان تمام اخبارات و رسائل کے مدیران کا بھی ممنون ہوں۔ جن کی بروقت اشاعت کے سبب احقر کی تخلیقات کو عوامی ترسیل نصیب ہوئی۔ اخیر میں اس کتاب کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت نشر و اشاعت اور پیشکش کے سلسلے میں درجہ بدرجہ جن افراد کا خلوص اور عملی شمولیت حاصل ہے ان کا بھی دست بستہ شکرگذار ہوں۔ اپنے محبی و مکرمی محمد ارشد حافظ عقیل احمد (مالک مطبع ہمدم پریس، سردار نگر مالیگاؤں کا میں بصمیم قلب ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور نادر مشوروں کے سبب زیر نظر کتاب کی تکمیل ہو سکی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ **احقر: شہزاد بخت**

www.urduchannel.in

۴۹۔ جہیز یا تاوان عمری

جہیز ایک قبیح و پرانی رسم ہے جسے عموماً برا خیال کیا جاتا ہے البتہ سینے سے لگا کر رکھنا بھی تیسری دنیا کا تہذیبی و معاشرتی وطیرہ ہے۔ اس رسم کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے مگر کامیابی ہاتھ نہیں آتی۔ اگر یہ رسم جہیز وجود میں نہ آتی تو ہماری ریاست مہاراشٹر کو سات جزائر پر مبنی شہر ممبئی بھی میسر نہ ہوتا۔ اخبار کی سرخیوں، مہیلا منڈل کی نام نہاد تحریکات، جہیز مخالف غیر حکومتی ادارے NGOs، معاشرتی ناولوں، ماہناموں، خواتین مصنفین اور اس المیئے پر مگر مچھ کے آنسو بہانے والوں کو ایسے چٹ پٹے و ہاٹ کیک کی طرح مقصود موضوع کہاں سے میسر آتے، اشیائے جہیز کی صنعت وجود میں نہ آتی تو شرح بے روزگاری میں زبردست اضافے کا امکان ہوتا معیشت اپاہج ہوتی۔ گویا سارا معاشرہ جہیز کے عدم وجود سے عدم توازن کا شکار ہو جاتا اور درج بالا افراد کو بغلیں بجانے کا موقع میسر نہ آتا جن کو بغلیں جھانکنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی ہے۔

جہیز کو لعنت کہہ کر اس کے خاتمے کے لئے جتنی جدوجہد کی گئی ہے سب بے سود ثابت ہوئی ہے۔ یہ رسم کہنہ بھی بڑی سخت جان ہے۔ اتنی ہی شدت سے پھل پھول کر اپنی سابقہ ہئیت سے بڑی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ لہٰذا اسے مٹانے کی کوشش ناتمام کا سلسلہ عبث ہے بلکہ اس کے فیض سے فوائد کشید کرنے کا فن زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ انسانی نفسیات بھی یہی کہتی ہے میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو۔ نصیحت و فضیحت اغیار کے لئے اور جہیز کے سارے فیض اپنے حصے میں۔ جہیز نوشہ یعنی نو آموز شوہر کے لئے اگر مطالبے کے عوض ہو تو مشروط حاصل حیات

دولت (بہ شکل تاوان) ہوتی ہے۔ اگر مطالبے کی پاداش میں نہ ہو تو نعمت غیر مترقبہ سے ہر گز کم نہیں ہوتی ہے۔ نوشہ کی نیت بھی خوب تعلیق ہوتی ہے کہ خود منہ سے نہ مانگو کہ طمع پرور یا لالچی کے القاب سے یاد کیا جائے ہاں مگر شوربے کے زور سے جو بھی میسر آجائے تو سر تسلیم خم انکار بھی نہیں۔ غیرت مند اور خود دار نوشہ اگر چہ جہیز سے انکار کریں یا اسے اپنی مردانگی کے منافی تصور کریں کہ اپنے زور بازو کی بجائے کیوں نو وارد دلہن کے عطیہ پر تکیہ کیا جائے؟ تو ایسے سر پھرے نوشہ معاشرے اور اپنے اہل خانہ کے باغی قرار دیئے جاتے ہیں اور سسرالی بھی ان کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ بندہ آسانی سے قابو میں آنے کی چیز نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ خواتین بھی کمال ہوشیاری سے یہ کہنا نہیں بھولتیں۔ والدین نے جو کچھ دیا ہے اپنی بیٹی کے آرام و سکون کی خاطر دیا ہے۔

مشرقی اقدار کی بے شمار خوبیوں میں سے بیشتر ممتاز اوصاف یہ بھی ہیں کہ عزیز از جان وارث بیٹے کے لئے چاند کا ٹکڑا بہو کی تلاش میں فی زمانہ جن عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے ان میں خوب صورت، خوب سیرت، برسر ملازمت کے علاوہ توقعات سے زیادہ عمدہ جہیز بھی لانے کی متحمل ہو تو صورت انتخاب آسان ہو جاتی ہے۔ اس طرح بر سبیل نکاح چاؤ سے پلے لاڈلے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے اخراجات کو بعوض جہیز نقد کر لیا جاتا ہے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس کی دہائی بھی دی جاتی ہے تا کہ دوسروں کے لئے باعث حوالہ، عبرت و تقلید ہوں۔ دوسرا اہم امر یہ کہ اکثر خانوادوں میں دلہن سے محبت، حسن سلوک اور اس کی عزت و قدر و منزلت کا پیمانہ اس کے اخلاق و اداب، طور طریق اور ہنر مندی کی بہ نسبت اس کے جہیز کی کمیت اور مالیت سے طے کیا جاتا ہے۔ خواتین میں جہیز کے تعلق سے خاصی حسد، مسابقاتی رویہ، رسہ کشی اور مقابلہ آرائی کا معاملہ بھی سامنے آتا ہے اور اس کے وحشت ناک اور بھیانک رد عمل اخبارات کی سرخیوں میں نظر آتے ہیں۔ حسن تحریر کی

www.urduchannel.in

خاطر ہم جہیز کے تاریک پہلوؤں سے پہلو تہی کرتے ہیں اور اپنی نظر جہیز کے رخ روشن پر مرکوز کرتے ہیں۔ جن پر تمام والدین کی نظر مرکوز ہوتی ہے۔

لہٰذا دلہن کے والدین کے نزدیک اعلیٰ و ارفع جہیز ہی ان کی بیٹی کی آئندہ خوشگوار مستقبل و حیات کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ بچی کے پیدا ہونے سے رخصت ہونے تک وہ سارا سرمایہ، وقت، طاقت اور محنت صرف جہیز جٹانے میں صرف کر دیتے ہیں اور ان لایعنی مصروفیات میں الجھ کر اپنی بیٹیوں کی دیگر اقسام کی تربیت کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں جن پر ساری ازدواجی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ لہٰذا جہیز کی تیاری میں والدین کا اپنی صوابدید سے زیادہ خرچ کرنے کی سعادت حاصل کئے بغیر بہترین والدین قرار پانا یکسر ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہیز کے ناقابل استعمال ساز و سامان کو اپنی مرضی و پسند کے مکان میں سجا کر نئی زندگی کا آغاز کرنے کے بہانے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت اور محبت کے تقاضے کے پیش نظر دل کے کسی گوشے میں یہ ایک اور نیک جذبہ بھی کارفرماں ہوتا ہے کہ جب کبھی نوشہ کو اس کے اہل خانہ مشترکہ نظام معیشت سے خارج از جنت کر دیں تو وہ بے چارہ انہیں چار تنکوں کی بنیاد پر اپنے آشیانے کی بنیاد ڈالے جہاں ان کی ازلی خواہش کے عین مطابق بلا شرکت غیرے ان کی نور نظر لخت جگر صحیح معنوں میں رانی بن کر راج کر سکے۔ اس طرح دلہن کے والدین بھاری بھرکم جہیز کے ساتھ ایک پری نما سوختہ جاں مستقل مصیبت بھی نوشہ کے گلے میں باندھ دیتے ہیں۔

جہیز دراصل وہ عظیم المرتبت و متبرک ساز و سامان ہے جو بہ شکل احسان نو وارد مستقل مہمان (دلہن) کے ہمراہ نوشہ کے مکان پر لایا جاتا ہے تو نوشہ اسے بقدر نا تجربہ کاری اپنا تحفہ سمجھ بیٹھتا ہے لیکن جہیز کی ایک پیالی یا شیشے کا گلاس بھی ٹوٹ جائے تو نوشہ کو جہیز کی قدر و قیمت، اپنی اصلیت اور بیوی کے غضب ناک ہونے کا احساس بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جہیز کا

شان نزول یہ ہوتا ہے کہ ہمہ وقت دلہن اس احسان تلے نوشہ کو دبا کے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرتی رہے ۔عرف عام میں جہیز جسے شریک حیات ازدواجی سفر میں دوران نکاح اپنا زاد راہ بنا کرلاتی ہے اور نوشہ کی ہم سفر حیات بن جاتی ہیں ۔وہ شادی شدہ زندگی میں ان جہیز کی اشیا کو غایت درجہ احتیاط سے استعمال کرتی ہے لیکن دلہن ہر بات بے بات پر برموقع برمحل یہ جتانے سے باز نہیں آتی کہ یہ ان کے جہیز کا سامان ہے جسے ان کے فلاں رشتہ دار نے بڑی محبت وخلوص سے یہ مخصوص شہ بڑے چاؤ سے جہیز میں دی تھی ۔جہیز کے سامان سے متعلق شوہر اگر چہ یہ تصور کرے کہ میاں بیوی میں ہر چیز مشترک ہے لہذا وہ بھی جہیز کے سامان کا اتنا ہی حقدار ہے جتنی بیوی اس کی مالک ومختار ہوتی ہے ۔ یہ اس کی معصومانہ غلط فہمی کے سوا کچھ بھی نہیں چونکہ جہیز کے سامان میں میکے کی خوبصورت یادیں، میکے کی محبت اور الفت کے جذبات سے فزوں ترکما حقہ ملکیت کے احساسات وابستہ ہوتے ہیں ۔

جہیز کی طویل فہرست خواتین کونسل درنسل ازبر ہوتی ہیں اور ان سے وابستہ یادیں اور کس کی طرف سے، کس موقع پر، کون سی شہ جہیز میں آئی ہیں اس کی یادداشت میں پیوست ہوتی ہیں ۔ مرد اگر اس کا حساب رکھنا چاہے تو اسے یاد رکھنے کے لئے علحدہ دفتر درکار ہے جسے برسوں صدیوں یاد رکھنا بھی خواتین کا ہی وصف خاص ہے ۔خواتین تفصیل سے کہہ سکتی ہیں کہ کس نے کس کی شادی میں کیا دیا تھا اس کی قیمت، رنگ، قسم، معیار اور خوبصورتی پر کلام بھی اتنی صراحت سے کیا جاتا ہے ۔جس میں اپنی بالادستی کا ذیادہ عمل دخل ہوتا ہے ۔بطور ردعمل ہم کو ان کے ہاں کیا جہیز دیا جائے کہ مساوات کا ضابطہ قائم رہے ۔اس عجوبہ روزگار فہرست کا درک مردوں کو تو خاک نہیں رہتا۔ البتہ خواتین میں یہ شعبہ ہائے علم وفن بطور جہیز کی یاد سینہ بہ سینہ نسلوں میں سفر کرتی ہے جس کے حوالے خواتین کی زبان کی نوک پر ہوتے ہیں ۔جوں ہی موقع درآئے فوراً پھسل کر الفاظ طنزیہ انداز گفتگو میں ڈھل جاتے ہیں ۔

www.urduchannel.in

باورچی خانے، نعمت خانے، مہمان خانے الغرض مکان میں موجود ہر ساز وسامان و برتن کے جہیز کی اپنی ایک مسلم تاریخ اور اس سے اہم ان اشیائے جہیز سے جذبات کی وابستگی ہوتی ہے کہ فلاں کی شادی میں فلاں نے تحفۂ جہیز میں دیا تھا۔ انسان کی وفات کے بعد بھی ساز وسامان جہیز اہل خانہ کے لئے مرحومین کی نشانی بن کر مکان کی آن وبان میں چار چاند لگاتا رہتا ہے ۔انہیں کہنہ مشق روایات وتہذیب کے سہارے مشرقیت کے آثار ابھی باقی ہیں ۔فی زمانہ وہ قدیم نوادرات کے نمونے کہیں اور میسر آجائیں یہ تو مشکل امر ہے ۔ یوں تو مرحومین کی یاد بڑی مشکل سے آتی ہے لیکن قیمتی دھاتوں اور دستی نمونوں کے نادر ظروف کے طفیل اب بھی نانی دادی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں ۔ہوسکتا ہے کہ ان قیمتی ظروف کو اب صرف کباڑ خانے والے ہی خریدیں لیکن ہر سال مخصوص ایام میں ان کو دھل دھلا کر چمکا کر پھر وہیں رکھ دیا جاتا ہے کیونکہ بزرگوں کی باقیات کی حفاظت ہی ان سے محبت کی سبیل ہے اور مشرقی اقدار کا تقاضہ بھی ۔

مرد ساری زندگی اسی تگ ودو میں مصروف عمل رہتا ہے کہ کس طرح وہ بیوی، بچوں اور خود اپنی نان ونفقہ ودیگر لوازمات کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔ لہذا وہ باوجود کوشش تمام کے جہیز کے سامانوں کی فہرست، برتنوں و دیگر قیمتیء اشیا کی مختلف اقسام، ساخت، سائز، استعمال، قیمت، دھاتوں، رسوم اور دیگر مشمولات کی تفصیل بطور مشق ہی ترتیب دینے کو کہہ دی جائے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں ۔خواتین جتنی تفصیل سے جہیز کے مشمولات، جزویات، فروعیات، تفصیلات، جدید وقدیم روایات اور عادات سے واقف وآشنا ہوتی ہیں مرد اس کا عشر عشیر بھی نہیں جانتے ۔کفیل خانہ ہونے کے ناطے مرد ناداں کا ایک ہی ملی اور عائلی فریضہ ہے جہاں بیوی، بیٹی کے جہیز سے متعلق کہے چپ چاپ اتنی رقم کی ادائیگی کرتے رہیئے اور اپنے آپ کو خوش نصیب باپ اور اچھے شوہروں میں شمار کر کے خوش رہیئے ۔

۵۰۔آنکھیں۔۔۔دل کی ترجماں

آنکھیں ہر جاندار کا آلۂ بصارت ہیں۔جس سے وہ عالم رنگ و بو لیکن ناپائیدار دنیا کے طول وعرض میں نظریں دوڑا کر دیکھتا ہے۔آنکھوں کے طفیل اس افق سے اس افق اور بے کراں آئینۂ عالم فلک کا فاصلہ چشم زدن میں مفت میں طے کرلیتا ہے اور قدرت کی صناعیوں کا معترف ہوتا ہے۔البتہ آنکھیں انسان کے چہرے کے دو خطرناک روزن ہیں۔اتفاق سے دنیا کی نصف سے زائد حشر سامانیوں کا سبب آنکھوں کی نت نئی شرارتیں ہیں۔انسان دو آنکھوں پر اکتفا نہیں کرتا لہٰذا چار آنکھوں سے استفادہ کرتے ہوئے آنکھوں پر سیاہ عینک یا رنگین عینک پہن کر رنگ بازی کرنا پھر عادتاً معصوم بنے رہنا بھی قدرے آسان ہوگیا ہے۔اسی بہانے آنکھوں کی حفاظت دھوپ کی تمازت اور تیز روشنی کا مداوا بھی ہوجاتا ہے۔آنکھوں پر عینک پہننے سے شخصیت کسی قدر معتبر معلوم ہوتی ہے۔خواہ وہ محض متاثر کرنے نیز آنکھوں میں دھول جھونکنے کی غرض سے ہی کیوں نہ پہنا گیا ہو۔آنکھوں پر مصنوعی جھلیاں نما پردے یعنی کلرڈ لینس لگا کر آپ من چاہے رنگ میں اپنی آنکھوں کو اسی طرح رنگ سکتے ہیں جیسے انسان گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل کرلیتا ہے یا بزبان اشراف اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں کا رنگ تبدیل کرلیتے ہیں۔

آنکھیں اپنے محدود استخوانی خول کے دائرہ عمل میں قید رہ کر راڈار کی طرح تمام گرد و پیش کا مشاہدہ کرتی ہیں اور ان کا اثر اپنے مطلب وصوابدید کے مطابق قبول کرتی ہیں۔آنکھوں کی ہر ادا، ہر جنبش اور ہر حرکت سے خطرات کی بو محسوس ہوتی ہے۔ہرجائی آنکھوں کی معنویت و افعال پر جتنی بھی تحقیق کی جائے کم ہے کیونکہ بہر حال نظر سے نظریہ زیادہ اہمیت کا حامل و حاصل ہوتا ہے۔انسانی فطرت کے عین مطابق برموقع برمحل اور بالحاظ ضرورت آنکھیں

www.urduchannel.in

اٹھانے، جھکانے، ملانے، مٹکانے، پھوڑنے، نچانے، بچھانے، ڈبڈبانے، تیز کرنے، اشارہ کرنے، میلی کرنے، صاف کرنے، روشن ہونے، تاریک ہونے، پتھرانے، چکا چوند ہونے، فرش راہ ہونے، سونی ہونے، چار کرنے، بہانے، پھیل جانے، جھپکانے، چرانے، لگانے، پھیرنے، بدلنے، پونچھنے، کھلنے، آنکھوں میں آنکھ ڈالنے، بند ہونے، دوڑانے، سینکنے، گڑانے، پھٹنے، ابل کر باہر آنے اور پسیجنے، ٹسوئے بہانے وغیرہ جیسے اہم افعال کی بھی روادار ہیں پھر بھی باوصف تمام لائق لا اعتبار۔

ان روزمرہ کے اعمال سے بالاتر آنکھوں کی مزید افادیت بھی ہیں۔جیسے کسی مقدس مصحف یا نسخے کا آنکھوں سے لگانا عقیدت ومحبت کی سبیل ہے تو آنکھ دکھانا سرزنش کرنے کے مفہوم میں لیا جاتا ہے۔مطلوبہ ہدف پر آنکھیں گاڑنا بشری تقاضے کا حصہ ہے۔جسے نظر لگانا کہہ کر نیت کی آلودگی کا اظہار کیا جاتا ہے تو آنکھ میں جوتے پہن کر گھسنا جرأت وجسارت کی علامت بھی ہے۔اندھے صرف دو آنکھوں کے پیہم طلبگار ہوتے ہیں اسی وقت تک جب کسی زنانہ شانے کا نرم وگداز سہارا میسر ہو۔

آنکھوں کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ راز کی باتیں بغیر کہے بر سبیل اشارے وکنائے سے انسان اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔بقول شاعر ”یہ آنکھیں میرے دل کی زبان ہیں“۔اس طرح راز کا راز رہ جاتا ہے اور زمانہ سازی کے لئے صوتی آلودگی اور کثرت گفتار کی علت سے بہت سے حساس طبع افراد محفوظ و مامون ہوجاتے ہیں۔چونکہ آنکھیں انسان کے دل کی کیفیت کی ترجمان ہوتی ہیں۔اس کے تہہ دار افعال نے انسان کو بھی فتنہ پرور بنا دیا ہے۔آنکھوں کے علاوہ شاید کسی اور عضو انسانی کی اتنی افادیت واستعمال ممکن نہیں جو دو ننھی ننھی آنکھوں کی صوابدید میں میسر ہیں جن میں محشر برپا کردینے کی قوت ہے۔بقول شاعر

خنجر ہے تیری آنکھیں، تلوار تیری آنکھیں　　زندہ نہ رہنے دیں گی اے یار تیری آنکھیں

آنکھوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اگر چہ آنکھیں شرم، حیا، غیرت، پاکیزگی اور احسان کے احساس سے مغلوب ہوں۔ ورنہ آنکھوں میں آنکھ ڈال کر دیکھنے والے کو یا تو دیدہ دلیری کی داد دینا ہوتی ہے یا آنکھوں کا پانی مرجانے کا طنز کیا جاتا ہے۔ لہذا معاشرے میں ایسے افراد کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ آنکھیں مٹکانے والے اعتبار کا درجہ حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کسی کا انتظار آنکھوں کو فرش راہ رکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی بے کلی دیدنی ہوتی ہے۔ وہ راستے پر آنکھیں گڑائے محو انتظار آتش زیر پا ہوتا ہے۔ آنکھیں بصارت کی سبیل ہی نہیں بصیرت کا روحانی ذریعہ بھی ہوسکتی ہیں اگر آنکھوں میں وہ تاثیر خاص میسر ہو

ہم نے تیری آنکھوں میں اللہ کو دیکھا ہے　　اس پار تیری آنکھیں اس پار تیری آنکھیں

ورنہ آنکھوں میں دھول جھونک کر آنکھوں کے سامنے اندھا بنانے کا پیشہ بھی اپنے عروج پر ہے۔ آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے کھیل ختم ہونے کے بعد آنکھ کھلتی ہے تو آنکھیں ملتے رہ جایئے اور شاطر آنکھ ٹیڑھی کر کے چل دیتا ہے۔

انسانی جسم میں دل کے بعد ہر عضو کی بہ نسبت آنکھیں شعرا و ادبا کی بھی مرغوب ترین شہ بلکہ پسندیدہ موضوع برائے تختۂ مشق ہے۔ شعرا کیا عشاق کا بھی سب سے محبوب مشغلہ ہے کہ محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل نازک کی راہ تلاش کرنا اور بلآخر وہاں تک رسائی حاصل کر لینا۔ موصوف محبوب کی آنکھوں کے راستے دل میں اترنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ محبوب کے انتظار میں آنکھیں بچھانا، پہلے محبوب کا لگاوٹ سے یہ اقرار کہ"

آنکھ بن کے تجھے دیکھتی ہی رہوں
میری آنکھوں کی تصویر بن جا

www.urduchannel.in

محبوب کا تجاہل عارفانہ برت کر آنکھ مچولی کھیلنا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرنا، عارضی طور پر آنکھیں پھیر کر زمانے کے ہاتھوں مرمت اور رسوائی کا سہرا عشاق کے سر بندھوا کر آزمائش وفا کرنا تو دل بسمل عشق بن کر تڑپتے ہیں تو بزبان خود اعتراف بھی کرتے ہیں کہ" آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی"۔ ادھر سادگیٔ عشق میں محبوب کے خیال میں آنکھوں آنکھوں میں رات کاٹ دینا بھی سچے عشق کی دلیل ہے۔ محبوب کو لبھانے کے لئے اس کی آنکھوں کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں کہ

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے　　یہ اٹھیں صبح چلے یہ بجھے شام ڈھلے

میرا جینا میرا مرنا انہیں پلکوں کے تلے

محبوب کو یہ کہہ کر اس کی آنکھ میں گھر کر لیتے ہیں کہ" آنکھوں سے دل میں اتر کے تو میری دھڑکن میں ہے"۔ جب محبوب آنکھوں میں بس جاتا ہے تو وہ آنکھوں کا تارہ ہو جاتا ہے۔ تمام عالم سے آنکھیں پھیر کر محبوب کی نیلگوں آنکھوں میں بسیرا ہوتا ہے۔ محبوب کی جھکی ہوئی آنکھیں شان بے نیازی و تجاہل عارفانہ کی غماز ہیں محبوب کی ترچھی آنکھوں کی برچھی راست جگر کے پار اتر جاتی ہے۔ بقول مرزا غالبؔ

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

آنکھوں کی معمولی حرکات و سکنات کو مختلف النوع معنویت کے جامے زیب تن کر کے شعرا اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کا حظ تو اٹھاتے ہی ہیں اپنے قارئین اور سامعین کی تفریح طبع، رومانیت اور ذوق کی تسکین کے لئے سامان بہم پہنچا دیتے ہیں جس سے وہ عش عش کر اٹھتے ہیں ہم جیسے منکسر المزاج مصنف جو شاعری سے تائب ہیں۔ انہیں جذبات سے مغلوب ہو کر کہے اشعار سے اپنا نشاستہ اخذ کر کے اپنے قارئین کی تفریح طبع کے لئے انشائیہ کا مواد کشید کر لیتے ہیں۔ بقول شاعر

آنکھیں دیکھیں تو میں دیکھتا رہ گیا   جام دو،اور دونوں ہی دو آتشہ
آنکھیں یا میکدے کے یہ دو باب ہیں   آنکھیں ان کو کہوں یا کہوں خواب ہے
آنکھیں اونچی اٹھیں تو دعا بن گئیں   آنکھیں اٹھ کر جھکیں تو حیا بن گئیں
آنکھیں ان میں ہے قید آسماں وزمیں   سرمگیں سرمگیں نرگسی نرگسی

محبوب کی بڑی آنکھوں کو دیوانہ بنانے کا خوب فن آتا ہی یہ عاشق سے شب و روز کا چین سکون اور راحت غارت کرنے میں ملکہ رکھتی ہیں۔محبوب کی خوبصورت آنکھوں کو اس کے حسن کی علامت کہا جاتا ہے۔آنکھوں کو کہیں کٹورہ نما کہہ کر تعریف کی جاتی ہے۔کہیں نرگس کے پھول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔کہیں آنکھوں کو مدبھرے نشے کے پیالے کہہ کر ذوق کی تسکین کی جاتی ہے،کبھی آنکھوں کی گہرائی کو سمندر کی گہرائی سے استعارہ دیا جاتا ہے۔کہیں جھیل سے نیلی آنکھیں کہہ کر نیلگوں ہونے کی تشبیہہ دی جاتی ہے۔آنکھوں کو دغاباز اور ہرجائی کا استعارہ بھی دیا جاتا ہے۔آنکھوں میں قدرت نے سوئے اتفاق کالا رنگ دے دیا ہے تو پھر آنکھوں کا کالا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔اگرچہ سیاہ رنگ کے علاوہ دیگر رنگوں سے نواز دے تو پھر ان کے اظہار اسلوب کے لئے نئے استعارات،تشبیہات اور اصطلاحات وضع بھی کی جاتی ہیں۔کاجل یا سرمے کی لکیر کھینچ کر ایک عدد تل بھی ادائے ناز سے آویزاں کر لینا کہ حسن کی مخصوص بندش کر دی جائے تاکہ دوسروں کی بدآنکھوں کی فتنہ سامانیوں سے ان کی آنکھیں محفوظ رہیں۔محبوب کے نقاب کو رخ زیبا پر اوڑھ کر فتنہ پرور آنکھوں کو کھلا چھوڑ دینا اگر جائز وروا ہے تو پھر آنکھوں کی گستاخیوں پر قدغن کی معقول دلیل تو ہونی چاہیے۔

آنکھیں صرف نیک فال ہی ہوتی ہیں یوں کہنا بھی آنکھوں کے حق میں غلو ہوگا۔ہر قسم و نوعیت کے انسانی جذبات کی عکاسی میں آنکھوں کو یدطولی حاصل ہے۔جذبہ حسد وحیرت سے انسان کی آنکھیں نہ صرف پھیل جاتی ہیں بلکہ آنکھیں پھٹ جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔اکثر غیر متوقع اشیا کے مشاہدے میں دماغ چکرا جاتا ہے اور آنکھیں ٹھیرنے سے قاصر رہ جاتی ہیں اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔درد کی شدت سے آنکھیں بھر آتی ہیں۔آنکھوں سے لہو ٹپکنا یا آنکھیں خشک ہو جانا بھی زود رنج اور کثرت گریہ کا اظہار ہے۔غصے سے انسان کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں بلآخر شعلے اگلنے لگتی ہے۔اپنوں کی بے وفائی یا دغابازی پر طوطا چشمی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں سور کا بال اترنے یا آنکھوں پر چربی چڑھنے یا آنکھوں پر پردہ پڑنے اور آنکھوں کا پانی مر جانے کی مثالیں بھی بکثرت رائج ہیں۔انتقام کے جذبے سے آنکھوں میں خون اتر آتا ہے،شدید رنج وغم سے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔آنکھیں موندنا موت کا اعلامیہ ہے لیکن انتظار محبوب میں عشاق نے کھلی آنکھیں رکھ کر بھی موت کو گلے لگایا ہے۔

دل دیا اعتبار کی حد تھی جان دی تیرے پیار کی حد تھی
مر گئے ہم کھلی رہی آنکھیں یہ تیرے انتظار کی حد تھی

www.urduchannel.in

۵۱۔منہ سے مجھے لگا کہ یوں

منہ پر انشائیہ لکھنا منہ کا کھیل نہیں ہے۔ذرا سا لغزش سے قارئین کے منہ کا ذائقہ خراب ہوسکتا ہے۔منہ کھولنے سے پہلے باہوش وحواس منہ سنبھالنا،منہ کو قابو میں رکھ کر تصنیف کرنا اور منہ کی ہمہ جہت فتنہ سامانیوں کا احاطہ بھی منہ سے کرنا گویا آسمان کو منہ چڑھانا ہے۔منہ پھوٹ جائے تو بچے بھی کہنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔لہذا منہ دیکھ کر باتیں کرنا اپنا شیوہ نہیں ہے یہ زمانہ سازی کا حربہ ہے۔منہ کا خراب ہونا اگرچہ بری بات ہوتی ہے لیکن دل کی صفائی وہ وصف ہے جو دل کی اتاہ گہرائیوں کی منہ سے تعریف میں نکل جاتی ہیں۔منہ کے غلط و بے جا استعمال سے سننے والے کا منہ سرخ ہو جاتا ہے، کہنے والے کا منہ کالا ہو جاتا ہے یوں تو ماضی میں منہ کالا کرنا زناکاری کو کہتے تھے کیوں کی اس کی سزا کے طور پر جہاں حدود نافذ نہیں کی جاسکتیں وہاں منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرتے ہیں اور سارا گاوں اس کا تماشہ بناتا ہے اور منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔حضرت ابراہیم ذوقؔ کے ہاں منہ کالا کرنے کی بات معنویت جدا اور طنز آمیز بھی ہے البتہ یہ زاویہ نگاہ خاصہ دلچسپ بھی ہے کہ

باقی ہے دل میں شیخ کے حسرت گناہ کی　　کالا کرے گا منہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

ہاں جس کے منہ میں دم ہو وہ طبع آزمائی کرے اور وہ جو کسی کی مرعوبیت کا اسیر نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا منہ بند کرنے میں عافیت جانے،جس کے منہ شہرت کا خون لگ جائے وہ منہ کی بات منوا کر دم لیتا ہے۔خواہ کوئی منہ دبا کر ہنسے یا کھلا تمسخر اڑائے

منہ سے انسان کی قومیت،مذہب،مسلک اور ملت کی شناخت ہوتی ہے۔منہ سے دنیا میں انسان کے کردار کی شناخت ہوتی ہے کہ انسان کے منہ سے زمانے میں اس کی عزت و ذلت

www.urduchannel.in

کی منزل طے پاتی ہے کہ آپ کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں یا منہ سے شعلے نکلتے ہیں۔منہ کی وجہ سے انسان سے سلوک و برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔بیچاروں کے منہ پر یوں بھی قابل رحم آثار ہوتے ہیں جو فاعل کو منہ دیکھ کر احسان کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔یہ علاحدہ بات کہ اکثر انسان اس فعل میں منہ سے دھوکہ و فریب سے دوچار ہوتا ہے۔فریب یافتہ شکست خوردہ لہجے میں ان کو 'فٹے منہ' کہہ کر صلواتیں بھی سنا دیتا ہے۔منہ میاں مٹھو بننے والے نہ صرف ناپسندیدہ اشخاص ہوتے ہیں بلکہ ان کو بہ نفس ونفیس اشارے کنائے میں اور غائبانہ صورت میں دل کھول کر طنزیہ انداز میں یاد کیا جاتا ہے کہ یہ منہ میاں مسور کی دال کبھی صورت دیکھی ہے آئینے میں؟ بہرحال ان کا ذکر سنتے ہی بہت سوں کے منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔بہرحال کہنے والے کا منہ بند نہیں کیا جاسکتا نہ ہی کسی کا منہ باندھا جاسکتا ہے۔بقول مومن خاں مومنؔ

محفل میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ　　بد نامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

درج بالا تناظر میں البتہ ایک ترکیب انسان کے لئے یہ ضرور ہوسکتی ہے کہ اپنا منہ سنبھال کر استعمال کیا جائے کہ اپنی ذات کے اعتبار کا پہلو ہاتھ سے جانے نہ پائے۔لہذا اس قسم کی بات اپنے منہ سے نہ نکالی جائے کہ بات منہ سے نکلی اور جہاں کو پہنچی اور ہر کس و ناکس اس پر ہجویہ اور طنزیہ تبصرے کرے۔ظاہر ہے جتنے منہ اتنی باتیں کہ آپ کسی کو منہ دکھاتے ہوئے پشیمانی محسوس کریں۔غصے سے منہ سرخ کرلیں یا از راہ غیظ وغضب خود اپنا ہی منہ پیٹ لیں۔انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اگر آپ ان کا منہ توڑ جواب دینے کی حماقت کریں گے تو بطور نتیجہ خجالت اٹھانی پڑ جائے گی۔ان کی منہ درازی کا جواب نہ بن پڑے گا کیوں کہ ضرب المثل ہے کہ آسمان پر تھوکا منہ کو آتا ہے۔اس کا ایک اور تیر بہدف علاج ہے کہ منہ چڑھے اوچھے مصاحبوں کو سرے سے منہ ہی نا لگایا جائے جو رائی کا پربت بنانے میں ملکہ و مہارت رکھتے ہوں۔جن کے منہ مہار

بے نکیل ہوں ان سے محفوظ فاصلہ بنانا لازمی امر ہے۔منہ کا میٹھا اور پیٹ کا کھوٹا دوست سب سے خطرناک مصاحب ہوتا ہے۔یہ وہ چوہا ہے جو آپ کی عزت و آبرو کا جہاز غیر محسوس طور پر ڈبو سکتا ہے۔لیکن شام ہوتے ہی ایسے اشخاص منہ اٹھائے محفل شبانہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کے لئے تیار ہو کر یوں نکل جاتے ہیں گویا کھویا ہوا اونٹ سرائے کا منہ تکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔احقر بذات خود بھی اس کا عادی ہے کیوں نہ اعتراف کرے کہ ہمیں بھی مر کر خدا کو منہ دکھانا ہے۔

محفل میں منہ دیکھی بات کرنے والا شخص کچھ عرصے تک معاشرے میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کیوں کہ خوشامد کے لئے منہ بھرائی کی عادت اپنائی جاتی ہے لیکن ایسا شخص جلد عوام کی نظر سے گر جاتا ہے۔کیونکہ مشہور ہے کہ کھایا منہ اور نہایا بال نہیں چھپتا۔منہ پر منہ بھلے ہی روزانہ پڑتا رہے لیکن صداقت کی بالادستی پر فرق واقع نہ ہو۔ہماری تہذیب ہے کہ خوشی کے موقع پر منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔خلاف مرضی بات ہو جائے تو منہ کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے لیکن اس سے ناامید یا دل برداشتہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں سچ بات تو یہ ہے کہ سچ کا ذائقہ بھی کڑوا ہی ہوتا بس آزمائش شرط ہے۔اچھی امید یا دعا پر آپ کے منہ میں گھی شکر کہہ کر ان کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے۔کبھی کبھی قلب کی تلخی منہ سے ادا ہو جاتی ہے اور فریقین منہ کی حشر سامانیوں کی خاطر باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور بات محفل سے پولس لاک اپ تک پہنچ جاتی ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ منہ سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کیا جاتا کیوں کہ کسی کے منہ پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ آدمی کس قماش کا ہے۔اس لئے بہت سے افراد نئے لوگوں کو منہ لگانے سے کتراتے ہیں۔اگر کوئی زیادہ زچ و پریشان کرے تو منہ خراب نہ کرنے کی دہائی دے کر کڑخایا دیا جاتا ہے۔

محفل شبانہ کے دوران آرائش محفل اور تفریح طبع کے لئے اگر منہ لگانا بھی پڑے تو خوش ذائقہ چٹنیوں اور مربوں کا انتخاب ضروری ہے تاکہ منہ بن جائے زبان کو لذت کام و دہن کا لطف بھی میسر آئے۔دوران محفل بعض حضرات کا وطیرہ ہوتا ہے صاحب گفتگو کا منہ تکتے رہنا۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جذبات سے عاری چہرہ لیئے سب کا منہ تکنے کا ارادہ ہی لے کر منہ اٹھائے گھر سے روانہ ہو گئے۔بعض حضرات بڑے نپے تلے انداز میں محوِ گفتگو ہوتے ہیں۔ان کی ہر بات میں کام کی بات ہر فقرہ لائق اعتبار اور بات کی گہرائی گیرائی و معنویت قابل دید ہوتی ہے۔لیکن ایسے اشخاص کتنے ہیں ہی جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔

بعض حضرات کو اپنے منہ پر قابو رکھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔اعتدال سے سرف نظر کر کے دائماً ان کا منہ کھجاتا رہتا ہے کہ کیسے مدمقابل کی بات میں میں اپنی بات کا اثر پیدا کروں لہذا وہ درمیان میں منہ مارنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔بعض افراد کی عادت ہوتی ہے یا تو باتوں کے دوران صرف منہ تکتے ہیں یا پھر دوسروں کی بات میں منہ ڈال کر ان کی باتوں کے تسلسل اور سنجیدگی کو پامال کرتے ہیں۔ہر چند کہ اس قسم کے اصحاب کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا اور محفل کے تقدس کے برخلاف منہ سے نامانوس آوازیں خارج کرنے والے نیز منہ کھول کر جماہی لینے والے اشخاص بھی محفل میں نامرغوب قرار پاتے ہیں۔اکثر محفل ان نامرغوب حرکات و سکنات پر سخت جھلا جاتی ہے مگر از راہ تکلف و باطنی تکلیف منہ باندھنا پڑ جاتا ہے۔یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ عزت یا لحاظ کے آگے منہ کی کھا لینی پڑتی ہے۔ذاتی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ شخصیات مذکورہ منہ چھپا کر بھاگ لینے کو ترجیح دیتے ہیں کہ آبرو تو محفوظ رہ جائے ہے۔مرزا غالب کے اس شعر کی روشنی میں تواضع اختیار کر لیتے ہیں کہ

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

اکثر شرکا کا دل تو یہ چاہتا ہے ان کے یا تو منہ رنگ دیں یا ان کے منہ لپیٹ کر دریا برد کر

www.urduchannel.in

دیں۔آرائش محفل کی خاطر پیٹ کے مضبوط اصحاب کا انتخاب کیا جائے تا کہ منہ کا ذائقہ سلامت رہے۔یوں بھی پیٹ کے ہلکے حضرات کھاتے کم پھیلاتے زیادہ ہیں مگر اس لئے درگذر کرنا پڑتا ہے کہ وہ بھی اپنی عادت سے مجبور ہیں کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

منہ کی افادیت اور استعمال مردوں سے زیادہ خواتین جانتی ہیں مرد بیچارہ اپنی کروفر میں منہ چڑھائے خوش رہتا ہے جب کہ منہ چلانا، منہ چڑھانا، منہ بنا بنا کر باتیں کرنا خواتین کی روحانی غذا ہے خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ اگر کوئی واضح فرق ہے تو صرف موضوعات اور ان کے معیار کا۔جب تک وہ منہ سے منہ ملا کر غیبت وچغلی سے اپنا منہ اور رہی سہی عاقبت خراب نہ کرلیں ان کی روح کو سکون واطمینان اور قلب کو آرام میسر نہیں آتا۔ہر موقع ومحل کے اعتبار سے منہ پر بارہ بجانا، بات بے بات پر منہ پھلانا، منہ لٹکانا، منہ اتارنا، منہ پھیر کر بیٹھنا نیز ناپسندیدگی کے اظہار پر منہ ٹیڑھا کرنا بھی خواتین کا شیوہ ہے اور انہیں کو زیب بھی دیتا ہے۔جسے وہ زنانہ ناز وادا کے انداز میں اپنے جذبات کے اظہار کے سلسلے میں اپناتی ہیں۔میری دانست میں یہی زنانہ حربے، چربے مرد کی کمزوری ہیں انہی اداؤں سے صنف نازک مرد مجاہد کو اپنے حق میں رام کرلیتی ہیں۔مرزا غالب نے ایسے ہی نازک موقع پر شعر چست کیا ہے کہ

غنچۂ ناشگفتہ کو، دور سے مت دکھا، کہ یوں　　بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

خواتین کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ گفتگو کے دوران اپنا منہ قینچی کی طرح چلانا

رازداری کی شرط میں باندھ کر کے سرگوشی کے انداز میں کان میں منہ ڈال کر بڑے بڑے رازوں سے پردہ اٹھا دینا اور دیگر سامع خواتین کا فرط حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ تکنا اور تصویر حیرت بن کر سننا اور پھر عش عش کرنا بھی آزمودہ زنانہ ٹوٹکے ہیں لیکن تجربہ شاہد ہے کہ خواتین کے معاملے میں پیٹ کے ہلکے ہونے کی شکایت عام ہے گویا منہ سے نکلی اور فلق کو پہنچی۔منہ زوری بھی

www.urduchannel.in

خواتین کی عادت زنانہ کا حصہ ہے جس کے طفیل وہ مرد کو بدحواس اور باولا کر دیتی ہے تو فرط مسرت اس کے منہ پر شفق پھول جاتی ہے۔

دلہنوں کو پہلی مرتبہ بطور نذرانہ منہ دکھائی کی رقم یا تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں۔منہ دیکھنا نذر ونیاز کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔قابل اعتراض بات بھی بس انداز جدا جدا ہیں اور سمجھ سمجھ کا پھیر ہیں۔ایک ٹک منہ تکنا بہت محبوب عمل ہے اگر چہ تکے جانے والا منہ بھی محبوب کا ہو۔'کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا' کہ برسبیل تذکرہ طنز وظرافت سے بھرپور حقیقت عرض ہے کہ ایک محفل بوفے ڈنر میں ایک نازک اندام، خوبصورت، سڈول اور جاذب نظر لڑکی اپنے ایک ہاتھ میں پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں پیالہ اٹھائے بڑے ناز وادا سے اٹھلاتی ہوئی چلتی آئی۔زلف کو گردن سے جھٹکا دیا اور ایک اسمارٹ نوجوان سے مخاطب ہوئی۔''کیا آپ پلیز میری ذرا سی مدد کرسکیں گے؟'' نوجوان نے خوش طبعی سے جواب دیا۔''جی کیوں نہیں! آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔''لڑکی دوبارہ مخاطب ہوئی۔''تو پلیز پلیز پلیز آپ اپنے منہ سے کھانا کھائیے بڑا لذیذ ہے اور میرے منہ سے یہ کتوں کی نظر ہٹا لیجئے مجھے کوفت ہو رہی ہے۔''بتائیے کہ اس لڑکے کو اپنی معمولی شوخی کتنی مہنگی پڑی کوئی دوسرا بندہ بشر ہوتو منہ پیٹ لینے کی صورت حال تھی۔اس عادت کے سبب بلآخر منہ کی کھانی پڑی لیکن جن کے منہ کو دیدار حسن کا خون لگ جائے وہ منہ تکنے سے باز نہیں آتے بلکہ منہ ہی منہ میں بدبدا کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

انسان اپنے منہ کا غلام ہوتا ہے خواہ وہ قول وقرار، عہد وپیماں اور وعدہ وعید کی بات ہو یا لذت کام ودہن کی۔انسان منہ اٹھائے مذکورہ جذبے کی تسکین کو ترجیح دیتا ہے۔اگر کسی کی بد شگونی یا بد دعا سماعت سے ٹکراتی ہے تو منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے کہ تیرے منہ میں کیڑے پڑے لیکن وہ اپنے گریباں میں منہ ڈال کر اپنا ذاتی محاسبہ کرنے پر رضامند نہیں ہوتا اور اس

تلقین پر حیرت سے منہ کھول کر گھورتا ہے جیسے متکلم کو کھا جائے گا بلآخر منہ لٹکا کر چپ سادھ لیتا ہے یا منہ موڑ کر اس جگہ سے روانگی کو عافیت جانتا ہے۔

زیر نظر تحریر میں آپ نے ایک منہ اور کتنی باتوں کا تجربہ دیکھا کہ منہ جیسی چیز جسے ہر کوئی منہ لگانے سے گریز کرتا ہے۔ انشا پرداز کے ہاں کن کن زاویہ نگاہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ منہ مارنے کی کوشش کی منہ زوری کی بھی ناکام کوشش کی لیکن منہ کی کھانی پڑی۔ پھر بھی منہ سیدھا پیش نہ کیا جاسکا ہے منہ ٹیڑھا کا ٹیڑھا ہی رہا۔ منہ خشک اور تشنہ تحریر بھی رہا۔ منہ سے رب کی بندگی کی اذان بھی دی جاتی ہے، منادر میں بھجنوں اور پروچنوں کی گائیکی کا رواج بھی ہے۔ منہ سے فرط مسرت سے سیٹی بھی بجائی جاتی ہیں، منہ سے رویا اور بین بھی کیا جاسکتا ہے۔ منہ سے نغمے بھی گنگنائے جاتے ہیں جو طربیہ اور المیہ دونوں جذبات کے ترجمان ہیں۔ منہ سے ساز بجائے جاتے ہیں جیسے بانسری، شہنائی، ٹرمپیٹ، سیکسافون، کلارنیٹ، ماوتھ آرگن۔ منہ سے ہزار ہا تاثرات، اشارے کنائے، خوشی وغم کے آثار اور اظہار ہوجاتا ہے۔ بقول غالب

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

www.urduchannel.in

۵۲۔ لسانی شرارت

مزاح نگار کے متعلق ایک معروف مزاح نگار کا عظیم قول ہے کہ مزاح نگار اپنی ٹانگوں کے درمیاں سے سمندر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے کچھ نرالے تناظر میں گرد و پیش کی اشیا کو دیکھنے کا خیال ذہن میں در آیا۔ کیوں نہ تذکیر تانیث کے آئینے میں تمام اشیا میں منفرد مفہوم تلاش کئے جائیں اسی مشق معکوس کی عادت کے طفیل اس تحریر نے لکھنے پر آمادہ کیا۔ بس ایسی لسانی شرارت کے پیش نظر کچھ لسانی تجربات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ہر دو جنس مرد و زن کی تخلیق کے پس پردہ نسل انسانی کی افزائش کا راز پنہاں ہے۔ اردو زبان و ادب میں تذکیر و تانیث کی کیا اہمیت ہے؟ اس سے تمام ماہر لسانیات، ادبا شعرا اور دیگر اصناف سخن کے قلم کار ضرور واقفیت رکھتے ہیں۔ زمانے کا عام کلیہ یہی ہے کہ اگر مذکر اور مونث میں مطابقت نہ ہو تو طلاق واقع ہوجاتی ہے لیکن زبان اور زبان دانی کے معاملے میں اگر مذکر و مونث کے درمیان میں روایتی مطابقت نہ ہو تو مزاح کا اطلاق اکثر ہوتا ہے۔ بیشتر ایسے الفاظ ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں روایتی مطابقت نہیں پائی جاتی ہے بلکہ وہ مضحکہ خیز معنویت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ وہ روزمرہ کے استعمال کے الفاظ ہیں لیکن اس تناظر میں انہیں شاید کبھی کسی نے دیکھنے کی سعی کی ہو۔ قارئین کی تفنن طبع کی خاطر ایک طویل فہرست پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں شاید پسند کے پیمانے تک رسائی حاصل کرسکے۔

کوٹھی (عالیشان بنگلہ یا اناج ذخیرہ کرنے کا ظروف) لیکن اس کا مذکر کوٹھا (طوائفوں کا مسکن) ہوتا ہے۔ احمد آباد کی عوام بلدیہ اعظمی کو کوٹھے کے نام سے ہی یاد کرتی ہے۔ بے چارے نہ جانے روایتی کوٹھوں کو کس نام سے یاد کرتے ہوں گے؟ اسی طرح گڑھی (چھوٹا قلعہ) اس کا

مذکر گڑھا (کھڈ) کہلاتا ہے۔اسی طرح گھڑی (کلاک یا ریسٹ واچ) کامذکر گھڑا (مٹکا) ہوتا ہے۔فراقؔ نے مجازؔ کو مکتوب تحریر کیا کہ میں نے شراب نوشی اب کم کر دی ہے۔سامنے گھڑی رکھ کر پیتا ہوں۔مجازؔ نے جواب میں تحریر کیا میں تو رند بلا نوش ہوں اسلئے سامنے گھڑا رکھ کر شراب پیتا ہوں۔اسی طرح دیوالی (جشن فتح) کامذکر دیوالہ (خانماں برباد) ہوتا ہے۔کھیری (گائے کے پستان کی چربی) کامذکر کھیرا (ککڑی) کہلاتا ہے۔انگوٹھی (انگلیوں کا زیور) کامذکر بھی انگوٹھا (چار انگلیوں کا واحد مذکر) ہوتا ہے۔گو انگوٹھا قد میں قدرے موٹا اور پستہ قد ہوتا ہے لیکن انگوٹھا چار بیویوں (انگلیوں) کے تنہا شوہر کی طرح ان سے مربوط و مستحکم ہوتا ہے جس کے بغیر چاروں کی موجودگی بے اہمیت ہے۔بیڑی (تمباکو سے پر پتوں کی سگریٹ نما چلم) کامذکر بیڑہ (پان کی گلوری) ہوتا ہے۔دوسری قسم کا بیڑہ بحری فوج کا عملہ ہوتا ہے جسے بحری بیڑہ کہا جاتا ہے اور تیسرا بیڑہ کسی خاص مہم کے لئے قصد کرنا بھی بیڑہ اٹھانے کے مترادف ہوتا ہے۔ہنڈی (چیک یا صرافے کا کاغذ) کامذکر ہنڈا (جہیز کی رقم یا سامان) ہوتا ہے۔ہنڈا پانی بھرنے کا ظروف بھی ہو سکتا ہے۔باندی (ملازمہ) کامذکر باند (پانی روکنے کی دیوار یا ڈیم) ہوتا ہے۔کمر (پشت کا زیریں حصہ) کامذکر کمرہ (چاردیواری) کہلاتا ہے۔بالی یا بالا (کان کا زیور) کامذکر بال (مو) ہوتا ہے۔اسی طرح خالی (عدم وجود) کامذکر خال (جلد) ہوتا ہے اور خالہ (ماں کی بہن) بھی ہوتی ہیں۔چالی (ایک ہی قطار میں مکان) کامذکر چال (رفتار یا لے) ہوتا ہے۔چراغی (مزاروں اور آستانوں کا نذرانہ) کامذکر چراغ (دیا یا قندیل) ہوتا ہے۔الجبر (زبردستی) کامذکر الجبراَ (علم ریاضی) ہوتا ہے۔بیری (ایک قسم کا میٹھا چھوٹا پھل یا دشمن) کامذکر بیرا (ہوٹل کا ملازم) ہوتا ہے۔چنگی (ٹیکس) کامذکر چنگ (رباب) ہوتا ہے اور چنگا (بھلا یا خوش حال) ہوتا ہے۔قطر (دائرے کی چوڑائی) بھی ہے قطر (ایک ملک کا

www.urduchannel.in

نام بھی ہے) کامذکر قطرہ (پانی کی بوند) ہوتا ہے۔بستی (گاؤں یا شہر) کامذکر بستہ (بچوں کے اسکول کا دفتر یا باندھنے کا عمل) ہوتا ہے۔تخت (بادشاہوں کی نشست) کامذکر تختہ (پھانسی کا پھندا یا بلیک بورڈ) ہوتا ہے۔قمری (ایک چھوٹا سا پرندہ) کامذکر قمر (چاند) ہوتا ہے۔قمری کو علامہ اقبالؔ نے شعر میں یوں باندھا ہے۔

اڑا لی طوطیوں نے قمریوں نے، عندلیبوں نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی تھی داستاں میری

۵۳۔ کبھی خاک میں کبھی خاک پر

یہ حیات وموت کی، ہے ڈگر　　　کبھی خاک میں کبھی خاک پر

حیات کی بے ثباتی اور متلون مزاجی تو خیر فطرت کا تقاضہ ہے لیکن موت کی متلون اقسام بھی کچھ کم عجوبہ روزگار امر نہیں ہے بلکہ باعث حیرت واستعجاب ہے۔ جواں مرگ اس قسم کی موت کی غذا نوجوانوں کا طبقہ ہے جو ہوش سے زیادہ جوش کا پیروکار ہے۔ لہذا با آسانی دام اجل میں پھنس کر لقمۂ اجل بن جاتا ہے اکثر گبرو جوانوں کو ان کی شرارت وشوخی کے طفیل موت اچانک آلیتی ہے ہر چند کہ اس قسم کی موت بوڑھوں اور بچوں کو میسر نہیں ہوتی۔ البتہ مرگ ناگہانی اور مرگ مفاجات کے سانحے کے لئے ایسی کوئی مخصوص شرائط یا کوئی قیدو بند نہیں ہوتی۔ پھر بھی بوڑھوں کے زچ کر دینے والے سلوک سے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق کہنا پڑتا ہے کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" جو یوں تو کہنا نہیں چاہئے لیکن ان سے پریشان ہو کر کہنے والے اکثر کہہ دیتے ہیں۔ شادیٔ مرگ یعنی خوشی سے مرجانے کا عمل بھی اپنے اندر لطف اندوز ہونے کی حسرت کی گہرائی سمو لیتا ہے جسے غالب نے یوں پیش کیا ہے۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جاناں　　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

مرگ، نیم مرگ یا نیم جان اس حال میں مرنا بھی کوئی مرنا ہے نہ جس میں جینے کا لطف میسر ہو اور نہ ہی مرنے کا قرار۔ خوش قسمتی سے اس قسم کا تجربہ عام انسانوں کی رسائی سے فزوں تر یعنی صرف ہمارے جگت چچا حضرت مرزا اسداللہ خاں غالب کی شاعری میں ہی میسر آئی۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

موت بہر حال برحق ہے جو ہر انسان کو دنیا کے وزٹ (عارضی) ویزا سے آخرت کا مستقل

www.urduchannel.in

ویزا مفت دلانے اور بلا معاوضہ یا کرایہ دونوں بلکہ تینوں جہانوں کی سیر کروادیتی ہے عالم دنیا، عالم برزخ اور عالم آخرت بھی بس وقت آنے کی اور بہترین زاد راہ کی تیاری شرط ہے۔ قادر المطلق کا فرمان ہے کل نفس ذائقۃ الموت یعنی ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے جسے یونہی چکھنے کا حوصلہ اچھے اچھوں میں نہیں ہوتا، چکھانے والا عمر قید یا تختۂ دار کا سزاوار ہوتا ہے اور اسے بلا وجہ چکھنے کا جوکھم لینے والے جو یہ کہتے ہیں کہ "مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی" ان کا یہ عمل دائمی طور پر دوزخ کے ویزا و سکونت حاصل کر لینے کے مترادف ہے۔ اور بعضوں کو موت کا مزہ چکھانے میں زیادہ مزہ آتا ہے حالانکہ معروف ہے "موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں"۔ موت کا مزہ چکھانے کا ہنر یا تو قاتلوں کا وطیرہ ہے یا اپنے فن میں طاق ادیبوں کا۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجئے　　　کٹے زبان، تو خنجر کو، مرحبا کہیے

مقتول کو قتل ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ متوفی کو اپنی حیات مستعار کے اخیر دنوں میں طویل علالت کے عذاب، درد و سوزش کی افتاد، اہل خانہ کی بے حسی اور بیگانگی کا رد عمل، جسم ناتواں پر طبیبان وقت کی تجربہ کاری پھر سوزش و آلام کا عذاب، ہمدردی اور جھوٹے دلاسوں کی خیرات، تیمارداروں کے احسان، ان کی تحفتاً لائی ہوئی صحت بخش اشیائے خوردنی کے اسراف وریاکاری ورسوم و قیود کے تکلفات کے علاوہ جاں کنی اور سکرات جیسے دشوار گذار مراحل سے یکسر نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ روح بھی قفس عنصری سے یوں پرواز کر جاتی ہے، جیسے دام صیاد سے پرندہ آزاد ہوا میں اڑ کر فرحت و انبساط کا احساس کرتا ہے بقول مرزا غالب

پڑیئے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو، تیماردار　　　اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

چنانچہ "خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے" یہ بھی صرف کہنے کی باتیں ہیں اصل معاملہ ملک الموت کے موڈ پر اور بہت کچھ اپنی کارستانیوں پر بھی منحصر ہے۔ فرشتۂ اجل نے

جسے چاہا، اس کی روح کو قفس عنصری سے فوراً آزاد کر دیا اور جسے چاہا آہستہ آہستہ شدید تکلیف سے روبہ اجل کیا۔ ظاہر ہے کہ 'موت کا ایک دن معین ہے'۔ قاتل تو ایک مرتبہ اپنے ہدف کو ملک الموت کے حوالے کرنے یعنی موت کی صعوبت وافتاد سے مقتول کو گذار کر مرغ بسمل یا قربانی کے بکرے کی طرح ٹھنڈا ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اسی ضمن میں شاعر بھی اپنے محبوب سے ملتمس ہے کہ

نہ اڑا یوں ٹھوکروں سے مری خاک قبر ظالم یہی ایک رہ گئی ہے تیرے پیار کی نشانی

اس عمل کے فوراً بعد اسے اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے پھر وہ اپنی جان کی خیر منانے کے لئے جائے وقوع سے راہ فرار کا متلاشی ہوتا ہے، کیونکہ سب کو اپنی جان بہر حال سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ انسان کی نفسیات یہی ہے کہ وہ مارنا پسند کرتا ہے مرنا ہرگز نہیں۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو کیا غم سر کے کٹنے کا نہ ہوتا، گر جدا تن سے تو زانو پر، دھرا ہوتا

البتہ خاص وعام اموات کا پرتاثر تذکرہ ادیب کمال السا پردازی سے اس رنگ میں پیش کرتا ہے کہ جب بھی مذکورہ تحریر نظر سے گذرتی ہے۔ موت کے مراحل کے ہولناک مناظر چشم عبرت کے آگے رقصاں نظر آجاتے ہیں۔ شاید اسی نازک خیال کو چچا غالب نے یوں برتا کہ 'مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا'۔ ادبا مناظر سکرات کا وہ خوف ناک مضمون باندھتے ہیں کہ قاری کے معدے میں تیزابیت اور آنتوں میں تشنج کا احساس غالب ہو جاتا ہے۔ اس بیان کو پڑھ کر اضطراب، تیز دوران خون اور گھبراہٹ کے باعث ایک پہلو پر زیادہ دیر توقف کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے، گلہ خشک ہو جاتا ہے اور سانس میں تنگی کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے گویا 'موت آتی ہے پر نہیں آتی'۔ ادیب اس انداز میں عالم سکرات اور جان کنی کے مراحل بیان کرتا ہے گویا ان غریبوں کو حضرت اسماعیلؑ کے متبادل دنبے کی طرح ان تکالیف اور اذیتوں سے بار ہا دو چار ہونا پڑا ہو پھر کچھ اس قسم کے اشعار لکھ کر شدت خوف میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے کہ

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

'اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟' خیر مرنے والے کی تکلیف متوفی ہی جانتا ہے۔ تجربہ نہ ہونے کے باعث قیاس آرائی وامکانات پر بحث فضول ہوگی، لیکن اس کی موت کے دل دہلانے والے بیان پڑھ کر قاری کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے جس سے اس احسن تقویم کے اس عظیم الشان بت پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اشرف المخلوقات کا ہاضمہ متاثر اور حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ قبر کی اولین منزل میں اسے ممکنہ سوالات سے زیادہ سائلین سے خوف آتا ہے، حالانکہ یہ دنیا کے پہلے ممتحن ہیں جن کے انٹرویو کی تفصیل الغرض نام، سوالات اور مقام امتحان کا پتہ پیشگی طور پر تمام عازمین آخرت بخوبی جانتے ہیں لیکن ان کا سامنا کرنے سے کترانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کا سامنا ناقابل گزیر اور اٹل حقیقت ہے بصورت نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن پھر بھی انسانی کمزوری ہے کی آنکھوں دیکھی جیتی مکھی نہیں نگلی جاتی۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، بڑی منتوں مرادوں سے اس جاں گسل مرحلے سے فراغت پا بھی لی تو انسان کو چین وآرام کہاں قیامت کا طویل انتظار ہے اور بقول مرزا غالبؔ

ہو چکیں، غالب! بلائیں سب ناتمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

قبر میں آرام سے لیٹنے کی مہلت بھی تب ہی میسر ہوگی جب آپ نے چرب زبانی سے اپنے ماتحتوں کے حقوق نہ دبائے ہوں نیز اپنے لین دین کا حساب کتاب ٹھیک سے کیا ہوگا، اپنے اعمال کی تاریخ میں لمبی زبانوں سے کسی کا دل نہ دکھایا ہوگا، اپنے افعال کا جغرافیہ درست رکھا ہوگا، اپنے منصب پر فائز رہ کر ہندسوں سے زباں کی فتنہ پردازیوں سے بیجا چھیڑ خوانی نہ کی ہو گی۔ جب آپ نے اپنی زبان پر قابو رکھا ہوگا۔ فطری اور سائنسی اصولوں کی ناقدری اور ان کے عدم توازن کی غلطی نہ کی ہوگی۔ نہ زبان چٹخا کر بیوی اور زبان لٹکا کر ماں کے حقوق میں میزان کو بالکل

www.urduchannel.in

ٹھیک رکھا ہوگا تو آپ کی رپورٹ کارڈ پر تسلی بخش ریمارکس حاصل ہوکر پاس کئے جائیں گے۔ اگر کہیں معمولی کسر ہو تو ترقی دے کر کامیاب کرنے میں اللہ کی رحمت بہر حال دنیاوی ممتحنوں سے بالا تر ہے۔ اگر کسی بدقسمتی یا بداعمالی کے سبب ناکام بھی ہو گئے تو اگلے ٹرم تک کی مہلت سے مایوسی بہر حال کفر کے مترادف ہے۔

www.urduchannel.in

۵۴۔ سر کی سرگزشت

سر کی سرگزشت کے کیا کہنے سر دست سر سے متعلق یہی عرض ہے کہ پانی کہیں سے بھی اونچا جائے اسے برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن سر سے اونچا ہو جائے تو ناقابل برداشت ہوتا ہے پھر ہاتھ پیر مار کر سرفروشی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ سر سے متعلق یہ کہاوت بھی قدیم ہے کہ سر بڑا سردار کا اور پیر بڑا شیطان کا۔ سر ایسا لاحقہ ہے جس سے عزت افزائی اور اکرام کا مادہ اضافی ہوجاتا ہے جیسے سرپنچ، سرپیچ، سروکار، سرکار وغیرہ۔ سر کی اہمیت کا ادراک ان اعمال سے بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کے کارناموں کا سہرا بھی اپنے سر باندھ لینا، اور اپنی کارستانیاں دوسروں کے سر منڈھ کر خاموش تماشائی بنے رہنا، سر پر کبھی سہرا سجایا جاتا ہے تو سر پہ جوتے بھی پڑتے ہیں، سر پر کبھی انعام آتے ہیں تو کبھی انعام رکھے جاتے ہیں، کبھی دشنام آتے ہیں تو کبھی الزام بھی آتے ہیں۔ بقول شاعر

مرے ہاتھوں کی لکیروں میں ترا نام تو ہے
تو کہیں بھی رہے، سر پر ترے الزام تو ہے

بعض اوقات سر کی قیمت خزانوں کے بدل سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ سر اتارنا یا سر قلم کرنا سب سے سنگین سزا تسلیم کی جاتی ہے۔ ظالم، باغی اور ناپسندیدہ کردار کے حامل شخص کا سر لانے والا عہد قدیم میں انعام و اکرام کا سزاوار ہوتا تھا۔ عہد قدیم میں اپنی حکومت کی سربلندی کے لئے دشمنوں کی سرکوبی کرنا، سرتابی کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانا اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانا، سر پر کفن باندھے نکل پڑنا اور سر رزمگاہ اپنے اوصاف کے جوہر دکھا کر سرخرو لوٹنا بھی سورماؤں کا خاصہ رہا ہے۔ سارے جسم میں سر ہی ایسا واحد معتبر عضو ہے جس کی قسم کھائی جاتی ہے ورنہ کسی اور عضو کی ایسی فضیلت واعتبار کہاں؟ بقول شاعر

قسم تم کو مرے سر کی مرے پہلو سے مت سرکو
اگر سرکو، تو یوں سرکو، قلم کر دو، مرے سر کو

سر کتنے ہی سربستہ رازوں، ترکیبوں، سازشوں، اندیشوں اور وسوسوں جیسی سرگرمیوں کا امین ہوتا ہے۔ سر کی عزت و آبرو نیز زیبائش اور آرائش کے لئے سو سو جتن کئے جاتے ہیں۔ سروں کی خوشنمائی کے لئے کنگھی، تیل اور شیمپو جیسے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں۔ بقول شاعر تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ سر برہنہ ہو تو عجز و انکسار کی علامت ہے اور سر پر دستار ہو تو بندگی کی دلیل ہے۔ سر کی پوشش شخصیت کی شناخت ہوتی ہے جیسے سر کا تاج، سر پیچ، پگڑی، ٹوپی اور کلاہ و پپاخ ہوتی ہیں ان سے سربراہی کی علامت ظاہر ہوتی ہے۔ سر کی دستار کسی کے پیروں میں رکھنا شکست، ذلت اور رسوائی کا سبب ہے۔ سر کی آن کی خاطر سر کٹا کر جان بھی لٹا دینے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ قابل رشک ہے وہ سر جو اپنے معبود برحق کے آگے جھکتا ہے یا اس کی رضا پر کٹ کر اپنا حق بندگی ادا کر دیتا ہے۔ مالک حقیقی کے سامنے سر بسجدہ رہ کر بندگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کی راہ میں سر کٹانا سرفروشی کی سبیل ہے۔

جہاں سر جھکے تو نہ اٹھ سکے مجھے ایسی در کی تلاش ہے

اس کے احکامات پر سر خم تسلیم کر کے سرفراز ہونا سعادت ہے بشرطیکہ خلوص دل سے ہو۔ ورنہ علامہ اقبال نے فرمادیا تھا کہ

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا؟ نماز میں

قدرت نے انسان کے سر کا جغرافیہ دھڑ کے اوپر نصب کر کے اسے دماغ جیسے خطرناک عضو کا مسکن، فتنہ پرور آنکھوں کا مقام، خوبصورتی کی علامت ناک، کے علاوہ تیز و طرار زبان اور دو عدد کان جیسے حسی عضو سے سرفراز کیا۔ سر اٹھانا یوں تو متوجہ ہونے کی سبیل ہے

www.urduchannel.in

۔ سرفرازی یعنی فخر سے سر اونچا کرنا گو افتخار و سربلندی کی علامت سہی لہذا سر بچا کر سر اٹھانے میں ہی عافیت ہے ورنہ سر اٹھانا انا کا مسئلہ اور بغاوت کا عمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور بلا وجہ شامت سر پر آن پڑتی ہے۔ بات مزید بگڑ جائے تو سر اٹھانے کی پاداش میں سر پر جوتے بھی پڑ سکتے ہیں۔ بقول فیض جب تاج اچھالے جائیں گے اور تخت گرائے جائیں گے۔ مالک حقیقی کے حکم کے آگے سر اٹھانا، سرکش شیطان کی علامت ہے۔ سر اٹھانے کے کچھ اور مفاہیم بھی ہو سکتے تھے لہذا مرزا غالبؔ نے کہا تھا

ضعف میں طعنۂ اغیار، کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

سر جھکانا گو تعظیم، رضامندی، اجازت مرحمت کرنے کی علامت سہی لیکن اسے شکست، اعتراف، پشیمانی اور پچھتاوے پر بھی سر اسر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سر جھکانے سے سو مصیبتیں ٹل جاتی ہیں تو سر مصلحت سر جھکا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ہر کس و بے کس کے آگے سرنگوں ہو جانا بھی دانش مندی کی دلیل نہیں ہے ورنہ اس قسم کا پچھتاوا بھی ہو جاتا ہے کہ

مجھے کیا پتہ تو بھی بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو جھکاتا نہ سر کو میں

راستے میں حائل سانپ اور اپنے سفلی خواہشات اور انانیت کا سر کچلنا انسان کا فریضہ ہے انہیں سر چڑھانے کا درد سر ذلت اور رسوائی کا موجب ہے۔ ایسے خیالات کو سر سے جھٹک کر نیک سرگرمیوں کا انتخاب عزت و اکرام و سرخروئی کا سبب ہوتا ہے اور سر بھی عزت سے سرفراز ہوتا ہے۔ سر جھکانے کو نئی معنویت دینے کے لئے قتیل شفائی نے دنیاوی تقاضوں سے برگشتہ ہو کر شعر کہا ہے کہ

ایک ہی سر ہے جھکا سکتا ہوں کس کس کے لئے انگنت میرے خدا اور میں اکیلا آدمی

سر پر ہاتھ رکھنا، سر سہلانا اور سر دبانا بچوں کے لئے محبت پذیرائی اور شفقت کے اعمال ہیں۔ بیوی کے تناظر میں شوہر عرف عام میں خواہ سر کا تاج سہی لیکن شوہر کے لئے بیوی بہر حال

درد سر وہ بھی لا علاج ہوتی ہے۔شادی کے فوراً بعد بیوی کی سرگوشیوں میں فرمائشوں کی فہرست شوہر کا سر ٹھنکانے، سر اگھمانے اور سر چکرانے کے لئے کافی ہوتی ہے جو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کے مترادف ہے۔اب گھر میں ہی باہم سر ٹکرانے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا شوہر اپنی عزت کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا کر، بجٹ میں پس و پیش کی سر پھوڑی کر کے یہ فریضہ بھی سر انجام دے دے تو اگلی فرمائش یوں سر پر آپڑتی ہے گویا سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ساری شاپنگ کی افتاد شوہر کے سر اس طرح آتی ہے گویا طویلے کی بلا بندر کے سر۔سر بازار بیوی کے سر پر اگر کوئی دھن سوار ہو جائے تو شوہر آشفتہ سر اپنا سر دھننے پر مجبور ہو جاتا ہے اب سر دیا ہے اوکھلی میں تو پھر موسلوں کے ڈر کیسا؟ بالآخر یہ شوہر کی سرگرانی اور کلفت جاں کی شامت بن کر یوں سر پر گرتی ہے۔بقول ناصر کاظمی

پتھروں آج میرے سر پہ برستے کیوں ہو؟ میں نے تم کو بھی کبھی اپنا خدا رکھا ہے

دفتر میں اپنے حاکم اعلیٰ کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرنا۔سر ہلا ہلا کر ان کی ہر معقول و نا معقول بات کی تائید کرنا۔دفتر میں سر جھکا کر سر گرم عمل رہنا درد سر کاموں کو بھی سرنگوں ہو کر سر بخوشی سر انجام دینے کی کوشش کرنا اور جونہی ان دفتری آفتوں میں سر کھپا کر نئے آفت کدے

میں سر کے بل داخل ہونا اور پہاڑ کے نیچے آئے اونٹ کی طرح ادب سے سر جھکا کر سلام کرنا۔اور بیوی کی غلامی نہیں سعادت مند شوہروں کی واضح علامات ہیں۔بیگم کے سر پر شیطان سوار ہو جاتا ہے اور اس سر پھرے طاغوت کی زد میں آ کر موصوفہ بے سر پیر کی باتوں سے میرا سر ''گرم'' کر دیتی ہے۔بچے طنزیہ طور پر مسکرا کر کہتے ہیں ''کیوں اباجی! سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے۔'' اب بھلا بتائیے میرے سر سے زیادہ مسکین اور قابل رحم بھی کوئی شئے ہے یا نہیں۔جس پر بیک

www.urduchannel.in

وقت 'سر' گرم ہونے اور اس پر ستم بالائے ستم بالکل ٹھنڈے ٹھنڈے اولے گرنے کے تجربات سے گذرنا کتنا مضحکہ خیز ہو سکتا ہے لیکن جس کے سر پہ پڑے اس کا سر بری طرح چکرا جاتا ہے۔ بقول شاعر

لگا میں گرد سر پھرنے تو بولا تمہارا تو سر پھرا ہے میر صاحب

بیگم نہ سر پھری ہیں نہ سرکش۔سر کھجاؤں تو مجھے ایسا گمان غالب ہوتا ہے کہ بیگم کے آنے کے بعد کے دن کتنے خوبصورت تھے۔بیگم کے سر پر سہیلیوں سے سبقت لے جانے کی حرص نے ان کے سر پر دس سروں والا شیطان مسلط کر رکھا ہے۔جو مجھے سر موان کے احکامات سے گریز تو کجا سر جھکا کر بجالانے کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔سینکڑوں ارمان روز سر اٹھاتے ہیں لیکن میں صبر کا گھونٹ پی کر ان کا سر کچلتا ہوں۔سر میں سودا سوار ہو جائے تو سر پر سوار اس بھوت کو بھی سر سے اتار لیتا ہوں۔

سوچنے کے لئے سر کھجانا فطری عمل ہے، اگر سر نے سوچ سوچ کر بروقت اپنا صحیح کام کیا اور کوئی کامیابی میسر آگئی تو بڑی شان سے کہا جاتا ہے کہ سر سلامت تو تاج ہزار۔بصورت دیگر سر کی کسی حماقت، اگر نقصان کا شاخسانہ ہو جائے اور ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے تو یوں بھی سر محفل یہ کہہ کر سرزنش کی جاتی ہے کہ سر سلامت تو جوتے ہزار۔بعینہ کامیابی کے لئے سر پر پھولوں کے سہرے باندھے جاتے ہیں اور پنکھڑیوں کی سر پر بارش بطور اعزاز کی جاتی ہے اور ناکامی پر سر پر جوتوں کا ہار پہنا کر سر راہ ذلیل بھی کیا جاتا ہے اور سر بازار گدھے پر بٹھا کر گلیوں گلیوں گھما کر کمر کا کچومر بھی بنایا جاتا ہے۔لہٰذا سر کا استعمال سر پھروں کی طرح کرنا سر پر آفت آنے کے مترادف ہے۔

سر ہلانا انسان کی ازلی عادت ہے انسان غیر ارادی طور پر بات بے بات سر ہلا کر اپنے بیشمار خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔اس کی قسمیں بھی دلچسپ ہوتی ہیں جیسے اثبات میں سر ہلانا،

نفی میں سر ہلانا، اقرار میں سر ہلانا، انکار میں سر ہلانا تائید میں سر ہلانا، تلاوت میں سر ہلانا اور کچھ نئی بات سمجھ میں آجائے تو انکشاف کے اظہار کے لئے سر ہلانا۔ اعتراف میں سر ہلانا، موسیقی کی لے پر سر ہلانا بلکہ سر دھننا زیادہ پسندیدہ مشغلہ ہے، مسواک یا برش کرتے ہوئے سر ہلانا، کھجلی کے وقت سر ہلانا، افسوس میں سر ہلانا، سر کھپانا بھی انسان کی قدیم عادت ہے، جس کی پاداش میں نت نئی ایجادات اور ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ یہ عادت مرزا غالب کو بھی تھی، لہذا بزبان خود فرماتے ہیں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں　　میں کہاں اور یہ وبال کہاں

عموماً سر پر یوں تو ہمیشہ بالوں کا بسیرا ہوتا ہے لیکن اس مظلوم سر پر نہ جانے اور کون کون سوار ہو جاتا ہے۔ کبھی سر پر رنگین خیالوں کا بسیرا ہوتا، کبھی سر پر کفن باندھا جاتا ہے، کبھی سر پر خون سوار ہو جاتا ہے، کبھی سر پر کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے، کبھی سر پر شیطان سوار ہو جاتا ہے، کبھی کوئی بھوت سر پر سوار ہو جاتا ہے، کوئی سودا سر میں سما جاتا ہے۔ چنانچہ کسی انوکھے کارنامے کا بھوت سوار ہو جائے تو پھر اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، وہ جادو سر کے بل آپ سے ہر وہ کام کروالیتا ہے جو آپ اپنے عام معمولات میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سر میں سودا سما جائے یا کوئی عجیب الخلقت دھن سوار ہو جائے تو سر کے بل انسان اس کی پیروی کرتا ہے۔ اس کی خاطر تمام افتاد نا خواستہ کو گوارا کر کے ہر آفت و مصیبت کو سرفروشوں کی مانند بسر و چشم قبول کرتا ہے۔ کوئی کتنا بھی سر پیٹے، سر ماری کرے اسے پشیمان و سرنگوں ہی لوٹنا پڑتا ہے۔ جونہی سر سے بھوت اتر جاتا ہے یا کسی کی کوشش سر کرنے کے سبب یہ بھوت اتار دیا جاتا ہے تو سر جھکا کر حزیمت اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح سر چڑھانا بھی انسان کی فطرت ہے جس پر دل آگیا اسے اتنا سر چڑھاتا ہے کہ اس کی بے سر پیر کی باتیں بھی عالمانہ انداز میں قول فیصل کی طرح مثبت انداز میں سر ہلا کر انہماک سے سنتا ہے۔

www.urduchannel.in

انسان کو سر کی بدولت جہاں عزت میسر آتی ہے اور اسے سراسر یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یا تو اس کی آزمائشوں میں کھرا اترنے کے سبب ہو رہا ہے یا وہ ان گوناگوں صلاحیتوں اور خوش قسمتی کا حامل ہے۔ جس سے وہ تکبر اختیار کرتا ہے بڑے بول کا عادی ااور فخریہ انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ لیکن قدرت کے مکافاتی عمل کو بھول جاتا ہے کہ نمرود کو اس کے مکافات عمل کے لئے حقیر مچھر کے سر میں گھس کر رقص کرنے، سر کے درد نے سر دربار لقمۂ اجل بنایا۔ لہذا تکبر، بڑے بول اور غرور کا سر آخر کار نیچا ہی ہوتا ہے۔ جس سے سر بچا کر بھاگ لیا ہی اصل انسانیت کا معیار ہے

۵۵۔ صحرائی جہاز

اونٹ کو صحرائی جہاز کہا جاتا ہے اگر چہ اس کے پر نہیں ہوتے اونٹ تو نہ تیر سکتا ہے نہ ہی پرواز بھر سکتا ہے۔ بس صحرا کی ریت پر سبک انداز و محو خرام ہوتا ہے۔ عہد قدیم میں جس کے قدموں کی چاپ کی لے پر حدی خواں عربی لوک گیت گاتے اپنے غم واندوہ اور خوشی وطرب کے علاوہ رزمیہ کلاموں کے طفیل بہادروں اور غازیوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ شہدائے غزوات کو خراج عقیدت پیش کرتے۔ جنگی منظر نامے اس قدر خوبصورتی سے بیاں ہوتے کہ ان دل پذیر داستانوں پر نغمہ سرا ہو کر سفر کو خوش گوار اور قدرے آسان بنانے میں کوشاں رہتے تھے۔ بر سبیل حدی خوانی عربی ادب میں بعض اہم فن پاروں کی تخلیق و اضافہ ممکن ہو سکا ہے۔ اس طرح شعرا کو اپنے مافی الضمیر کے نغماتی اظہار کا موقع مل جاتا تھا لیکن اب خطہ عرب کا منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اقدار اور تہذیب و تمدن بھی یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ ماضی کے سرفروش غازیوں اور بہادروں کی جدید نسل نے دم ہلانے کا فن ضرور سیکھ لیا اور کلام بھی اب قصیدۂ مغرب بن کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا نہ اب وہ سوز ہے نہ ساز ہے، نہ وہ فن ہے نہ آواز ہے۔ اب اونٹ کی حیثیت ایک قومی جانور سے زیادہ باقی بھی نہیں رہی۔

یہ ریگستانی جانور ساخت کے اعتبار سے بڑا ٹیڑھا میڑھا اور عجیب الخلقت سہی مگر ذرائع حمل ونقل اور سفر کی خاطر بے انتہا کارآمد ہوتا ہے۔ اگر متلون المزاج فطرت شخص جس کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہو یا اس قبیل کی کوئی انسانی نظیر مل جائے تو اس سے از راہ مذاق یوں بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ اونٹ کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑا وفادار، صابر، جفاکش اور محنتی جانور ہے جو سخت سے سخت موسم میں بھی ثابت قدم اور سینہ سپر رہنے

کا عادی ہے لیکن اس میں اور حضرت انسان میں ایک عیب قدرے مشترک ہے کہ دونوں طبعاً بڑے کینہ توز واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا اونٹ اپنے ذات پر ہونے والے مظالم اور رنج ادائیوں کو بہت آسانی سے بھول نہیں پاتا اور اپنے مدمخالف کو وہاں (لق ودق صحرا میں) لے جا کر انتقاماً مارتا ہے جہاں قرار واقعی پانی نہ ہو۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ عورت کے مکر اور اونٹ کی پکڑ سے اللہ بچائے۔

انسانی عادات وخصائل میں سب سے نمایاں عادت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ازلی طور پر معصوم، بے گناہ اور دودھ کا دھلا تصور کرنا اور تمام عیوب کا الزام دوسروں کے سر لگانے میں پیہم کوشاں نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس جذبے سے سرشار وہ خود کارستانیاں انجام دینا اور دوسروں کے سر منڈھ دینا اس پر ستم بالائے ستم سارے شہر میں اونٹ بدنام کہہ کر اپنی بات میں زور بھی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اونٹ اپنے پیٹ میں کئی کئی دن کا پانی کا ذخیرہ کر لیتا ہے اور صحرا کے سفر میں جب پانی کی ضرورت ہو تو اسی ذخیرے سے استفادہ کر لیتا ہے۔ بہت زیادہ پانی پینے والے شخص کو اونٹ کی مثال دی جاتی ہے۔

انسان کو مستقبل کے معاملات کی جب خبر نہ ہو یا وہ اس بات کو دوسروں پر منکشف نہ کرنا چاہتا ہو تو از راہ تاویل اپنی لاعلمی پوشیدہ رکھنے کو کہہ دیتا ہے کہ دیکھئے اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے جس اونٹ پر اسے بیٹھنا چاہیئے تھا وہ بذات خود اونٹ کے بیٹھنے کا منتظر ہوتا ہے اور بڑے انہماک سے کروٹ کا مشاہدہ کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ اسی طرح بیٹھے بٹھائے ہدایات دینا اور فضول مشوروں کی سوغات دینا بھی برصغیر ہندوپاک کے باشندگان کا محبوب مشغلہ جسے محاورتاً اونٹ پر بیٹھ کر بکریاں ہانکنا سب سے آسان کام ہے یہ فقرہ کہہ کر دل ہلکا کر لیا جاتا ہے۔ اور اگر تقدیر مہرباں نہ ہو اور کوئی کام بنتا نہ ہو یا توقعات سے بھاری نقصان کا سامنا درپیش ہو تو کہا جاتا ہے جب قسمت ہی

www.urduchannel.in

خراب ہوتو اونٹ پر بیٹھ جایئے، وہاں بھی کتا کاٹ کھاتا ہے۔

جب حضرت انسان اپنی شرست کو شرمندہ کرنے کے افعال انجام دیتا ہے تو احتیاطاً یہ بھی کہہ کر دامن چھڑالیا جاتا ہے کہ اونٹ یا انٹوں میں یا اپنے کھونٹوں پہ ہی ٹھیک رہتا ہے۔ اونٹ سوار مہار کہلاتا ہے اور آزاد شخص یا کنواروں کے لئے مہار بے نکیل کی اصطلاح بطور طنز استعمال کی جاتی ہے۔ جب حالات سے مجبور انسان جب کسی اپنے ہم جنس انسان کے آسرے یا سہارے کا منتظر ہو تو اسے بجائے ساتھ دینے کے یہ کہہ کر تشبیہ دینا بھی انسانی فطرت و عادات کا حصہ ہے کہ تھکا اونٹ سرائے کو تکتا ہے۔ اگر کوئی چیز اپنی درکار مقدار سے از حد کم ہو اور اس کی تحقیر و تشہیر بھی مقصود ہو تو اونٹ کے منہ میں زیرہ کہہ کر نسبت پیدا کی جاتی ہے۔ لہٰذا اونٹ سے متعلق مذکورہ تحریر بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ ہی تسلیم کی جائے گی۔

www.urduchannel.in

۵۶۔ بات کی بات

بات لاکھوں کی بات ہوتی ہے۔ بات اگرچہ مادی شئے نہیں ہوتی ہے، نہ بات سے شکم پروری کا امکان ہی ہے مگر نہ جانے کیوں باتوں سے پیٹ بھرنے کا لطیف طنز بھی کیا جاتا ہے اور غذا سے زیادہ بات اگلنے، بات نگلنے، بات چبا چبا کر کرنے، بات پچانے، بات ہڑپ کرنے،، بات میٹھی کرنے، بات تلخ کرنے، بات تیز کرنے، بات ترش کرنے، بات کھٹی کرنے، بات لچھے دار کرنے، بات مزے دار کرنے، بات میں قند گھولنے، بات پیدا کرنے، بات پھیلانے، بات چھو کر کرنے، بات زہر لگنے، بات ختم کرنے اور بات پی جانے کی روایت بھی معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ بات اگرچہ کوئی بھات کی ہنڈیا بھی نہیں ہے کہ بات کچی رہ جائے بات پکی ہو جائے، بات بگھاری جائے، بات بگڑ جائے، بات کو دل ہی دل میں پکایا جائے یا بات بن جائے۔ بات اگرچہ کوئی طبعی جسم بھی نہیں رکھتی مگر بات چلانا، بات اٹھانا، بات پکڑنا، بات چھوڑ دینا، بات پا جانا، بات ڈالنا، بات بڑھانا بات ڈھال کے کرنا، بات میں رخنہ ڈالنا، بات چھڑنا، بات نکال لینا، بات بٹھانا، بات گول کر جانا، بات کھڑی کرنا، بات الجھانا، بات سلجھانا، بات کھری کرنا، بات کھوٹی کرنا، بات صاف کرنا، سترہ رنگ کی بات کرنا، بات موڑنا، بات کاٹ دینا، بات بند کر دینا، بات کھل جانا، بات گھمانا، بات دہرانا، بات ہلکی کرنا، بات گہری کرنا، بات جانا، بات آنا، بات اڑانا، بات اکھڑ جانا، بات بنانا اور بات ڈبو دینا بھی انسانی شرست کا حصہ ہے۔ بات باہمی مراسم اور مافی الضمیر کے اظہار کے تسلسل کا واحد ذریعہ ہے۔ باتوں کی برکت سے محفلیں شاد و آباد ہوتی ہیں بات سے بات چلتی ہے تو محفل رنگ پر آتی ہے۔ جب باتوں میں بات بگڑ جاتی ہے تو بعض اوقات بات بڑی مشکل سے بات ہوتی ہے۔ سلیمان خطیب نے بڑی خوبصورت ''بات'' کہی ہے جس کے ہر شعر

کلیات شب انصاری — شب نور دیار

میں ایک نئی بات ہے۔جو بات سے مزید بات پیدا کرنے کے روشن امکانات رکھتی ہے۔

'بات'

بات ہیرا ہے، بات موتی ہے — بات لاکھوں کی لاج ہوتی ہے
بات کانٹوں کا تاج ہوتی ہے — بات پھولوں کا باغ ہوتی ہے
بات خیر و ثواب ہوتی ہے — بات قہر و عذاب ہوتی ہے
بات برگ گلاب ہوتی ہے — بات تیغ و عتاب ہوتی ہے
بات کہتے ہیں رب ارنی کو — بات ام الکتاب ہوتی ہے
بات بولے کلیم ہو جائے — سننے والا ندیم ہو جائے
بات خنجر کی کاٹ ہوتی ہے — بات شاہیں و عقاب ہوتی ہے
بات ہر بات کو نہیں کہتے — بات مشکل سے بات ہوتی ہے

آپس میں بات کرنا بلکہ خوب باتیں کرنا انسان کی فطری جبلت ہے اور بعض اوقات مجبوری بھی کہ انسان اپنی جنس کے علاوہ کسی اور مخلوق سے چاہ کر بھی بات نہیں کر سکتا۔ اس خیال سے کہ آپس میں باتیں کر کے ذرا دیر اپنا دل ہلکا کر لے۔ یہ علحدہ موضوع ہے کہ بات کرنے میں کبھی بات بن جاتی ہے یا بنالی جاتی ہے تو کبھی بات بے بات پر بات بھی بگڑ جاتی ہے اور بات وہاں تک پہنچا دی جاتی ہے جہاں بات پہنچنے سے بات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ جہاں دو انسان ملتے ہیں وہاں کسی نہ کسی موضوع پر بات نکل ہی جاتی ہے لیکن اسے وہیں بھولنے میں ہی عافیت ہے ورنہ بات نکلے گی تو بہت دور تلک جائے گی۔ بقول شاعر

بات نکلی تھی اک زمانے کی — جس کو عادت ہے بھول جانے کی

مرد و زن میں دوسروں کی بات (غیبت) کرنا اگرچہ بری بات سہی لیکن ایسی بات کے چٹخاروں

www.urduchannel.in

کی لذت کی بات ہی کچھ اور ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا ذہانت، تجربے اور تخلیقی صلاحیت کی بات ہے۔ اس بات کی سمت مثبت اور کوشش نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ اگر کسی محاذ پر جنگ چھڑ جائے تو کبھی نہ کبھی گولہ بارود ختم ہونے پر جنگ ختم ہو سکتی ہے لیکن بات چھڑ جائے تو باتوں کا سلسلہ ہرگز بھی رکنے کا نام نہیں لیتا۔ فریقین بات کو تہہ کرنا بھول ہی جاتے ہیں اور باتوں کے گولے بارود جن پر فرصت کے علاوہ کوئی سرمایہ درکار نہیں ہوتا۔ لہذا بلا تکان و تکلف باہم ایک دوسرے پر باتوں کے گولے بارود برساتے رہتے ہیں۔

اکثر و بیشتر مرد کی بات اعتبار کا درجہ رکھتی ہے یہ بات عہد قدیم سے رائج ہے خواہ پھر انجام کار فائدہ ہو یا نقصان وہ بات کا دھنی ہی کہلاتا ہے۔ اسی لئے مرد کی بات وزن دار ہوتی ہے اور بلآخر مرد کی بات رکھ لی جاتی ہے۔ اگرچہ ہر مرد بات کا پکا ہو یہ کوئی کلیہ یا رائج الوقت اصول تو نہیں ہے لیکن فی زمانہ اقدار کے انحطاط کے ساتھ مردوں میں بھی بات کے ہیٹے، بات کے ہلکے اور بات کے کچے مرد بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے بات بدلی ساکھ بدلی یعنی بات سے آدمی کی ذات کی شناخت کر لی جاتی ہے۔ عموماً مرد سارے مسائل تو بات چیت سے حل کر لیتا ہے۔ یہ معاملہ شخصی سطح سے لے کر بین الاقوامی پیمانے پر بھی عائد ہو جاتا ہے۔ جہاں ملکوں کے مابین پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل بھی بات چیت سے نکال لیا جاتا ہے۔ بس خانگی معاملے میں اس حکمت عملی کی بات بگڑ ہی جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات دل کو کھٹک جاتی ہے یا کوئی بات دل میں رہ جاتی ہے جس سے زوجین میں بات کرنے سے بات بھی زہر لگتی ہے۔ جب کہ ان ہی زوجین کو شادی سے پہلے ایک دوسرے سے بات کرنے میں باتوں سے پھول جھڑنے کا گمان غالب ہوتا تھا۔ محبوب کی ہر بات بھلی معلوم ہوتی ہے اور پس شادی بیوی کی ہر بات زہر خیر یہ وقت کا اہم و سنگین مسئلہ ہے جو اپنے ساتھ بات کے مفاہیم اور انسان کے سلوک کو بھی تبدیل کر دینے سے گریز نہیں

کرتا۔ جسے ہم بات کی بات اگر سمجھو بات کو بات رہنے دو کے زمرے میں شمار کر لیتے ہیں۔

وہ سر کردہ افراد جن کو باتوں باتوں میں چٹکلے دار اور مزیدار باتیں کرنے اور بات سے بات پیدا کرنے کے داؤ پیچ اور بات کے پینتروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ اپنے مطلب کی بات چھیڑ کر بات بات میں اسی بات کو اس طرح گھما کر بات کرتے ہیں کہ ان کی ہر بات میں سو سو باتیں اور اور ہر بات کے پس پردہ دوسری باتیں بھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ آپ سے بھی اپنے دل کی بات اگلوا لیتے ہیں۔ ان کی ہر بات میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور مد مخالف ان کے لئے بات بے بات زہر اگلتے ہیں لیکن کسی بھی بات پر ان کی پیشانی پر بل نہیں پڑتے۔ یہ اہل سیاست، زمانہ ساز اور عیار طبع طبقے کی بات ہے۔ جس کے لئے ہر شخص کو ان کی بات بھانپنے، بات کو تاڑنے، بات کی تہہ میں اترنے اور بات بات میں ذات کو پہچاننے کا فن سیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو عمیق تجربے، حاضر دماغی اور ذہانت کی بات ہے ورنہ ایسے سادہ لوح اشخاص کی بات پکڑ میں آجاتی ہے اور بات بے بات ان کو نقصان لاحق ہو جاتا ہے جو بالکل خراب بات ہے۔ بقول شاعر

مبہم بات پہیلی جیسی، بس وہی بوجھے جس کو بجھائے
بھید نہ پائے تو للچائے، بھید جو پائے تو پچھتائے

خواتین کو باتونی قرار دیا جاتا ہے کہ وہ بے پر کی بات کرتی ہیں لیکن عام مشاہدہ ہے کہ نسبتاً مرد بھی بات کرنے میں کسی قدر پیچھے نہیں رہتے اگر چہ ان کا معیار، تناظر اور موضوع مختلف ہوتا ہے۔ بس خواتین کی باتوں کا محور گفتگو مخصوص مدار پر ہی گردش کرتا ہے۔ ان کی اپنی صوابدید کے مطابق وہ اپنی دلچسپیوں سے متعلق بات کرتی ہیں۔ اکثر ایک دوسرے کی ذات کو بات کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتیں۔ خواتین میں رشتوں کی بات چلانے، بات لانے، بات لے جانے، آئی ہوئی بات پر

www.urduchannel.in

رائے دینے اور باتوں باتوں میں پس پشت تبصرہ کرنے میں بھی سر گرم عمل نظر آتی ہیں۔ بات کو ایک کان سے دوسرے کان تک پہنچانے اور بات کو گل سے گلزار بنانے میں بھی خواتین ید طولی رکھتی ہیں، جس پر گمان ہوتا ہے کہ بات کہے زمین کی تو بات سنے آسمان کی تاکہ بتنگڑ بنانے میں آسانی ہو۔ بہتر ہے کہ ایسی بات کو بھلا ہی دیا جائے۔

عموماً عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔ محفل میں بات اٹھانا، اپنے دل کی بات دوسروں کے کان تک پہنچانا، دوسروں کی باتوں پر کان رکھنا، باتیں بگھارنا، مزے دار اور میٹھی باتوں بلکہ باتوں باتوں میں غیر محسوس طریقے پر اپنے مطلب کی بات نکال لینا پھر اس بات کا زبردست بتنگڑ بنا لینا اور بات کا ہوا بنا لینا بھی زنان عام کی خاص عادت بھی ہے۔ اگر چہ اس بات کو بھی تخلیقی صلاحیت کے ضمن میں ہی شمار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی سمت منفی ہوتی ہے۔ خواتین کا شب و روز کا شیوہ ہے دیگر خواتین کے منہ کی بات پکڑنا پھر اس بات کو شرط راز داری سے بصد احتیاط پھیلانا، بات کھل جانے پر علی الاعلان اس بات کا جا بجا چرچہ کرنا گویا بات حلق سے نکلی اور فلک کو پہنچی اور جب بات کسی کے دل کو لگ جائے، بات کھل جائے یا مزید بات بگڑ جائے تو بات بڑھانا، بات رد ہونے پر چپا چپا کر بات کرنا پھر بات کو بھانپ کر بات الجھانا، بات گھمانا اور جب بات قابو سے بالکل باہر ہو تو بات کو چٹکیوں میں اڑانا، بات سے پھر جانا اور تب بھی بات نہ سنبھلے تو آپس میں بات بند کر کے بات ہی ختم کر دینا۔ خواتین کی ان ادائے کافرانہ کی بھی کیا بات ہے۔

بات کہنے والا ابھی بات مین الجھ کر رہ جائے اور بات سے متعلق کہہ اٹھے کہ

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسے تو نہ تھی　　جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسے تو نہ تھی

۵۷۔ ہارن.....ایک شور ہے وگرنہ

سواریوں میں جتنی اہمیت اس کے اجزائے ترکیبی کی ہوتی ہے جن کے بغیر سواری کی تعریف مکمل نہیں ہو پاتی ان اجزا میں سب سے اہم جزو ہارن ہے۔اگر چہ اس کے بغیر بھی سواریاں چل سکتی ہیں لیکن گونگی سواریوں کو گونگی بیویوں کی طرح ناپسند کر دیا جاتا ہے۔جس کا مقصد سواری کے چلنے سے زیادہ بھیڑ کو قابو کرنا ہوتا ہے قدیم زمانوں میں یہی کام چابک، کوڑوں اور دیگر ذرائع سے لیا جاتا تھا،اب جسمانی ایذا رسانی کی بجائے صوتی آلودگی اور سمعی ایذا رسانی قدرے آسان،تلذذ آمیز اور توجہ مرکوز کرنے کا باعث بھی ہے۔مرزا غالبؔ کی روح سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ

ایک شور ہے وگرنہ مراد اطلاع نہیں

راستوں پر ٹریفک کی نکاسی یا کسی حادثے کی پیشگی اُطور پر اطلاع دینا ہارن بجانے کا مقصد ہوتا تھا۔اب ہارن بجانے کا عمل شوقیہ،شیطانیت کے اظہار،اپنے وجود کا احساس دلانے اور مخصوص اشارے دینے کی سبیل بھی ہو چلا ہے۔ پہلے یہ عمل جرس قافلہ،سریلی گھنٹیوں یا ربر کے بھونپو سے لیا جاتا تھا بقول میر تقی میر

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا — تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے — جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

جس سے عوام جنہیں موسیقی سے خاص تعلق ہوتا ہے راستے سے ہٹنا تو درکنار اس سے لطف اندوز ہونے کے راستے تلاش کرنے میں محو ہو جاتے تھے۔لہذا اس عوامی بے رخی اور بے حسی (تجاہل عارفانہ) کے رد عمل میں تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اب بے حد تیز،بے ہنگم،ناشائستہ اور

www.urduchannel.in

کریہہ قسم کی آوازوں سے لیس ہارن آپ کی سماعتوں پر ضرب لگانے (ہتھوڑے برسانے)،چونکانے،آپ کو جھنجھوڑنے اور عالم ہوش میں لانے کی سبیل بنتے جا رہے ہیں۔فی زمانہ ہارن کی تنوع،اقسام،شدت صوت اور عدم موسیقیت کے کیا کہنے،ہارن کی آواز راہگیروں کے حواس پر یوں سوار ہوتی ہے جیسے روز محشر کا صور پھونکا جا رہا ہو،حضرت اسرافیل بھی مشکوک ہو جائیں کہ کس نے میرا رول اڑا لیا ہے۔جدید ہارن ایسے دردندوں اور چوپائیوں کی عجیب وغریب آوازوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ مردے بھی قبر سے بھاگ کھڑے ہوں۔بقول انور مسعود

ہو سکتی ہے،کچھ ثقل سماعت،کی شکایت — بے کار کوئی کان بھی ہو سکتا ہے اس سے

اس تنبیہہ کے قطع نظر نوخیز بچے بالے اسے متواتر شرارتاً بجا کر اپنے شیطانی جذبات کی تسکین کر لیتے ہیں۔ پہلے ہارن کی اقسام بھی گاڑیوں کی ساخت پر موقوف ہوتے تھے،اب تو آئے دن مغالطوں کی واردات ہو جاتی ہے اور راہگیر کو اپنی سبکی کا احساس ہو جاتا ہے،جب ہارن بجتا ہے تو گمان ہوتا ہے دیو پیکر گاڑی کی آمد کا لیکن عقب میں دیکھنے پر مریل سا رکشہ یا ایک مکروہ قسم کا اسکوٹر رونما ہوتا ہے اور بے اختیار زبان کہہ اٹھتی ہے ''ہت ترے کی۔۔۔۔کھودا پہاڑ نکلا چوہا''

پہلے کچھ مخصوص قسم کے ہارن خاص سواریوں کیلئے مختص تھے۔جن کے دم سے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں،ایمبیولنس اور پولس کی گاڑیوں کی شناخت تھی اور اس شناخت سے وابستہ سامعین میں احترام یا احتیاط کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔بقول شاعر یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا، اب انہیں بھی ہر خاص وعام نے اپنے معمول کی سواریوں میں زیر استعمال لے لیا ہے۔ہارن بجانے والا بیچارہ بھلا مانس بلکہ معصوم ہوتا ہے۔فی زمانہ اسے محض اپنی وقتی غرض عزیز ہوتی ہے کہ راستہ مل جائے اور سفر مسلسل یکساں رفتار میں جاری رہے۔اسلئے اس کو اپنے ساز عزیز کے کریہہ اور کرخت ہونے کا نہ اندازہ ہوتا ہے اور نہ وہ اس کا احساس ہی کرنا چاہتا ہے کہ اس کے

سامع اس ہارن کی سماعت پر کتنے افراد کس قدر اذیت کا شکار ہوتے ہیں۔ نہ قرب و جوار کی مساجد اور دیگر عبادت گاہوں کی خموشی اور سکون کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے نہ کسی کی نیند و آرام کا خیال ہی گذرتا ہے، نہ مریضوں کی تکالیف کا احساس کیا جاتا ہے، نہ ہی اس بات سے کوئی سروکار کہ سامعین کے ذوق لطیف پر یہ ہارن کس طرح شاق گذرتا ہے۔ کاش ایسا کئی ہارن بھی ایجاد ہو جائے جو واقعئ اس قوم کو غفلت سے بیدار کر دے ایک شاعر مشرق علامہ اقبالؒ تھے سو تحریر و تقریر کے حوالوں سے زیادہ کارآمد نہ ثابت ہو سکے۔

۵۸۔ قرض ایک مرض لینا فرض

بارہا عوام کو کانوں کو ہاتھ لگا کر یہ توبہ اور دعا کرتے بارہا سنا ہے کہ خدا دشمن کو بھی قرض دار یا قرض خواہ نہ بنائے۔ پہلے کسی زمانے میں قرض داروں کو مجبور، محکوم اور مظلوم تصور کیا جاتا تھا۔ قرض خواہ کا تصور کسی سود خور استحصال کرنے والے ظالم بنیا یا مہاجن وغیرہ کا تھا قول بھی مشہور ہے کہ جس کا دوست بنیا اسے کیا دشمن درکار؟ لیکن فی زمانہ جہاں بہت ساری اقدار اور روایات وقت کے ساتھ متغیر ہو گئیں ہیں۔ قرض خواہی کا کردار اب بینک اور فائنانس کمپنیوں کے حصے میں آ گیا ہے اس مناسبت سے مذکورہ معاملہ کی بھی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اس معاملے میں بھی اب مجبور محکوم اور مظلوم تو قرض خواہ ہی نظر آتے ہیں۔

قرض دینے میں عجب ہے اک دھڑکا سا　　　　که جانے کون کہاں راستہ بدل جائے؟

قرضدار کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک ان کو قرض میسر نہ ہو وہ بینکوں، اقتصادی اداروں یا قرض خواہوں کے در نیاز کا طواف کرتے رہیں گے، عاجزانہ و خوشامدانہ سلام بھی بجا لائیں گے۔ ان کی اپنی ایمانداری، مجبوریوں اور آپ کی مہربانیوں کی فہرست جتاتے بھی نہیں تھکیں گے۔ بس ایک مرتبہ قرض ہاتھ آ جائے تو وہ لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا کی مصداق گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں تقاضوں کے سلام پر وعلیکم السلام کہنے کی بھی توفیق بمشکل تمام میسر آتی ہے۔ آپ کا نام سنتے ہی ان کے چہرے کے تاثرات ایسے بگڑ جاتے ہیں گویا کھانے میں کنکر پڑ گئے ہوں پھر وہ آپ کو کہیں نظر نہیں آتے ہیں اور اگر نظر آ بھی گئے تو ان کی پہلی کوشش ہوتی ہے آپ کو نظر انداز کر کے اپنا راستہ ہی نہیں لیتے ہیں بلکہ راستہ بدل لیتے ہیں اور دھر لئے گئے تو ان کا عندیہ ایک خوبصورت بہانہ ہوتا ہے اور دل میں یہ

بات ہوتی ہے کہ

بہت بچ کے نکلے مگر کیا خبر تھی — ادھر بھی ترا آستانہ پڑے گا

اگر آپ نے قرض کا ذکر از راہ انسانیت نہ چھیڑا تو وہ بھی اس سے بصد تجاہل عارفانہ گریز کریں گے اگر آپ نے یوں ہی سرسری ذکر کر دیا تو لیجئے اب عاجزی اور انکساری کے سر تبدیل ہو کر اونچے سروں میں طنز کے نشتر اور صلواتوں کے تیر کھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہم کیا کھا جانے والے ہیں، ہم کہاں بھاگے جا رہے ہیں، آپ کی رقم کہیں نہیں جائے گی، آپ کو تو پتہ ہے آج کل روپئے کو پاؤں نکل آئے ہیں کہیں رکنے کا نام نہیں لیتا، آپ بے فکر جائیں رقم جمع ہوتے ہی پہنچا دوں گا وغیرہ لیکن ان کے چہرے پر مکر و فریب کے آثار صاف مترشح ہو جاتے ہیں۔ عبرت کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا قول ہے جس پر احسان کرو پھر اس کے شر سے بچنے کی تدبیر کرتے رہو۔ اب اگر آپ نے ترس کھا کر کسی کو قرض دے دیا ہو تو اس کے بھی شر سے جائے امان کی تلاش ہی بہتر ہے کہ

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

قرض کے مفاہیم بھی کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔ قرض کی ایک قسم ہے قرض حسنہ یعنی ایسا قرض جو بلا سودی ہو اور جس کی واپسی کی کوئی مدت یا معیاد مقرر نہیں ہوتی ہے۔ اس قسم کے قرض کا اجر آخرت میں سود سے کہیں زیادہ مل جاتا ہے۔ لیکن عصری تقاضوں کے طفیل دوسرا مفہوم ہے صوتی اعتبار سے قرض ہنسنا یہ ایسا قرض ہے جسے قرض خواہ بھلے اپنی حماقت یا سادگی کے زعم میں آ کر قرض دار کو دینے کو تو دے دیتا ہے لیکن باوجود ہزاروں کوشش اسے واپس وصول نہیں کر پاتا۔ قرض دار قرض خواہ کی کوڑھ مغز عقل اور اپنی دانش مندی پر بصد ناز ہنستا رہتا ہے لہذا یہی قرض ہنسنا کی اصل وجہ تسمیہ بنی۔ قرض دینے والی کی عقل جب گھاس چرنے نکل جاتی ہے یا وہ کسی

www.urduchannel.in

غفلت میں یہ اقدام کر بیٹھتا ہے تو اسے رونے کے لئے مزدور بھی کم پڑ جاتے ہیں۔ اول تو وہ مارے انسانی ہمدردی، رحم دلی اور غمگساری کے جذبے کے تحت قرض دیتا ہے اور اپنا سر اوکھلی میں بصد خوشی دے دیتا ہے اور خام خیالی یہ بھی ہوتی ہے کہ موسل بھی نہ پڑیں۔ لیکن قرضدار سے قرض کی وصولیابی کے لئے اتنے موسل جھیلنے پڑتے ہیں کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کے عذر لنگ کی روداد شیطان کی آنت سے زیادہ طوالت اختیار کر لیتی ہے جسے سن سن کر کان پک جاتے ہیں اور ان کے در کے اتنے چکر کاٹنے پڑتے ہیں کہ

اے کاش پا سکتا تھا رقم قرض کو میں — جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

قرض کسی زمانے میں اہم و ناگزیر ضرورت کے اعتبار سے بحالت مجبوری لیا جاتا تھا جسے طلب کرنے میں قرضدار کو بڑی عار محسوس ہوتی تھی۔ قرض طلب کرنے کا مدعا زبان کی نوک سے ادا کرنے میں قرض دار کو غیرت آڑے آتی تھی اور جان جاتی تھی۔ اب قرض لینا معمولات حیات ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ معاشرے میں حیثیت و جاہ و جلال کی دوڑ میں شامل ہونے کا ذریعہ بھی ہے بلکہ قرض نہ طلب کرنے والا نرا کورا آدمی ہے جسے دور جدید میں آرام و آسائش کا لطف اٹھانے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ کامیابی کی چند علامتوں میں سے قرضداری بھی ایک عمل ہے آدمی جتنا بڑا ہو گا وہ اتنا ہی بڑا قرضدار بھی ہو گا۔ قرض لینے کے اسباب میں معیار زندگی کو بلند کرنا، شوقیہ قرضے لے لینا تا کہ قرض خواہ ان کے سامنے گڑگڑا کر اپنی رقم کی بازیابی کے لئے درخواست گذار رہیں۔ چار افراد کے مابین عزت سے قرض خواہ کی طرف سے (تقاضے کا) سلام موصول ہو تو ان پر موصوف کے رعب داب سے تاثر قائم ہو کہ بڑے مکرم و محترم ہیں۔ قرض ضرورتوں سے زیادہ ایسے مد میں لیا جاتا ہے جس مد پر مقروض اپنی ذاتی رقم خرچ کرنا عبث تصور کرتا ہے کہ منہ سے مانگنے سے دودھ مل جائے تو بھینس (قرض) کیوں پالی جائے جس کا چارہ (سود) زیادہ مہنگا ثابت ہوتا ہے۔

میری دانست میں انسان کی بنیادی ضرورتیں غذا لباس اور مکان (خواہ کرائے کا ہی کیوں نہ ہو) فی زمانہ بھی اسقدر گراں ایسے سنگین نہیں جو اسے قرضداری اور رہن جیسی علتوں کا اسیر بنا دے۔ الغرض انسان اپنی ضرورت سے زیادہ فضول مقصد، آسائش اور نام نمود کی طلب میں مقروض ہونا پسند کرتا ہے اور یہی عصر حاضر کا طریق بھی ہے۔ مذکورہ چونچلے دور حاضر کی ہی کہانی نہیں بلکہ ماضی میں بھی ادھار ملے تو ہاتھی باندھ لینے کی روایات مل جاتی ہیں۔ چچا غالبؔ کا مطمع نظر قرضداری کا تقاضہ بڑی سادگی یعنی بوتل بھر قرض پر منحصر تھا کہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ قضیہ تھا غیر سودی قرض کا جس کا دینا باعث اجر تصور کیا جاتا ہے لیکن ہمارے لین دین کے معاملاتی رویوں نے اسے ایک جھوٹ ہزار بلا ٹلے کو مقدم جان کر سرے سے مکر جانے اور جان بچا لینے میں ہی عافیت محسوس کی۔ سودی قرض کی لعنت نے انسان کو جبر استبداد استحصال کا طریقہ بتایا۔ کسان بزعم تمام بینکوں و دیگر اقتصادی اداروں کے طواف کر کے، ان کے لوازمات کی تکمیل کر کے قرض تو حاصل کر لیتا ہے۔ جس کے خوف سے حوصلہ مند کسان اپنے ان عزائم کے باوجود ناکام ہو جاتا ہے اس نظام نے ہزاروں کسانوں کو خودکشی پر مجبور کر دیا ہے۔ بقول سید عارف

لکھ مرے نام زندہ عذابوں کی ہر گھڑی　　شاید زمیں کا قرض اکیلا چکا سکوں

ایک ماہ میں جب بھی آپ کریڈٹ کارڈ سے قرض لیں گے آپ کو پچاس دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ جسے آپ معینہ معیاد پہلے سرکاری اعانت اور قرض معاف ہو جانے کی امید میں مزارعوں اور کاشتکاروں نے بینکوں، اقتصادی کمپنیوں اور مہاجنوں سے بھاری بھاری قرض لے لئے ان رقومات سے اپنی ضرورتوں کا مداوا کر لیا رہے سہے پرانے ارمان کی بھی جی بھر کے تکمیل کر لی۔ جب فصل کی نوبت آن پڑی اور رقم کا اصراف لازم آیا تو موسم پر تکیہ کیا۔ آسمان کی طرف اٹھنے والی امید کی نظر جب بینکوں، مہاجنوں ساہوکاروں اور اقتصادی کمپنیوں کیطرف اٹھنے لگی ہیں تو پھر کس کرم کی فریاد دادرسا ہوگی؟ بقول

www.urduchannel.in

فیض احمد فیضؔ

خاک رہ جاناں پر کچھ خوں ہے گرو ہ اپنا　　اس فصل میں ممکن ہے کہ قرض اتر جائے

کہتے ہیں قرض سے بڑی غلامی کچھ اور نہیں ہوتی۔ اس مقولے کو مغرب کے عیار بگلا بھگتوں نے رہزنی، کنگال ہو جانے کا خوف، صاحب حیثیت ہونے کا زعم اور اسی قسم کے فریب دے کر ہر کس و ناکس کو قرض دار بنا رکھا ہے۔ بینکوں نے اپنے صارفین کو کریڈٹ کارڈ جاری کر کے دائمی مقروض بنا لیا ہے۔

میں کبھی ادا نہیں کر پاتے لہذا آپ کو دس کی تاخیر پر دو ماہ کا سود دینا ہوتا ہے مزید تاخیر میں سود کے ساتھ سود مرکب کا تازیانہ بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح سارا معاشرہ ہی سود خوری کے نظام کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ جسے ہم اپنے زعم شخصیت کے طفیل ایک سہولت اور قرضداری کے خوف سے فرار سے ضرورتعبیر کرتے ہیں لیکن اسی سودی نظام میں تار عنکبوت کی طرح الجھ جاتے ہیں۔ جب اخبار میں قرض کی بازیابی کی نوٹس شائع ہوتی ہے اور ذلت آمیز برتاؤ سہنا پڑتا تو عقل پر ماتم کی صرف یہی صورت حال بچتی ہے کہ

وقت کی خاطر نہ زمانے کے لئے زندہ ہوں　　قرض مٹی کا چکانے کے لئے زندہ ہوں

۵۹۔ شعرا کی چشمک

شعرا میں باہمی چشمک حسد و رقابت گروہ بندی ادبی میلانات و رجحانات پر اختلافات کی ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ پل دو پل کی بات نہیں کئی صدی کا قصہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔لہذا اس بندر بانٹ کا راست فائدہ سامعین اور بعض اوقات اردو ادب کو بھی میسر آتا ہے۔استاد شعرا کو بڑا غرہ ہوتا ہے کہ وہ فن کی تمام تر باریکیوں سے واقف ہیں،صنائع بدائع،صرف نحو،تراکیب و شوکت الفاظ کو گھول کر پی لیا ہے علم عروض کی تمام اقسام سے واقفیت ہو چکی ہے۔لہذا وہ اپنے قد کے آگے دوسروں کو بونا سمجھتے ہیں۔شاعر جتنا اپنے حق میں حساس ہوتا ہے اتنا ہی دیگر شعرا کے بارے میں بے حس بھی بالخصوص اپنی ہی قبیل کے شعرا کے لئے۔بصد معذرت عرض ہے کہ یہی اوصاف ہمارے اطراف موجود پالتو اور سب سے وفادار جانور میں بھی نمایاں ہیں بلکہ انہیں اوصاف کی وجہ سے اسے دہلیز سے دور رکھنے کی ہدایت بھی دی جاتی ہے۔دور جدید کے شعرا کو اپنا نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیئے ورنہ یہی اعتراض کیا جائے گا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔

ادب میں غنڈہ گردی نہ سہی اس کے خفیف عناصر تو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی درجے میں رہے ہیں۔استاد ذوقؔ کے پاس ایک گروہ شاگردوں کا تھا تو دوسرا گروہ گرگوں اور گماشتوں کا بھی تھا۔کم و بیش ایسی ہی جمیعت داغ دہلوی کے ہاں بھی موجود تھی۔جن کو چلمن سے لگے بیٹھنے کا ہنر خوب آتا تھا گویا یہ حضرات حساس و نازک مزاج استاد شعرا نہ ہوئے بلکہ ادبی اکھاڑوں کے ادبی پہلوان ہوئے۔غالب کے لہجے میں بھی رعونت کے آثار نمایاں ہیں انہیں بھی اس بات پر افتخار رہا کہ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری گویا ادب کی بنیاد ہی اساتذہ شعرا نے اپنی بالادستی کی غرض سے سپہ گری پر رکھی۔اس سپہ گری کو ہی ادب کا طریق و شعار بنا لیا۔کہیں غالب کو بھی برابر محسوس

www.urduchannel.in

ہوتا رہا کہ وہ اس منفی سیاست کا شکار بھی ہیں۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح زباں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

نتیجہ یوں ہوا کہ منافقت و منافرت کو ہوا ملی کچھ مصاحبوں اور بدخواہوں نے اس عمل کو مہمیز لگایا۔سخن وروں نے علمی طریقہ اپنایا۔عقل کی تلوار کو دشنام گوئی کا آب دار ہتھیار بنا کر پیش کیا گیا۔ایک دوسرے کی شان میں ہجویہ کلام کہے گئے،ٹانگیں کھینچی گئیں،ہجویہ القاب و عرفیات کا سلسلہ چل نکلا اشارے کنائے اور رمز و توافق کا سہارا بھی تلاش کیا گیا،پھبتیاں بھی کسی گئیں کہ

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا   وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

ادبی معرکے منعقد کئے جاتے تھے۔ایک دوسرے کو پٹخیاں دینے میں جو لطف و انبساط آتا تھا جو شاید لذت وصل محبوب میں بھی نہ آتا ہو جس کے مضامین کی اساس پر شعر و ادب کا تاج محل استوار کیا جاتا ہے۔دوسری جانب شریف اور انجان بن کر چپ چاپ تماشہ ہی دیکھا کئے اور بعض اوقات جب بات حد سے آگے بڑھ جائے تو بیچ بچاؤ،افہام و تفہیم اور پند و نصائح کا فرض منصبی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ذی حس ہو کر بھی عمداً بے حسی اختیار کرنا،جرم کا ارتکاب کر کے معصومیت کا لبادہ اوڑھنا بھی اسی تجاہل عارفانہ کا سلسلہ ہے جو اب بھی کسی نہ کسی صورت میں فی زمانہ بھی موجود ہے اور برابر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجازؔ اور فراقؔ میں یہی چشمک کا فرما رہی۔طنز و ظرافت بھی برتا جاتا تھا اور گفتگو میں اسلوب بھی آبدار ہتھیار کی طرح تیز وضع کیا جاتا رہا ہے۔رفتہ رفتہ اسی شعرا کی چشمک نے دیار ادب میں بستی بستی قریہ قریہ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔شہر عزیز میں بھی فن شاعری کی خدمت کا رجحان تقریباً ڈیڑھ سو سال سے مسلسل جاری ہے۔مختلف تحریکات ادب سے

متاثر شعرا و ادبا اپنے اپنے دبستانوں کی آبیاری میں مصروف کار ہیں۔بعض کے نزدیک شاعری کی قدیم اسلوب ہی سب سے توانا انداز سخن ہے۔نئے رجحانات ادب میں بدعت کے مصداق ہیں۔ایک طبقہ ترقی پسند تحریک کے رجحانات اور میلانات کا امین ہے تو دوسرا جدیدیت کا حامی اور تیسرا ادب اسلامی اور تعمیری ادب پر زور دیتا ہے یک رنگی میں ہمہ رنگی کے وصف کے باوجود ایک دھیمی لے میں اختلافات باہم پکتے رہتے ہیں۔نظریات اور فلسفوں کی دقیق بحثیں بھی چھڑتے رہیں۔طنز آمیز مذاکرات و مباحث بھی چائے خانوں یا اخباری کالموں تک محدود رہتے تھے۔جس سے نہ صرف اہل قلم و اہل سخن بلکہ باذوق سامعین بھی محظوظ ہوتے تھے۔

اس دھیمی لے میں تیز ترین دھماکے اس وقت شروع ہوئے جب جدیدیت کے علمبردار ایک استاد شاعر نے اپنے مجموعۂ کلام کا عنوان ''اجل در دیدہ آئینہ'' تجویز کیا جو دیگر طبقات کے گلے سے نہیں اترا جن کو اترا ان کو شومئی قسمت سے ہضم نہیں ہوسکا۔چنانچہ اس ادبی بدہضمی نے سارے شہر کی ادبی فضا کو مسموم و متنازعہ کر دیا۔ایک ادبی معرکہ برپا سا ہو گیا۔دونوں فریقین باہم برسر پیکار ہوتے تھے۔علمی مباحث طول پکڑتے یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے اب ذاتی بغض اور عناد کی تسکین کا ساماں بن گیا۔باہم بددعاؤں کا آسیب اور مغلظات کا طوفان بدتمیزی سارے شہر کو اپنے آہنی دہانوں میں دنگل لیتا تھا۔سارا شہر دو کیا کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا ہر طبقہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ الاپنے میں پیش پیش تھا۔

اخبارات کے صفحات اعتراضات اور ان کا رد شائع کرنے کی خاطر تختۂ مشق بنائے گئے۔باون گز کے راون اپنی انا کی پرستش میں ادب کی لنکا کو نذر آتش کرنے میں مصروف رہے۔اصحاب نقد و نظر اپنا اپنا علمی بخار نکالنے میں مگن رہے۔ہر کس و ناکس کا تجسس دیدنی تھا۔نگاہیں اخبارات میں رد و قبول کی تکرار کی منتظر ہوتیں یہ سماں ہر کس و ناکس کو تفریح بہم پہنچاتا

www.urduchannel.in

رہا گویا پرائی ہولی میں سب نے ہاتھ سینک لئے۔لہذا اچھا غالبؔ کی روح سے بصد معذرت

تقریب کچھ تو بہر تنازعات چاہیئے۔

ترقی پسند تحریک کے حامی ایک استاد شاعر اور ان کے حلقۂ ارادت سے وابستہ شعرا نے عنوان کتاب کی فہمائش نیز فارسی زبان و ادب کے درک کی ترویج کی خاطر فارسی دانی کی مفت تربیتی جماعت جاری کر دی کہ عوام الناس فارسی سے روشناس ہوں تو ان کا مطمع نظر صاف طور پر جان لیں۔عوام ہر زمانے میں کھیل تماشہ دیکھنے کی تو شوقین ہوتی ہے۔انہیں کی پزیرائی سے عروج و زوال کی کہانی عبارت ہے لیکن نہ زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کا سرمایہ اتنا ارزاں اور بے مایہ ہے بلکہ ادبی مذاکرات و مباحث ان تمام شعبدہ بازیوں اور تماشوں سے فزوں تر ہیں دانشورانہ حیثیت کے متحمل ہوتے ہیں۔

دانشوران عہد حاضر کو کروٹ بدلنے اور برہنہ آنکھوں سے ادب کے مقامی، قومی اور عالمی منظر نامے کا جائزہ لینے کا وقت آن پہنچا ہے۔دیگر زبانوں کے ادب کی ارتقا، عصری تقاضوں حسیت اور المیات اور شخصی شکست و ریخت پر نظر رکھنا ہوگی۔ان فرائض منصبی سے قطع نظر ادبا و شعرا ذاتی انا کی تسکین اور شخصی آرا کی اہمیت سے بالاتر اجمالی طور پر ادبی معیار کی بلندی، تخلیقیت، تنقید اور دیگر زبان و ادب کی بہ نسبت اردو معاشرے میں اپنے مقام کا تعین اور مستقبل کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔خود ساختہ ادبی سجادہ نشینوں نیز خوش فہمی کی چادر تان کر سونے والوں کو اب تو خواب خرگوش کی غفلت سے باز آنے کی ضرورت ہے۔وبقول احمد فراز

ہم بے راہ رہوں کا کیا ساتھ کسی کے ہولیں گے

ہم تو وہ صوفی منش، بیزار دہر اور بے نیاز مادیت ہیں جن کی بابت فیض احمد فیض نے کہا تھا

صحراہ پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر — اب شہر بدر ہوکر دیوانہ کدھر جائے

بستی، جنگل، صحرا، سمندر، قصر سلطانی ہو یا پہاڑوں کی چٹانوں پر ہر جگہ ادب کی خانقاہیں سجا کر اپنے ذوق کا مداوا تو کر لیں گے جہاں نہ شاہ کی سلطنت ہوگی، نہ اساتذہ کی تلمیذی، نہ تحریکات کے مباحث نہ تنقیدی و نظریاتی اور فارمولوں کے پیچیدہ مسائل، نہ شعرا کی باہمی چشمک نہ کردار کشی کی مذموم کوشش۔ بس ہم خالصتاً انسان رہیں اپنی جبلتوں کی مکمل آزادی کے ساتھ اور ذوق لطیف کی تسکین کا سامان ایسے ہی خواب آور ماحول غالب کی بھی طلب رہی۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم نفس کوئی نہ ہو ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ کوئی نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

www.urduchannel.in

۶۰۔ اشعار کی زمین پر

جغرافیائی تناظر میں زمین نظام شمسی کا تیسرا اہم رکن ہے جسے قدرت نے نسل آدم کے سکونت کے لئے منتخب کیا۔ اس لحاظ سے ہم اسے مملکت خداداد کہہ سکتے ہیں۔ کسانوں کے لئے زمین کارزار عمل ہے، کوئی زمین کو ماں کہہ کر تقدس و احترام سے پکارتا ہے، زمین کی فطرت میں نمو اور تخلیقیت کا مادہ موجود ہے۔ زمین سے پیداوار ہے، زمین سے اپج ہے زمین سے زمینداری ہے، زمین خود زرمبادلہ اور زمین تاریخ کے رازہائے سربستہ کی امین اور زمین کے سینے میں خزائن الارض کے راز پوشیدہ ہیں۔ زمین تین خطرناک عناصر زر، زمین اور زن کا بھی رکن ہے جس کی بدولت اس پر فسادات و تنازعے برپا ہوتے ہیں۔ انسان کی موت کے بعد تدفین کا آخری مقام جائے پناہ بھی زمیں ہی ہے۔

زمیں دریافت کرنے کا تجربہ یا تو واسکوڈی گاما کو تھا یا امریگو ویسپوسی کو تھا ان بحر نوردوں نے سر سے کفن باندھا اور سر میں سمائے زمیں کی دریافت کے سودے کی تقلید میں روانہ ہو گئے بلکہ زمیں آسمان ایک کر ڈالا۔ انہوں نے نہ جانے کتنے طویل اور دور افتادہ بحری سفر طے کرنے کے بعد زمیں کے گم گشتہ حصوں کو دریافت کیا۔ فن شاعری میں بھی زمیں نکالنا منہ کا کھیل نہیں ہے۔ اساتذہ شعرا کو دانتوں تلے پسینہ آجاتا ہے۔ شعرا حضرات عموماً اہل دانش و بینش قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان کی وضع کردہ زمیں حقیقی زمیں سے مختلف اور قابل تبادلہ و مشق ہوتی ہیں۔ اساتذہ شعرا کا زمیں نکال لینا کچھ ایسا آسان عمل بھی نہیں ہے کہ کوئی نومشق شاعر یا راہ چلتا مسافر بھی یہ کام کر لے۔ وہ صرف و نحو کے بحور میں غوطہ زن ہوتے ہیں، صنائع و بدائع کی موجوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ گنجینۂ معنی کا طلسم و تہ دار مفاہیم اور گہرائی و گیرائی فلسفے و نظریات، شوکت

الفاظ کی رعنائی کی انجانی منزلوں سے گزرکر تقطیع واوزان کی کے گرداب سے گذرکر صدف شاعری سے نئی زمیں کا گہر تلاش کرلیتے ہیں اس طرح تخلیق کے کرب سے گذرکروہ نئی زمیں وضع کرتے ہیں۔

لہذاان کی غزل کی زمین درج بالا حقیقی زمین سے جداگانہ شان کی حامل ہے۔اس غزل کی زمیں پراشعار کی فصل لہلہاتی رہتی ہے۔شعرا بالخصوص اساتذہ شعرا غزل کی زمیں میں بڑی محنت و جانفشانی وخون جگر سے شعروسخن کے گلزار کھلاتے ہیں۔ازراہ سخاوت اساتذہ شعرا زمینیں وضع کرتے ہیں اوران کے تلمیذان گرامی ان زمینوں کو تختۂ مشق بنا کران پر طبع آزمائی کر کے تربیت حاصل کرتے ہیں۔یہی ایک تبادلۂ زمیں ہے جو بلا معاوضہ و بلا اجازت ازراہ محبت و احترام بھی روااور جائز ہے۔زمین مستعار لینے پرصاحب زمیں شاعرا گر باظرف ہواتواس کا سینہ بصد تفاخر گز بھر پھول جاتا ہے کہ اب ان کی زمین پر سرقہ وقبضہ کر کے دیگر شعرا دواوین کے قصر تعمیر کرتے رہیں گے مرصع اشعار سنانے پر وہ سامعین کو سردھننے پر مجبور کردیتا ہے۔شاعر کے پھیلنے کے لئے عرض کم پڑ جاتا ہے شعرا اسے فرض منصبی جان کے اس انداز میں اشعار عرض کرتے ہیں کہ سامعین کو اونچا سننے کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔طباع شاعرا گر تنگ نظر ہوا تو بھی ترچھی نظر سے سامعین اور خوش الحان شاعر کو دیکھتا ہے کہ مال مسروقہ پر کس طرح داد وصول کی جارہی ہے؟ ایسے شعرا کے لئے زمیں نکالنا (اساتذہ کی زمینوں میں ردوبدل کرنا) گویا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جس میں فیل ہونے کا امکان بھی کم ہے مگر اساتذہ شعرا کے کلام سے میل کھانے کے اندیشے کو مسترد کرنا خاصہ مشکل امر ہے۔

ایک زمیں پر بیک وقت بیشتر شعرا پورے زوروشور سے طبع آزمائی کرتے ہیں۔بلآخروہ زمینیں بھی انہیں اساتذہ کے نام سے منسوب ہوجاتی ہیں جیسے میرؔ کی زمین، غالبؔ کی زمین، ذوقؔ کی زمین داغؔ کی زمین جوشؔ کی زمین وغیرہ وغیرہ۔اس وجہ تسمیہ کے طفیل استاد شاعر بھلے زمیں سے اٹھ جائیں لیکن ان کا نام تو زمیں پر غزل کی زمیں کے حوالے سے زندہ و پائندہ رہتا ہے ورنہ انسان اپنے تیسرے چوتھے سلسلۂ اباواجداد کے بعد سب کو بھول جاتا ہے۔اس زمیں میں خاطر خواہ جدت پیدا کر کے شعرا ان کی زمین ہتھیا لینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ تفنن طبع کی خاطر شعرا اپنے اساتذہ کی مستعمل زمین میں ردیف وقوافی کی ردوبدل کرنے کی جسارت ضرور کرتے ہیں۔اساتذہ کی زمیں میں کچھ جدت پیدا کر کے زمین کا اپنا کہہ کر کلام سنانے کی کوشش سے باز نہیں آتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ٹکسال سے نئے سکے نئے نقوش میں ڈھل کر کھنکھناتے ہوئے سیدھے زمیں پر آرہے ہوں۔لہذا خود اپنی ہی تعریف میں رطب اللسان ہونا ہی شعرا کا دائمی وطیرہ اور رفتہ رفتہ مقصد حیات بن جاتا ہے۔بہ نفس نفیس ہوں تو ایک دوسرے کی تعریف میں زمیں آسمان کے قلابے ملانا ان کا وصف خاص ہے۔لیکن دل میں تمنا ہوتی ہے کہ وہ زمیں بوسحتی کہ زمیں دوز ہوجائیں۔

شعرا اپنی زمینوں کی مقبولیت میں اضافے کے لئے مصرعہ طرح دے کر اپنی زمین پر دیگر شعرا سے طبع آزمائی کی دعوت بھی دیتے ہیں۔اگرچہ غزل کی زمیں تنگ ہو تو شعرا دوسروں کا عرصۂ حیات تنگ کرنے سے باز نہیں آتے۔بعض اوقات صورتحال یہ ہوجاتی ہے پوچھے زمیں کی تو کہے آسماں کی۔عام شعرا سنگلاخ وتنگ زمیں کی شکایت کرتے ہیں، زمیں سخت اور آسماں دور کے شاکی بھی میسر آجاتے ہیں، کچھ کو زمیں سست اور پست ہونے کا گلہ بھی ہوتا ہے۔عام خیال یہی ہے کہ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔شعرا کو اپنی فنکاری کے جوہر آبدار آزمانے کی بجائے زمیں سست اور زمیں کے سنگلاخ ہونے کا عذر لنگ پیش کرتے ہیں رائج ہے کہ زمیں شور سنبل بر نیارد یعنی کھاروالی زمیں میں سنبل نہیں اگتا۔جو کہنہ مشق قابل شعرا ہیں وہ سست اور

www.urduchannel.in

سنگلاخ زمینوں میں بھی اپنی تخلیقیت کے کشت وزار کھلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اپنے اس عمل پر دادطلب انداز میں اپنا کلام سنا سنا کر داد کی دولت سمیٹ کر ایک گونہ اطمینان حاصل کرتے ہیں۔اگر چہ اس داد کی حصولیابی کے لئے کیسی ہی روحانی صعوبت ومعاشرتی ذلت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔

شگفتہ زمیں میں ہر دو اقسام کے شعرا کے لئے طبع آزمائی نسبتاً آسان ہے لیکن اشعار میں معنویت کی خوشبو،تہہ داری کا لطف،فلسفے کی چاشنی اور گہرائی وگیرائی کی حلاوت اور صنائع و بدائع کا ذائقہ اور تراکیب کے جوہر پیدا کرنا اتنا ہی مشکل امر ہے۔مشروط ہے کہ کلام کارواں دواں ہونا بھی ضروری ہے۔بہر حال زمیں سست ہو یا پست،سخت ہو یا سنگلاخ،زمیں شور ہو یا ذرخیز،زمیں تنگ ہو یا شگفتہ شعرا ہر شکل میں عقل لگا کر طبع ازمائی کی کوشش ضرور کرتے ہیں

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

www.urduchannel.in

۶۱۔ہل من مزید

انسان کو زندگی کے لئے جس قدر عمل تنفس ضروری ہے اس سے اشد وضروری لازمہ شعرا کے لئے داد و پذیرائی ہوتا ہے۔ان فنکاروں کے لئے یہ فیصلہ کرنا بعض وقت مشکل ہو جاتا ہے کہ ادب برائے زندگی ہے یا زندگی برائے ادب۔وہ اپنی خوبیوں اور محاسن کے آگے دوسروں کے کلام کو ہمیشہ ہیچ اور کمتر جانتے ہیں''ایسا بھی کوئی ہے،کہ ہم اچھا کہیں جسے؟''انہیں اپنا کلام بالکل اسی طرح معلوم ہوتا ہے جیسے ماں کو اپنا کانا بیٹا بھی دوسرے کے خوبصورت بیٹے سے زیادہ عزیز معلوم ہوتا ہے۔داد کا پیمانہ بھی خواہشات کے پیمانے کے مترادف ہوتا ہے جو کبھی بھرتا نہیں جس قدر داد و پذیرائی ملتی جاتی ہے اس کے حصول کی خواہش بصورت ہوس بھی جوں جوں بڑھتی جاتی ہے۔گویا''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے''سے سوا اور داد کی اشتہا کا جنون اضافی ہوتا جاتا ہے۔ایک مرحلہ یوں بھی آتا ہے کہ جب نہ غذا ضروری ہوتی ہے نہ دوا لازمی۔اگر چہ پذیرائی اور داد کی طلب انسان کو شاعر نما یا متشاعر اور اچھے بھلے انسان کو شاعر بنا دیتی ہے۔پھر وہ داد دینے والے سامعین کی جستجو میں بستی بستی قریہ قریہ کا مسافر ہو جاتا ہے۔رفتہ رفتہ داد کی وصولیابی کے لیے گردش مدام کا عادی ہو جاتا ہے حتی کہ تا حیات داد و پذیرائی ملنے کے بعد بھی ان میں ہل من مزید کا احساس پیہم جوان و تازہ رہتا ہے۔شعرا تمام حیات یہی ماتم اور سینہ کوبی کرتے ہیں اور کرتے ہوئے بلآخر مر جاتے ہیں کہ ان کے فن وریاضت کو مطلوبہ پذیرائی،مقام اور وقعت نہ مل سکی۔ان کی تخلیقات پر جس قدر فن شناسی،تحقیق جوئی،ان کی فن،شخصیت اور خدمات پر مفصل تحقیقی مقالہ نگاری اور تجزیہ وتحسین نگاری ہونی چاہیئے تھی اسے اتنے ہی تجاہل عارفانہ کا سامنا رہا ہے۔کل ملا کر جس داد و پذیرائی کے وہ مظلوم سزاوار رہے ہیں انہیں تا حیات نصیب نہیں ہو

تی۔لہذا اسی خیال نے چچا غالب کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ

جو چاہیئے، نہیں وہ مری، قدر و منزلت　　میں یوسفؑ بقیمت اول خریدہ ہوں

شعرا کی پذیرائی کرنے والی انجمنوں کو یہ خطرہ دائماً لاحق ہوتا ہے کہ بھلا جیتے جی کسی شاعر کی پذیرائی کا کیا اعتبار؟ اگر چہ موصوف نے بقید حیات رہتے ہوئے کوئی نیا گل کھلا دیا یا کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیا تو اس اعزاز کا کیا بنے گا؟ اگر صاحب اعزاز شاعر سے کوئی فاش غلطی، بشری سہو، لغزش پا، یا اسی قبیل کی کوئی خطا سرزد ہو جائے جو ان کی شبیہ کو داغدار کر دے تو بھلا مفت میں تقریب کا خرچ جیب پر آن پڑتا ہے۔اسی خیال کو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ''کرگس جہاں اور شاہیں کا جہاں اور''۔ لہذا ان بیچاروں کو عوامی حزیمت اور لعن طعن کی خفت بھی اٹھانی پڑتی ہے اور رہے سہے ادب نواز بھی ان پر عدم مردم شناسی وغلط انتخاب کے ضمن میں طنز کے تیر برسانا اپنا فرض عین جانتے ہیں بلکہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے موقعے کا لطف اٹھا لیتے ہیں۔کچھ ایسی ہی تلخ تجربات چچا غالب کے ساتھ بھی پیش آگئے تھے لہذا بزبان خود وہ فرماتے ہیں۔

ڈھول ڈھپا، اس سراپا ناز کا، شیوہ نہ تھا　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

بعض خوش قسمت فنکاروں کو جیتے جی یا تو عوامی لحاظ یا شرم کے مارے کہہ لیں یا از راہ دوستی بھی کبھی پذیرائی و داد رسانی کا کوئی موقع ہاتھ آجاتا ہے یا بلفظ دیگر موقع نکال لینا پڑتا ہے۔ جس کی ایک صورت یہ ہے کہ اعتراف ادبی خدمات کی ٹرافی یا مختلف النوع ایوارڈ انہیں تفویض کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔جسے وہ رات دن اپنے ڈرائینگ روم میں سجا کر ''بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے'' کی حالت میں تشریف رکھتے ہوں اور گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے'' کی کسوٹی پر تکتے ہوں اور اپنے ذوق سلیم کی تسکین کرتے ہوں۔جس کی دوسری صورت یہ ہے ایک ہاتھ دے تو دوسرے ہاتھ لے یعنی من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو، اس منصوبے

www.urduchannel.in

پر عمل پیرا ہو کر بھی پذیرائی ہاتھ آجاتی ہے تو سودا قطعاً کسی قدر برا نہیں ہے۔اس فعل کے پس پشت فراخ دلی کا مظاہرہ اور وسیع الظرفی کی مثال بھی قائم ہو جاتی ہے اور اسی بہانے ایسے ہی مواقع پر مدمقابل بھی احسان کا بدلہ احسان سے دے کر بہترین روایت کو زندہ رکھتے ہیں۔جس سے دونوں فریقین کے درمیان یہ احسن پہلو یہ ضرور نکل آتا ہے اسی خاموش عہد کے طفیل محفل میں شعر و شعرا اچھے بھی سماعت کر لئے جاتے ہیں، اور فریقین ایک دوسرے کے خون میں سیر دو سیر کا اضافہ تو کر ہی دیتے ہیں۔اس تبادلہ داد و تحسین کے بعد بھی ایک دوسرے سے باہم نیاز مندی کا یہ عالم ہوتا ہے۔بقول چچا غالب

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

یوں بھی ہماری گنگا جمنی تہذیب و تمدن میں مردہ پرستی کی عظیم و قدیم روایت کے مقابل زندہ فنکاروں کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی، چونکہ ان کی ادبی و شعری خدمات کا سلسلہ دراز اور شاید نامکمل ہوتا ہے۔ یہ خدشہ بھی لاحق ہوتا ہے کہ جیتے جی شعرائے حساس و نازک طبع، افتاد زمانہ سے گھبرا کر کہیں ''کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے'' اس مصرعے پر عمل پیرا نہ ہو جائیں۔لہذا اصل جوہر تو ان کے اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد ہی اجاگر ہوتے ہیں تاکہ احباب از راہ خراج عقیدت، تعزیتی نشستوں میں فن، شخصیت و خدمات کی روداد پر اپنی خداداد صلاحیتوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر خوب داد حاصل کر سکیں، ان کے لواحقین سے ہمدردی اور اعزاداری کی رسم ادا کر سکیں، دو منٹ خاموش رہ کر ان کا اعزاز کر سکیں چونکہ بے چارے حضرت مرحوم اپنے جیتے جی داد وصول کرنے کی ذمہ داری کا بار دوش ناتواں پر، تن تنہا خود ہی اٹھا لینا بہت پسند فرماتے تھے اور اس کار عظیم کے لئے وہ کسی اور کا احسان اٹھانا پسند نہیں فرماتے تھے محض اس معاملے میں بلا کے خود دار واقع ہوئے تھے۔اگر چہ قسمت نے وفا نہ کی زندگی میں تو کسی نے انہیں درخور اعتنا نہ جانا لیکن

مرتے ہی وہ فن شاعری کے نسخۂ کیمیا ہو گئے۔

زندگی میں، تو وہ، محفل سے اٹھا دیتے تھے　　دیکھوں، اب مر گئے، پہ کون اٹھاتا ہے ہمیں

البتہ شعرا کی مقبولیت کی اصل کسوٹی یا معیار کا پتہ تو پس مرگ ہی چلتا ہے۔ چنانچہ جب اہل قلم کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اب موصوف کے کلام بلاغت نظام کی مشاعروں میں ترسیل، تخلیقی، تالیفی، عطائی اور مستعار ادبی فن پاروں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے موقوف ہو چکا ہے۔ سامعین درج بالا تقریبات میں بیان کردہ سوز کے گہرے صدمے میں ڈوب کر یہ گوہر ادراک ضرور پا لیتے ہے کہ موصوف نے ادب میں کتنا بڑا ناقابل تلافی نقصان پیدا کیا ہے یا موصوف کے دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد کس قدر ناقابل تلافی خلا پیدا ہو گیا ہے اور بادی النظر میں جسے پر کرنے کتنے ہی نو خیز ستارے اپنی آب و تاب دکھانے کو بے تاب و مضطرب ہیں، کتنی محفلیں سونی ہو گئیں، کتنے دبستاں ویران ہوئے، کتنے تلمیذان گرامی نے یتیمی اور بعض نے گدی نشینی (جانشینی) کے جذبات کا احساس کیا اور کن نئے فنکاروں کا راستہ صاف ہوا ہے اور افق ادب پر مزید چمکنے اور چمکانے کے مواقع ہاتھ آئے ہیں، جو بڑی مدت سے موصوف کو دائمی الوداع کہنے نیز ان کے جنازے کو کاندھا دینے کے ملی فرائض ادا کرنے کو بے قرار اور ان کی نعش کو تین تین مٹھی مٹی (برائے آخری نذرانہ) دینے کے خواہاں اور منتظر تھے۔ چچا غالب کی دوررس نگاہوں کو اس خطرے کا شدید اندیشہ ضرور رہا ہوگا۔ لہذا انہوں نے بڑی خوبصورتی سے سہی مگر اعترافاً یہ کہہ دیا کہ

ہوئے مر کے ہم جو رسوا کیوں ہوئے نہ غرق دریا　　نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

www.urduchannel.in

۶۲۔ لکیر کا فقیر

لکیریں کیا ہیں نقاط کا مجموعہ ہیں۔ عین انسانی فطرت کی طرح یہ لکیریں سیدھی، ٹیڑھی میڑھی، آڑی، کھڑی، ترچھی، موٹی و باریک بھی ہوتی ہیں۔ مذکورہ لکیروں کی معنی خیز ہیئتیں انسان کو بہت سے اہم اشارے دے جاتی ہیں اگرچہ سمجھ دار کو اشارہ کافی ہے۔ شمالی ھند کے دریاوں کی پرانی عادت ہے کہ موسم برسات میں خطرے کی لکیر سے اونچے بہتے ہیں اور بقیہ سال کسان بے چارے سطح آب کی زوال پذیر لکیر تلاش کرتے ہیں۔ غربت کی لکیر سے نیچے کے افراد حکومت کے منظور نظر ہوتے ہیں جن کی خیر خواہی میں از راہ انسانیت و فلاح و بہبود نئی نئی پالیسیاں اور اسکیمیں وضع کی جاتی ہیں اور فائدے آپس میں باہمی افہام و تفہیم سے تقسیم کر لئے جاتے ہیں سانپ بھی مر گیا لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ غربت کی لکیر سے بالاتر افراد بھی حکومت کے پسندیدہ افراد ہیں جو اپنی گاڑھی کمائی کا بیشتر حصہ جسے پوشیدہ رکھ پانا ممکن نہ تھا بطور تاوان وہ بڑی ایمانداری سے داخل خزانہ کرنے پر رضا مند ہو جاتے ہیں۔ حکومت وقت اسے مختلف مد میں ٹیکس کی بالائی کشید کر کے اول الذکر طبقے کی ضروریات مکمل کی جاتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یعنی حکومتوں کو رابن ہڈ کا کردار بہت راس آیا ہے۔

یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ لکیریں انسان کے جملۂ شعبۂ حیات میں نظم و ضبط کی حد بندیاں طے کرتی ہیں ورنہ انسان کو قدرت نے آزاد ہی پیدا کیا تھا۔ لکیریں نہایت احتیاطی تدابیر کا علامیہ ہیں جس نے ان سے صرف نظر کیا وہ حادثات و مشکلات کا شکار بھی ہو سکتا ہے پھر بھی یہ سلسلہ دوام ہے بلکہ وہیں حادثات رونما ہوتے ہیں عین وہیں جہاں اس قسم کی تنبیہاتی تختیاں آویزاں ہوتی ہیں۔ علم ھندسہ کی بنیاد ہی لکیروں کے کھیل پر منحصر ہے جہاں لکیروں ہی سے مختلف اشکال ترتیب

دی جاتی ہیں لیکن یہ علم بڑا معتبر قرار دیا جاتا ہے۔اسے ہر چار و نا چار بندے بشر کو سیکھنا پڑتا ہے۔بہر حال یہ علم لکیر کا فقیر کہلانے کا مجاز نہیں ہے۔انسان اپنے نفس عمارہ کے بعد سب سے زیادہ لکیروں کا پابند ہوتا ہے اگر لکیروں کی پابندی نہیں کرے گا تو پولس کا مہمان بھی ہوسکتا ہے اور سفر آخرت کا مسافر بھی۔لکیروں کی اپنی زبان ہے۔لکیروں کے مفاہیم بھی بڑے معنی خیز اور مشاہدے کی چیز ہوتے ہیں۔محبوب کے کاجل کی لکیر حسن معشوق میں اضافے کا سبب ہے۔مانگ میں سیندور کی لکیر سہاگ کی سلامتی کی علامت ہے۔رخسار کی لکیریں ڈھلتی عمر کی غمازی کرتی ہیں۔چہرے کی لکیریں تفکر و تشویش کی ترجمان ہیں۔ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر کا نقشہ قید ہوتا ہے۔عاشق حضرات اس میں بھی اپنے مطلب کا نشاستہ کشید کرنے کا موقع نہیں چھوڑتے کہ

تو کہیں بھی رہے سر پر تیرے الزام تو ہے
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں تیرا نام تو ہے

بات کے استحکام اور پختگی کے لئے پتھر کی لکیر کا استعارہ دیا جاتا ہے کہ یہی اٹل حقیقتوں کی زندہ مثال ہے۔بے کار و بے مصرف کام کرنے والے کو پانی پر لکیر کھینچنے کا طنز کیا جاتا ہے۔دنیا کے نقشے پر عارضی و فرضی لکیروں سے موسم کا تعین بھی ممکن ہے مثلاً خط استوا، خط سرطان، خط جدی اور خط نصف النہار ایسی ہی فرضی لکیریں ہیں جن سے عالمی معیاری وقت کا تعین اور موسموں کے تغیرات کا نظام بھی طے کیا جاتا ہے۔

لکیروں سے ملک کی سرحدوں کی تقسیم (لائن آف کنٹرول) عمل میں آتی ہے۔لکیر کی تقسیم کے شاخسانے کے طور پر دو قومی نظریئے، قومیت کی شناخت، علاقائیت کی فوقیت و برتری، نسلی و لسانی تفاخر کا احساس بھی جنم لیتا ہے۔لکیروں سے مذاہب کی نشاندہی ہوتی ہے۔عیسائیوں کے ہاں تثلیث یعنی صلیب کے اظہار کی علامت انہی لکیروں کی دست نگر ہیں۔سواستک بھی نازی تحریک کی علامت اور ہنود کا مقدس نشان ہے جو لکیروں کی تراکیب سے ہی عمل میں آتا ہے۔کسی

www.urduchannel.in

تحریر کی نیچے لکیر کھینچ دینے سے وہ توجہ کی طالب اور اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔مونچھوں کی اہمیت کے بارے میں بھی یہی کلیہ بطور مزاح پیش کیا گیا کہ ناک کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ناک کے نیچے لکیر کھینچ کر (انڈر لائن کر کے) اسے اعزاز بخشا گیا۔جو انسان قدیم ترین روایات رسوم و قیود کا پابند رہے اسے بھی دقیانوسی یا لکیر کا فقیر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔

انسان کتنا ہی اشرف المخلوقات اور آزاد منش کیوں نہ ہو؟ انسان کو ہر زمانے میں لکیر کا اسیر بلکہ لکیر کا فقیر بننا پڑتا ہے۔ورنہ قسمت کی لکیریں بغاوت پر اتر آتی ہیں۔عوام الناس کے ماتھے پر اعتراض کی لکیر ابھر آتی ہیں اور بطور انجام انسان کو اپنی حکمت عملی پر کف افسوس ملنا پڑتا ہے۔سانپ تو گزر جاتا ہے اور وہ بیچارہ لکیر پیٹتا رہ جاتا ہے۔شاعر نے کیا خوب فرمایا کہ

خیال زلف میں ہر دم نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

ہاتھوں کی لکیروں کے چکر صرف کاتب تقدیر کے علم میں ہے۔بقول ابن انشا تقدیر کی لکیر فرشتے بڑی پکی سیاہی سے کھینچتے ہیں۔یہ مستقیم بھی ہوسکتی ہیں اور منحنی بھی لیکن اس کا مٹانا ناممکن ہے۔پھر بھی دست شناس حضرات انسان کی نفسیاتی کمزوریوں، آسیب کا خوف اور نہ جانے کیا کیا شعبدہ بازی کر کے ان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یونہی شکم پروری کی خاطر ہتھیلی کی لکیروں کے جال میں الجھ کر خلانوردیوں میں مصروف رہتے ہیں اور اندازی تکے لگا کر دوسروں کی جیب بھی ہلکی کرتے ہیں اور ان کو مفروضہ خطرے کا خوف دلا کر اپنا الو سیدھا کر لیتے ہیں۔تعویز نویس حضرات بھی ہاتھوں کی لکیروں سے کھیلتے ہیں۔اور بسا اوقات تعویزات پر آڑی ترچھی لکیروں کے امتزاج سے عجیب و غریب نقوش تیار کرتے ہیں اور حاجت مندوں کو احمق بنا کر اپنے پیٹ کا جہنم بھرتے ہیں۔جبکہ اصل نسخہ کیمیا یہی ہے کہ

ایک جال بچھا رکھا ہے لکیروں نے ہتھیلی پہ مری
بات تو جب ہے کہ کام کی کوئی ایک لکیر تو ہو

لکیروں کی بھی اپنی بھانت بھانت کی اقسام ہیں۔ایک مذہب وملت کی سرحد کی لکیر ہے جس کے حدود میں رہ کر اپنی تمام کوششوں کو سرانجام دینا ہوتا ہے ورنہ اس لکیر سے باہر کا راستہ دکھانے پر ساری قوم متحد ومتفق ہوجاتی ہے ہر چند ان میں باہم تنازعات واختلافات ہی کیوں نہ ہوں۔ایک لکیر معاشرہ،تہذیب وتمدن کی ہوتی ہے جس کے اندر رہ کر ہی مہذب،شائستہ اور معاشرت پسند جیسے القابات کا حصول ممکن ہے ایک رشتے ناطوں کی لکیر ہے جسے اختیارات اور فرائض کی لکشمن ریکھا (لکیر) بھی کہا جاسکتا ہے۔ایک لکیر دو بھائیوں، دو دوستوں دو مذہبوں دو معاشروں دو زبانوں دو ملکوں اور دو مذاہب کو جدا بھی کر دیتی ہے۔

www.urduchannel.in

۶۳۔ذوق کے بغیر بے کیف ہے حیات

شہر فرخندہ آباد حیدرآباد کے ہمارے عزیز دوست عصیم خان صاحب تھے جو بڑے حساس طبع، بذلہ سنج، مردم شناس، سخن شناس اور ذوق لطیف کے مالک تھے۔عصیم صاحب بلا کے باتونی، محفل پرور، ادب نواز اور گل گلزار شخصیت کے مالک بھی تھے۔بات بات پر شعر کہنا، بات سے بات پیدا کرنا اور باتوں باتوں میں کام کی بات کہہ جانا ان کا خاصہ ٹھہرا۔اکثر وبیشتر اپنی گفتگو کے دوران اگر کسی صحبت ناجنس یعنی بدذوق سے واسطہ پڑ جاتا یا جب کوئی ان کی سطح سخن کو سمجھنے سے قاصر ہوتا تو اس پر مذاقاً دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا کر ایک مخصوص فقرہ بڑی پابندی سے دعائیہ انداز میں چست کیا کرتے تھے۔"یااللہ! اگر انسان پیدا ہی کرنا ہے تو انسان کو اندھا بنا، کانا بنا، لنگڑا بنا، لولا بنا، کالا بنا، گورا بنا، لاغر بنا، توانا بنا، پاگل بنا یا کوڑھی بنا مگر بدذوق نہ بنا جسے انسان کی اچھی بات بھی سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو۔" یہاں اس نازک موقعہ بددعا پر ان سے ترکی بہ ترکی اتفاق کرنے کی بجائے ہر خاص وعام دعا پر باآواز بلند آمین کہنے کے۔ہم نے بصد احتیاط سرگوشی میں سر جھکا کر "نعوذ باللہ۔ثم نعوذ باللہ" کہہ کر اپنا دامن بچانے کی معمولی کوشش ضرور کر لیتے ہیں۔البتہ دل کے کسی گوشے میں اسی دبی خواہش کا وجود سر اٹھاتا رہتا ہے چونکہ روز آنہ اس قسم کے افراد (صحبت ناجنس) سے ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے جو کبھی کبھی سوہان روح بھی ثابت ہوتے ہیں۔جن کی شان میں منہ سے نہ سہی دل سے بے اختیار یہ غزل نکل جاتی ہے کہ

کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں
اپنے اپنے غم کے فسانے ہمیں سنانے آجاتے ہیں
ان سے الگ میں رہ نہیں سکتا اس بے درد زمانے میں

میری یہ مجبوری مجھکو یا دلانے آجاتے ہیں

میرے لئے یہ غیر ہیں اور ان کیلئے بے گانہ ہوں میں

پھر بھی ایک رسم وفا ہے جس کو بھانے آجاتے ہیں

سب کی سن کر چپ رہتے ہیں دل کی بات نہیں کہتے ہیں

آتے آتے جینے کے بھی لاکھ بہانے آجاتے ہیں

ایک بد ذوق شخص سارے معاشرے کا ناسور بن جاتا ہے۔اس کی سوچ کا افق محدود اور اس کا تناظر بھی مخصوص اور صوابدید بھی تنگ ہو تو یہ اس کی بشری کمزوری کا حصہ ہے چونکہ وہ مجلسی شخصیت کا حامل نہیں ہوتا تو ظاہر ہے اسے مجلسی آداب و اطوار کا بھی درک نہیں ہوتا وہ تانگے میں جوتے ہوئے عینک بردار گھوڑے کی طرح صرف ناک کی سیدھ میں سبک رفتاری سے چلنے نیز چابک کے اشارے سے دائیں بائیں کا رخ کرتا ہے۔اسے اہم ترین آداب محفل مثلاً اکرام محفل اور باہمی عزت نفس،گفتگو و مباحث کے موضوعات اور ان کے متنوع رخ،ان کے اشارے کنائے اور ان کی گہرائی و گیرائی کی بصیرت جیسے جواہر اوصاف سے بے بہرہ اور عدم شناس ہوتا ہے۔اگر ایسا شخص بطور حادثہ ادبی محفل میں شریک ہو جائے تو پھر وہ ادبی میدان جنگ میں نابینا جنگجو کی طرح طبع آزما ہوتا ہے جیسے بندر ہاتھ تلوار آجاتی ہے جسے وہ بے دریغ نقصان کے اندیشے سے بے خبر چلا رہا ہوتا ہے۔اسے اس بات کا بھی درک و احساس نہیں ہوتا کہ جو بات کی جارہی ہے اس کی نزاکت اور اس کی حساسیت کا کیا پیمانہ ہے۔اس سے کلام کرنا گویا ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے؟ کے مصداق بے نیازی و بے اعتنائی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔اس پر ستم بالائے ستم کہ اسے اپنے اس کارہائے نمایاں پر نہ صرف اپنی بات پر داد و تحسین کی طلب ہوتی ہے بلکہ وہ فاتحانہ انداز میں باذوق شرکائے محفل کو نیازمندانہ نظروں سے دیکھتا ہے۔اس بات سے قطع

www.urduchannel.in

نظر کہ اس کی بات بے بات سے نہ صرف محفل کا تقدس پامال ہوتا ہے بلکہ کتنوں کے دل شکستہ اور خلش جگر کے پار ہو جاتی ہے۔ایسے معصوم اشخاص کے لئے خدائے سخن میر تقی میرؔ نے ارشاد کیا

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو　　　جو تیرے آستاں سے اٹھتا ہے

جن کے ہاں ذوق سلیم کا فقدان ہوتا ہے اسے مظاہر قدرت،فنون لطیفہ،شعر و سخن،فصاحت و بلاغت زبان،حسن و جمال کائنات اور دیگر امور نہ متاثر کرتے ہیں نہ ان کے قدرتی حسن سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہوتا ان کا حال بقول فانی بدایونی کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

جیسے غریب عوام حکومت وقت کے خزانوں سے بے بہرہ ہوتی ہے۔اس کا اپنا تناظر سراسر خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے اسے صرف اپنی بھوک،اپنی جھولی اور اپنی ضروریات اور اپنے گھر آنگن کی فکر کے حصار میں مقید رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے باذوق دانشور حضرات کی تعداد معاشرے میں مٹھی بھر ہی ہوتی ہے۔باذوق اور ذی ہوش حضرات ان کی قدردانی بھی کرتے ہیں،ان کے تجربات، مشاہدات و ارشادات سے نہ صرف حظ اٹھاتے ہیں بلکہ بیشتر فائدے بھی حاصل کرتے ہیں۔البتہ بد ذوقوں کے نزدیک یہی سخن ہائے ادب یادہ گوئی اور فضول گپ بازی سے زیادہ نہیں ہوتی۔جن کے دماغ کو قدرت کی خاص ودیعت معکوس میسر ہوتی ہے ورنہ قدرت کے خزانوں میں نہ کوئی کمی تھی نہ کمی ہو سکتی ہے۔سب کو اپنے مقدر کے مطابق نعمتیں میسر آتی ہیں۔

خدا انسان کو جب بندۂ بشر کی زندگی دے تو باذوق زندگی دے جو اس کی صوابدید کے مطابق تو ہو بلکہ کچھ بڑھ کر اپنے پلے سے دے۔جمالیاتی حس،فن کی سوجھ بوجھ اور کچھ فن شناسی اور فنکاری کی تمیز کا مزاج بھی زندگی میں داخل ہو تو کچھ کیف و انبساط کی گنجائش اور ڈھنگ سے زندگی گذارنے کے امکانات پیدا ہو سکیں ورنہ عرف عام میں مویشیوں کی طرح پیدا ہو جانا اور بلآخر بے

کیف مرجانا سوائے گناہ بے لذت کے کچھ نہیں ۔ یہ نہ تو بعثت انسانیت کی ہی منشاً و مشیعت کا حصہ ہے اور نہ ہی حضرت انسان کا شیوہ رہا ہے بقول علامہ اقبال

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو　　ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اہل ذوق سے کبھی شجر ممنوعہ بھی کھا لینے کی خطا سرزد ہو جاتی ہے اور بندہ گنہہ گار پھر اتنی ہی خلوص دل سے غفور الرحیم کے حضور توبہ بھی کر لیتا ہے ۔ مگر عموماً ذوق سے عاری حضرات کو اہل ذوق کی عادات و اطوار، سطح گفتگو و کلام، دوست احباب، مشاغل و مصروفیات نیز ذوق و شوق ایک آنکھ نہیں بھاتے ۔ وہ ان تمام سرگرمیوں کو تضیع اوقات، فضولیات، مفت کی محنت اور شریعت کی عینک کے پیچھے سے دیکھ کر اسے ممنوع و منافی اعمال کے زمرے میں ڈال کر خود کو بخشی بخشائے تصور کر لیتے ہیں ۔

www.urduchannel.in

۶۴۔ تجاوزات (اتی کرمن) کی تجویز

تجاوزات کا بڑھتا رجحان ہمارے شہر کا سب سے سلگتا اور سنگین مسئلہ ہے جس پر غائرانہ کیا طائرانہ نظر کرم کرنے پر بھی کور چشمی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جس سے بہر حال طوطا چشمی کا فعل کم قابل گرفت ہے ۔ چونکہ قانون کا اطلاق دوسروں پر اور اپنی گردن اس سے آزاد ہو تو اچھا محسوس ہوتا ہے ۔ غیر قانونی تجاوزات کی بدولت گلیوں پر ہمارا شاندار قبضہ ہے جو راہ گیروں کے دل میں ہماری ہیبت کی دھاک بٹھانے نیز ان کے مرعوب ہو کر سرنگوں خاموش گذر جانے کا سبب بھی ہے ۔ غیر قانونی تجاوزات ہماری شناخت کا علامیہ اور انفرادی خواص بھی ہے ۔ ان غیر قانونی تجاوزات کے طفیل ہم اپنی گھریلو معیشت کا نصف حصہ سڑک پر ہی شان بے نیازی کے ساتھ گذارتے ہیں اور مرزا غالب کے اس شعر کے طفیل جواز تقصیر بھی رکھتے ہیں کہ

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں　　بیٹھے ہیں راہ گذر پہ ہم غیر کوئی اٹھائے کیوں

سڑک کی اہمیت اور افادیت کا حق ادا کرنے میں شہر عزیز کی باشعور عوام ید طولی رکھتی ہے ۔ سڑک کے جتنے اضافی و سود مند استعمال ہم جانتے اور کرتے ہیں دیگر اقوام کے خیال میں شاید کبھی نہ گذرتے ہوں ۔ سڑک کو پہلے تو ہمہ اقسام کی سواریوں سے آراستہ و پیراستہ کر دیتے ہیں جس سے ہمارے معیار حیات کے اعلی پیمانے نیز خوش حالی کی عکاسی ہوتی ہے ۔ راہ گیر کو کی طرح پہلے سڑک کے دونوں طرف ایستادہ سواریوں کے پیچ بچتے بچاتے یوں اپنی راہ نکالنی پڑتی ہے ۔ بقول خدائے سخن میر تقی میرؔ کے شعر میں معمولی تحریف و روح میرؔ سے معذرت کے ساتھ

یوں گئے آج اس گلی سے ہم　　جیسے کوئی جہاں سے گذرتا ہے

کہیں سڑک پر ایستادہ مخزن آب یعنی پانی کی ٹینک نصب ہوتے ہیں، کہیں سڑک پر کوئی خاتون

اپنے فرائض منصبی میں مصروف نصف سڑک تک کپڑوں اور برتن کی دھلائی اور ان کو غصے سے دھونے و پیٹنے کے عمل میں غرق نظر آتی ہے، کہیں معصوم بچوں بالوں کو لب گٹر قضائے حاجت کے لئے بٹھا دیا جاتا ہے، کہیں عارضی خواب گاہ (چارپائی) سے واسطہ پڑ جاتا ہے، کہیں سڑک مہمان خانے اور استراحت گاہ کا کردار بھی نبھاتی نظر آجاتی ہیں، کہیں گھر کی نمو اور افزائش کا میزانیہ نہر آلائش (گٹر) کے سر تک کشید کیا ہوتا ہے۔ پھر اس تنگ گلی میں طرۂ امتیاز کہ پالتو مویشی رکھنا ان کی نگہداشت اور خوراک اور فضلات (لید) کو انہی گلیوں میں منتظر فردا چھوڑ دینا بھی تہذیب و تمدن، کا تقاضہ ٹھہرا۔ اس شوق سے برگشتہ ہونا گویا بزرگوں کی روایات سے روگردانی اور بے ادبی کے فعل کے مرتکب ہونے کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا مشکل صورت حال میں نہ پا پیادہ کو راحت ہے، نہ بانک سوار کو سہولت اور خواتین کے آداب راہگیری کے تو کیا کہنے؟ یہ دختران حوا جہاں جاتی ہیں۔ وہاں اپنے ساتھ اپنی ہم جنس خواتین کی نہ صرف عرضی قطارلے کر رواں دواں ہوتی ہیں بلکہ سسرال کی شکایتوں، میکے کی حکایتوں اور لامتناہی دلچسپ موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کر کے پہلے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی ہیں۔ اس کارخیر میں ایسی منہمک، مگن و مصروف کار ہوتی ہیں کہ راستے پر ان کے ماسوا کسی اور بندے بشر کا حق راہگیری بھی ہے ان کے ذہن نازک سے اتر جاتا ہے۔ آزو باز و میں چلنا اپنی آن بان سمجھتی ہیں، مصلحتاً آگے پیچھے چلنا قصر شان سمجھتی ہیں۔ اگر کسی نے ذرا سا بھی مس کر دیا یا کچھ کہہ دیا تو اس بیچارے کی شامت آن پڑتی ہے اور اس قسمت کے مارے کی جان پر بن آتی ہے۔ لہٰذا جب خواتین کا غول در غول سڑکوں پر رواں دواں ہو تو دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح مردوں کو چاہیئے کہ عارضی طور پر ہی سہی سڑک کے جملہ حقوق بھی انہیں کے نام اور اپنی عزت کے صدقے خاموشی سے کنارہ کشی میں عافیت اور غایت درجہ ذہانت ہے۔

www.urduchannel.in

اگر محلے میں کسی کی شادی ہو تو سب سے پہلے راستے کی شامت و بربادی درپیش ہوتی ہے۔ راستے کا سدباب کر کے حق ملکیت کا احسان جتایا جاتا ہے۔ سڑک پر شامیانے طنابیں تان کر، انہیں رنگین برقی قمقموں سے آراستہ کر کے سڑک کے عین درمیاں میں اس خانوادے کی طرف سے پرخلوص دعوت کا ذکر مسرت اور مرد وزن کی تفریق کی بابت بھی معلومات درج ہوتی ہے۔ راستے پر طعام و ولیمہ بھی تناول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کی فوتگی میں بھی راستہ ہی تختۂ مشق بن جاتا ہے۔ روادار راہگیر بیچارہ جواز لی طور پر صلح جو اور معاملہ فہم واقع ہوا ہے مصلحت کے طفیل ایک طویل چکر کاٹ کر اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ کہ سدا خوش رہو ہم دعا کر چلے۔

جہاں زندہ و جاوید اور ہشاش بشاش عوام کی کلفتوں کا یہ عالم ہے تو اس بے چارے مسافر آخرت کے کیا کہنے جس کو چار کے کاندھوں پر آخری سفر درپیش ہو؟ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ جلوس جنازہ میں پہلے چند مخیران کو راستے کے تجاوزات ہٹاو دستے کا کردار نبھانا ہوتا ہے تا کہ جنازے کی راہ کہیں رکنہ نہ رہ جائے اگر چہ جن کا یہ عمل ہے ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی اور خود شخص فرداً کی طرح خاموش تماشائی بن کر اس کوشش ناتمام کا لطف لیتے ہیں۔ کچھ صرف با آواز بلند پکارنے میں ہٹو، بچو، راستہ دو کہہ کر اپنی موجودگی کا احساس کروانے نیز صاحب رائے ہونے کی دھاک جمانے کی ناکام کوشش کرتے نظر آتے ہیں جنہیں گفتار کا غازی اور بظاہر بے جا زود و گو کہنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی ہے۔ میری دانست میں خدا اگر متوفی کو قوت گویائی عطا کر دیتا تو وہ فلک شگاف نعرہ لگا کہ بانگ دہل پکار اٹھتا کہ

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ندی کے پار ہوتا۔

اپنی حد دہلیز سے آگے کس قدر سرکاری جگہ یعنی سڑک پر قبضہ کیا جائے اس معاملے میں

ہم نے تمام تر دینی تعلیمات، اخلاقی اداب و اطوار، ملی فرائض اور حقوق العباد کے تقاضوں کو تہہ کر کے بالائے طاق رکھتے ہوئے 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے' اس مقولے پر عمل پیرا ہونا اہمیت کا حامل سمجھا۔لہٰذا اس نیک اور ایک عمل کی برکت و نعمت کے فوائد کشید کرنے میں ہم ایک دوسرے سے مقابلہ آرا ہیں کہ گلیوں اور راستوں کا عرض اس قدر تیزی سے گھٹ رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آئندہ نسلوں کو اپنی یاد داشتیں سنانی پڑیں گی کہ یہاں پہلے کبھی سڑک، راستے راہ گذر گاہ کا بھی وجود ہوا کرتا تھا۔اس قسم کی نوبت پیش آنے سے قبل ایک حقیر و معمولی تجویز حاضر خدمت ہے کہ ان راستوں کا سد باب کرنے سے بہتر ان کے دونوں سروں پر دروازہ آراستہ کر کے کیوں نہ راہ گزاری کی رقم (ٹول ٹیکس) راہگیروں سے وصول کی جائے تا کہ ان کو اندازہ ہو کہ ہائے وے پر ٹول ٹیکس ادا کرنے کا کیا درد ہوتا ہے؟ اسی بہانے دو چار اہلیان گلی کی روزگار کی سبیل بھی نکل آئے گی اور اس امر سے موصولہ رقم سے گلی کی فلاح و بہبود کے بعد ریوڑیاں بانٹنے کا عمل بھی انجام پزیر ہو جائے تو راستے کا صحیح مصرف بھی نکل آئے گا۔

www.urduchannel.in

۶۵۔لفاظیاں

لفاظیوں کا کوئی موسم نہیں ہوتا ہمہ وقت بھلی اور سہانی معلوم ہوتی ہیں۔لفاظیوں کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے کہ لفاظیاں جتنی بھی سنتے جائیں وہ اتنا لطف اور سرور کا سماں باندھنے میں ید طولی رکھتی ہیں۔لفاظیوں کے حسن اختصار کے آگے طویل کہانیوں اور داستانوں کی دل پذیری بھی ہیچ محسوس ہوتی ہے۔لفاظیاں اس لئے بھلی معلوم ہوتی ہیں کہ قدرت نے انسان کو اپنی ذاتی تعریف اور مدحت سننے کا مشتاق اور اس سے زیادہ مجبور بنا دیا ہے۔جوں جوں لفاظیوں کی روداد سنتے جایئے توں توں لطف آتا جاتا ہے انسان کی باچھیں کھل اٹھتی ہے، چہرہ فرط مسرت سے متبسم ہو جاتا ہے سینے کا قطر بی آہستہ آہستہ پھولنے کی طرف مائل ہوتا ہے دوران خون میں خوشگوار تبدیلی واقع ہوتی ہےبس ایک ہی خطرہ لاحق ہوتا ہے کہیں شادیٔ مرگ نہ واقع ہو جائے۔لفاظوں کو کچھ آئے نہ آئے الفاظ سحر انگیز کے طفیل تعریف کی پل باندھنے اور زمین اور آسمان کے قلابے ملانے پر عبور کامل ہوتا ہے۔غالباً یہی بشری کمزوری لفاظیات کی ایسی متقاضی ہوتی ہیں کہ انسان اس لفاظی کے سحر میں با آسانی زیر دام آجاتا ہے

لو اپنے دام میں صیاد آگیا

لفاظوں کی چرب زبانی، شعلہ بیانی اور شیریں بیانی اور انداز گفتگو کے چربے وحربے اس قدر پرکشش ہوتے ہیں کہ دانا و بینا شخص بھی ان کے خوش گفتار ہونے کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لفاظی گرچہ الفاظ کی فضول خرچی سہی لیکن یہ الفاظ کا ایسا لازوال، اور لا متناہی خزانہ ہے جس کی ٹکسال فطین دماغ ہے جو نیند میں بھی انسان کو چین سے نہیں سونے دیتا۔لفاظیاں راست یہیں سے تخلیق پا کر چہرے پر تاثرات بکھیرتی ہیں اور ان کا اخراج زبان کی نوک سے ہوتا ہے۔جس کا

راست اثر مد مقابل کے دل پر پڑتا محسوس ہوتا ہے۔لفاظی الفاظ وملفوظات کا انوکھا کھیل ہے جس میں محسوس نہیں ہوتا کہ کون حق بیانی کر رہا ہے اور کون لغوگوئی میں مسروف عمل ہے۔لفاظی ذرا مشکل طبع فن ہے جو لفاظوں مزاج کا حصہ بھی ہوسکتا ہے، کچھ تجربات کا نچوڑ بھی اور کچھ قدرتی ودیعت بھی۔بہر حال لفاظی ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے کہیں یوں مضحکہ صورت حال پیش نہ آجائے کہ

کوا چلا ہنس کی چال تو اپنی چال بھی بھول گیا۔

اس سے مزید سبکی اور پشیمانی کی نوبت آن پڑسکتی ہے۔بہر حال لفاظی بڑی فنکاری ہے گویا ہتھیلی پر چاند دکھانا۔صرف لفاظی کے فن، لچھے دار، بااعتماد انداز گفتگو اور ذرا متواضع طرز کلام سے واقفیت اور زبان و لہجے میں کچھ ہمدردی، کچھ نرمی، کچھ حلاوت کے آثار ہوں، انکساری اور مظلومیت کا برملا اظہار ہو تو کسی کے حواس پر چھا جانا بھلا لفاظوں کے لئے کیا مشکل ہوسکتا ہے۔

لفاظیاں دراصل مفت کا لسانی مکھن ہے۔اس مکھن کو دودھ سے نہیں ذہن کے فطین و شاطر ترین گوشے سے نوک زباں تک چشم زدن میں حاضر جوابی کے ساتھ لانا ہی اصل فنکاری ہے جس کے لئے ذہین انسان درکار ہوتے ہیں، بودے انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔یہ وہ مکھن ہے جسے کھایا نہیں لگایا جاتا ہے۔لفاظیوں سے ہر کسی کو بلا تقسیم مذہب وملت تیقن کی سوغات تقسیم کی جاتی ہے جس پر عمل کرنا خود لفاظ کے منصوبے کا حصہ کبھی نہیں ہوتا ہے۔لفاظ بھی عجب قسم کا طبیب ہوتا ہے خوبصورت وجمالیاتی ملفوظات کے مرہم لگا دینا لیکن زخم ہرا رکھنا لفاظ کے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا ہے۔لفاظی سے مستقل درد کی عارضی دوا کی جاتی ہے اور اپنا راستہ صاف کر لیا جاتا ہے۔

انسان اپنے ذکر خیر و بد پر نہ صرف متوجہ، تشویش ناک اور ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے بلکہ

www.urduchannel.in

از خود تعریف وتوصیف کا خواہاں ہوتا ہے۔لفاظیاں جنہیں عرف عام میں اچھا نہیں سمجھا جاتا دراصل بے حد کارآمد اور فائدہ مند عادت ہے۔لفاظیاں کرنا ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو بے حد قلیل عرصے میں گرویدہ، پسندیدہ اور منظور نظر بنا دیتا ہے۔لفاظی کا جادو ان افراد پر خاصہ اثر انداز ہوتا ہے جن کو زمانے سے اپنی ناقدری وناسپاسی کی گلہ بہم ہوتا ہے۔اگرچہ باوجود کوشش بسیار اظہار کی کوئی صورت نہیں میسر آتی لفظوں کی سحر بیانی سے ان کو شیشے میں اتارنا دراصل لفاظی کا فن ہے۔ لفاظیوں کو یوں تو اکثر وبیشتر منفی انداز میں کہا، سمجھا اور یاد کیا جاتا ہے لیکن لفاظیاں کرنے والوں کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور چشم زدن میں وہ لفاظیوں کا مثبت فائدہ اٹھا کر یہ جا وہ جا۔بعد میں احساس ہوتا ہے کہ لفاظیاں کرنے والا سحر الفاظ سے دماغ پر چھا جاتا ہے اور اپنا فائدہ کشید کر کے بھنوروں کی طرح اگلے پھول سے اپنے نشاستے کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے ۔لفاظی کو عموماً جھوٹ اور دغا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ بات حق بجانب ہے کہ جھوٹ کے پاؤں لمبے نہیں ہوتے لہٰذا اس کا جلد یا بدیر پکڑا جانا طے ہے لیکن لفاظی کا قد بہت اونچا اور اس کے زور بیاں کی بدولت بھی معروف ہے۔لفاظی کے شکار بھی وہی حسن پرست اور جمالیات کے دلدادہ ہوتے ہیں جن کو دو بول محبت کے اپنے حق میں درکار ہوتے ہیں۔

لفاظیوں کے تئیں یہ خیال عام ہے کہ لفاظیاں کر کے صرف گمراہ کیا جاسکتا ہے۔لفاظیاں دل کی تسلیوں اور عارضی اطمینان کا باعث بھی ہوتی ہیں۔بظاہر ان لفاظوں کی گفتار وملفوظات اس کی مثال چاردانگ عالم میں ہماری اپنی قوم ہے جس کے ہمہ اقسام کے قائدین نے حق قیادت ادا کرنے کی بجائے عمل اور حکمت عملی کے لفاظیوں کے طفیل ادا کیا ورنہ اس قوم کا نقشہ ہی اور ہوتا۔لہٰذا ان قائدین نے لفظی جمع خرچ اور لفظی میزائل سے ملی، سیاسی، اقتصادی، عائلی معاشرتی مسائل حل کرنے کا تیقن تو بہت شاندار الفاظ میں دے دیا۔جن کا شرمندۂ تعبیر ہونا کوئی مشروط

بات بھی نہیں ہے اور لفاظوں سے کون باز پرس کرسکتا ہے؟ کہتے ہیں جس کی زبان چلے،اس کے ستر ہل چلیں۔

لفاظی کی عظیم الشان تاریخ ہے یہ کوئی آج کل کا شیوہ نہیں ہے زمانہ قدیم سے لفاظوں کا طوطی بولتا ہے۔ بادشاہان وقت نے مدح سرائی کے لئے اعلی زبان و بیاں کے ذہین وفطین اشخاص کی فوج یعنی لفاظوں کی نفری کا انتظام وا ہتمام رکھا۔جن کی مدح سرائی سے لطف اندوز ہو کر بادشاہ پھولے نہ سماتے۔لفاظوں کی قدرومنزلت سے بادشاہ کوعلم ہوجاتا تھا کہ وہ بذات خود کتنی صلاحیتوں کا مالک ہے۔لفاظ ہی اسے ریاستوں پرحملہ کرنے کی ترغیب وتحریک دیتے۔لفاظ بھی ان سلاطین وقت کی قدردانی اورحوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔جن سے بادشاہ کا مورل بھی بلند کی طرف گامزن اورترقی کے لئے کوشاں ہوتا تھا۔فن لفاظی کے طفیل ہی مصاحبین، چمچے، طفیلئے اور جی حضوری کے عادی حضرات اپنے آقا صاحب کی جی حضوری اور پیروی کرتے۔اگرفن لفاظی نہ ہوتی جہان اردوادب میں اپنی ذاتی تعریف کے پل باندھنے کی خاطر لفاظیوں سے پرقصائد اور مدح،توشیحی نظمیں، خاکے، سپاس نامے اوراعتراف خدمت ایوارڈ کے مظاہر کہاں میسر آتے؟

لفاظیاں میدان سیاست کا اول مہرہ ہیں۔بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سیاست کی ریاست لفاظیوں کی اساس پر استوار ہوتی ہے جہاں کہنی یا کرنی نہایت اہم ہوتی ہے۔ہاں کرنی کا نمبر شاید نہ بھی آئے تو انتظار کا بہلاوا کام آجاتا ہے۔انہیں لفاظیوں کے بل بوتے پر اہلیان سیاست کی بساط جمی ہوئی ہے۔یہ اپنے صارفین (ووٹرس) کو لفاظیوں کے ملفوفات کے سحر میں الجھا کر ان کا دل موہ لیتے ہیں۔ان کے خوابوں کا مستقبل ہتھیلی پر دکھا کر عوام الناس کو لفاظیوں کے ذریعئے الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرلیتے ہیں۔لوگ باگ انہیں لفاظیوں کے زور پر اپنا ذاتی کام

www.urduchannel.in

کاج درکنار کرکے سیاسی پارٹیوں اور سیاسی قائدین کے لئے دن رات محنت کرتے ہیں۔یہ علحدہ گفتگو ہے کہ کبھی ان کو فائدہ بھی میسر آتا ہے جب ان کا امیدوار سرخ رو ہو کر میدان سیاست کا علمبردار بن جاتا ہے اور اس وقت لفاظیوں اور طفل تسلیوں سے دامن بھرنا پڑتا ہے جب ان کا امیدوار منہ کی کھا کر کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہ جاتا ہے تو اس محاذ کے زمانہ ساز قائدین لفاظیوں کے سہارے ہی عذر لنگ تلاش کرلیتے ہیں۔

بلا معاوضہ ومہارت صرف اخلاق وزبان کے اعتدال کے ساتھ لفاظیوں کی پیداوار انسان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔حقیقت چونکہ تلخ ہوتی ہے اور سب کے گلے سے حقیقت کا اترنا دشوار اور کلفت جان کا سبب ہے لہذا ہلدی لاگے نہ پھٹکری رنگ آوے چوکھا کے مصداق لفاظیوں کے فیض سے مستفیض ہونے اور کرنے میں اگر مہارت مل جائے تو دنیا جیتنا بھلا کیا دشوار ہو؟

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں

۶۶۔اشتہاری اشتہا

ماضیٔ قریب میں شہر کی سڑکوں، چوک، چوراہوں اور عوامی مقامات پر صرف دو قسم کے افراد کی تصاویر اکثر و بیشتر آویزاں کئے جانے کا رواج تھا۔ پہلی قسم کی تصویر اشتہاری مجرمین کی ہوتی تھی کہ وہ جیسے ملے جہاں ملے جسقدر ملے یا نظر آجائے تو اسے نقص امن عامہ کے خطرے کی پاداش میں محکمہ پولس کو اس کے محل وقوع و جغرافیائی مقام کی خبر دے دی جائے اور دوسری قسم کے اصحاب تصویر سیاسی مجرم حضرات ہوتے تھے۔ موصوف ہر سال یا پانچ سال میں عوام الناس کے لئے فلاحی، رفاہی، تعمیری اور سماجی وعدے وعید کی بہار تو لاتے ہیں لیکن ان بہاروں میں ارمانوں کے پھول نہیں کھلتے بلکہ ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ہر مرتبہ موصوف گرامی نئے دام فریب کے ساتھ عوام الناس کے مفاد کو نصب العین بنا کر آنکھوں کا کاجل چرا لیتے ہیں بقایہ پانچ سال تک عوام آنکھیں مل مل کے، آنکھیں بچھا کر ان کا راستہ تکتی ہیں اور وہ ہیں کہ آنکھیں چرا کر یا آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنا کام بخوبی کر جاتے ہیں یعنی اپنے گھر بھر جاتے ہیں۔

عموماً بڑی منکسر المزاج اور سادہ لوح عوام کو اپنے معمولات حیات سے فرار حاصل کرنے کا اور نام نمود اور جھوٹی شان و شہرت کا چسکہ نہیں لگا تھا۔ نہ وہ خود نمائی اور خود ستائی کو بھلا ہی سمجھتے تھے بلکہ اسے عیب تصور کرتے تھے۔ بلکہ دوسروں کے نام کو اپنے نام پر ترجیح دیتے اور بذات خود ''من آنم کہ من دانم'' کی تصویر انکسار بننا پسند کرتے تھے۔ لیکن میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے مادی چمک دمک کو نقد کرنے کے سلسلے میں کاروبار کے نئے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں کہ پوسٹر بازی اور بینر بازی کے ذریعے عوام الناس کی اس کمزور نفسیات پر کمند پھینکا گیا ہے کہ ہر خاص و عام اپنی تصویر پوسٹر یا بینر پر نمائشیا آویزاں کرنے کا متمنی ہے۔ جس سے خود داری کی بجائے خود

www.urduchannel.in

غرضی کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

بینر پر موجود صاحب تصویر خواہ وہ اس کا مستحق ہو یا نہ ہو۔ حتی کہ غیر سیاسی حضرات بالغ و نابالغ معصوم چہرے بھی ان بینروں کی زینت بن جاتے ہیں۔ جن کا اس بینر کی طباعت و آرائش کے نصب العین یا اغراض و مقاصد سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ ان معصوم چہروں کے حصار میں قد آدم سیاسی و مذہبی شخصیت کی مضحکہ خیز انداز میں موجودگی ان کے در پردہ مقاصد کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اہل نقد و نظر خوب جانتے ہیں یہ کس بات کی پردہ دادری ہے اور اس قسم کی ارزانیٔ شہرت کو کس خانے میں شمار کرنا چاہئے۔ جس کے تحت یہ اسراف بے جا کیا جاتا ہے۔ یوں بھی اگر سیاست داں صرف ایوانوں میں لئے گئے اپنے حلفیہ بیان کے مطابق فرائض منصبی بجالائیں تو وہ مثل آفتاب روشن ہو جائیں گے۔ یوں بھی روشن آفتاب کو غیر معروف ستاروں کی تابانی کے حصار کی حاجت نہیں ہوتی۔ سنسکرت کا مشہور مقولہ ہے ''تتھا راجہ تتھا پرجا'' یعنی جس قسم (نام نمود کے شائقین) کے قائدین ہوں گے اسی مزاج کی عوام بھی ہوگی۔ عین اسی طرح یہ بے جا نام و نمود کی علت بھی سیاسی قائدین کی صف سے راست سیدھی سادی عوام کے مزاج میں در آئی ہیں جنہیں اشتیاری مجرمین کی تصویر اور اشتہاری مبارکباد کی تصویر کے مابین فرق نظر نہیں آتا۔ اس بینر کے پس پردہ وہ اپنی سیاسی برتری اور شہرت کی فوقیت کا مظاہرہ کس خوبی سے کر جاتے ہیں۔ ان معصوم افراد کو اس کا ادراک بھی نہیں ہوتا۔ بقول شکیل بدایونی ؎

پہلے نہیں تھا بے چاروں کو اندازہ رسوائی کا

بینر خواہ عیدین، دیوالی، ہولی و دیگر مذہبی تیوہاروں کی مناسبت سے مبارباد، سالگرہ کی مبارباد، انعام و اکرام ملنے کی مبارکباد، انتخابی تشہیر، خراج عقیدت، عہدہ جلیلہ تفویض ہونے پر، اظہار افسوس کی خاطر، ترقی پانے پر، کامیابی پر، سیاسی تحریکوں، مشاعروں، کانفرنس، سیاسی و عوامی

جلسوں میں شرکت، سیمینار، کانفرنس دینی اجلاس ہوں یا کسی اور مقصد کار آمد ہوں یا یکسر فضول کاموں کے لئے آویزاں کئے گئے ہوں۔ جہاں تک مبارکباد کا تعلق ہے یہ خالصتاً خلوص دل اور قلبی مسرت اور شخصی ملاقات کا متقاضی ہے۔ بحالت مجبوری خط یا عید کارڈ کا سلسلہ جاری کرنا پڑا جب طویل مسافتیں درمیان میں حائل تھیں۔ خوشیوں میں شرکت اور مبارکباد کے تبادلے کی کوئی دیگر صورت نہ میسر تھی۔ اب اس مجبوری نے فیشن کا قالب اختیار کر لیا۔ جس کے پس پردہ خلوص سے زیادہ خودنمائی اور خودداری سے زیادہ خودغرضی کا جذبہ کارفرما ہو تو ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

ان بینروں پر ابن الوقت قائدین جو بذات خود تشہیر، خودستائی اور خودنمائی کے شائق ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایسے ایسے معصوم گل رخاں و پری چہرہ، بالغ و نابالغ اشخاص جن کی معمولی موجودگی بھی طبیعت پر جاں گسل اور کوفت رساں اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کی تصاویر کی نمائش سے سارے شہر کے اہم چوک چوراستے، سڑکیں، شاہراہیں و اہم تفریحی و عوامی مقامات کا سارا علاقہ پر ہو جاتا ہے اور مہینوں ان کی موجودگی کے سبب حساس ذہنوں کو لایعنی کوفت کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف عوام میں اشتہار کی اشتہا پیدا ہوتی ہے۔ البتہ ہمارے سلف صالحین کی احسن اقدار، عادات و اطوار اور انکساری کا دامن کب، کیسے اور کہاں ہاتھ سے چھوٹ گیا ہمیں احساس ہی نہ رہا۔ بقول شاعر مشرق

؎ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

کچھ دہوں قبل علما کو تصویر کشی سے بڑی نفرت تھی۔ اگر کوئی فرط عقیدت سے ان کی عکس بندی کر لیتا تو خفا ہو جاتے تھے اور جب تک وہ اپنی تصویر رد نہ کروا لیتے تھے، چین سے نہیں بیٹھتے

www.urduchannel.in

تھے۔ فی زمانہ بینروں پر اصحاب تصویر کے معاملے میں صف اول نہ سہی صف دوم کی تصاویر علما کرام کے بشروں سے آراستہ و پیراستہ ہوتی ہیں۔ گویا دنیاوی مالی منفعت جسے وہ اپنے ہر خطاب میں کوسنے سے باز نہیں رہتے اسی کے اسیر زلف ہو کر خودنمائی اور خودستائی کے ناپسندیدہ عمل کر گذرتے ہیں گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔ اسے منافقت پر محمول کرنا اہل دین و مذہب کی گستاخی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ لہذا ہم کسی بھی قسم کی فقرے بازی سے گریز کرتے ہیں۔ ہم شاعر مشرق کے ہمنوا بھی نہیں ہیں جن کا مسلک یوں ہے کہ

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

جنت کی طلب تو ہر کس و ناکس کی طرح ہمیں بھی ضرور ہے۔ بہرکیف ملت کو جہاں بیداری، ہوش مندی اور عصری تقاضوں سے آگہی کی ضرورت تھی۔ ہمارے قائدین نے نسل نو کی تواضع خودستائی وخودنمائی کے افیون سے کی ہے۔ جس معاملے میں ہر بینر دوسرے بینر ہیئت، رنگ مقام اور تصاویر کی سائز پر سبقت لے جانے کی مقابل آرائی میں مصروف ہے اس پیشے نے بھی صنعت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس صنعت سے وابستہ چند بے روزگاروں کی مالی یافت اور شکم پروری کی سبیل تو نکل آئی ہے۔ البتہ یہ طوفان خودنمائی کس قدر معاشرتی، ملی و مالی نقصان کے بعد تھمے گا یا اسی رفتار سے بڑھتا رہے گا اس کے بارے میں قیاس بعید از وقت ہوگا۔ یوں تو قائدین پر فرض تھا کہ وہ نسل نو کی صحیح رہنمائی فرماتے لیکن جب واقعہ اور اس سے زیادہ المیہ یوں ہو کہ

بربادیٔ گلشن کی خاطر تب ایک ہی الو کافی تھا
ہر شاخ پہ الو بیٹھے ہیں انجام گلستاں کیا ہوگا

نام و نمود کی خواہش میں فراعنۂ مصر نے قوی ہیکل مجسمے، منادر اور اہرام تعمیر کئے۔ آج وہی اثاثہ تازیانۂ عبرت بن کر انہیں پر برس رہا ہے ساری دنیا سے سیاح ان کی تاریخ کا مطالعہ و مشاہدہ

کرنے مصر کا سفر کرتے ہیں اور ان کے منطقی انجام سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ حیات دوام کا سزاوار تو کائنات کا خالق ہے بقیہ تمام فانی ہیں تو پھر چار دن کی حیات مستعار میں فرصت گناہ نام و نمود کا کیا جواز؟ اشتہار کی اشتہا ایک قلیل مدتی نشہ ہے۔ بنیادی طور پر نام اس کا زندہ ہوتا ہے جو نیک کام کر گذرتا ہے۔

۶۷۔ نغمہ ہائے سگاں

کتے ہماری تہذیب کے جز ولاینفک ہیں۔ ہماری معاشرت ان کے بغیر بے کیف ہے مفت کے وفادار پہرے دار و محافظ گالیوں کے متبادل اور جوتے لات اور مار کھا کر بھی حرف اف نہ کرنے والے گوشت خور درندے ہیں جن کو سبزی خور بھی پسند کرتے ہیں۔ قوت شامہ اور چھٹی حس میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ کتوں میں بہت سارے خواص اور عیوب ہوتے ہیں البتہ خواص وفاداری کے بعد ایک خاص وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ گائیکی کے فن سے ازلی طور پر آشنا ہوتے ہیں ان کے بھونکنے کے انداز سخن سے اس کی قلبی حالت یا تاثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس فن کا درک محترم پطرس بخاری صاحب کے بعد ناچیز کو ہوا ہے۔ کتے بھلے ہی کلاسیکل موسیقی کے رموز و اسرار سے مکمل طور پر واقف نہ ہوں۔ نہ انہوں نے کسی ماہر فن سے اس کی تعلیم ہی حاصل کی ہے لیکن قدرت نے انہیں ایسی گوناگوں صلاحیت دی ہے۔ حتیٰ کہ مجھ جیسے طلاب علم کلاسیکل موسیقی کو معقول تعلیم، ریاضت اور استاد فن کے ناز نخرے جھیلنے کے بعد بھی وہ ودیعتیں اور فن کی معراج میسر نہ آئیں جو ایک سگ آوارہ کو قدرت نے اپنے دامن فیض سے یونہی تفویض کر دی ہیں۔ یہ صلاحیتیں کتوں کے مافی الضمیر کے اظہار سے ذاتی دفاع اور احتجاج سے لے کر درد کے اظہار کی بھی سبیل ہیں محبوب کے لئے رومانٹک گیتوں کے گائیکی سے اظہار غیظ وغضب کی تعبیر بھی ہیں۔ یوں بھی کتوں کی نفسیات بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ جب آپ کتے کے قریب ہی کہیں موجود ہوں اور کتے کو آپ سے خوف یا برے رد عمل کا اندیشہ ہو تو کتا کھرج کے سر میں الاپ لے کر آپ کے رد عمل کا منتظر ہوتا ہے یا آپ کو دعوت سخن دیتا ہے۔ جونہی آپ نے شوخی یا منفی رد عمل دکھائی کہ ذاتی دفاع کے زور پر وہ بڑے زور و شور سے پنچم سر میں الاپ

www.urduchannel.in

لے کر اپنی کمک برائے سگ آوارہ کو دعوت گائیکی دے دیتا ہے۔ اس کی دعوت نغمگی پر لبیک کہتے ہوئے بہت سے کتے آپ کے اطراف جمع ہو کر کورس میں ایسی دلدوز گائیکی پیش کرتے ہیں کہ آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ کمزور دل کے شخص کو اس بات کا دورہ نہ پڑ جائے اور طبیعت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ یا تو راہ فرار حاصل کی جائے یا کوئی بندوق ہاتھ آجائے تو ان کو کتوں کی موت مار کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے لیکن افسوس صد افسوس وہاں صبر کا گھونٹ پی مجبوراً 'کرُانسان' بن جانا پڑتا ہے۔ ہم بذات خود گالیوں کے مصداق کتوں کی ہمسری کا گناہ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ہماری بشری کمزوری ہے

ظاہر ہے کہ انسانوں کی طرح کتوں کا بھی مزاج ہے کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ لہذا جب کوئی اجنبی کتا بالاتفاق اس گلی سے گذر جائے تو اس بیچارے کی خیر نہیں۔ اس گلی کے میزبان کتے اس نو وارد کتے کو معکوس استقبالیہ گیت سنا کر اس کا قافیۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ جس طرح عاشق نامراد کا حشر ہمارے گلی محلوں میں ہوتا ہے۔ وہ مہمان کتا بھی اپنی اس ہتک پر خاموشی یا درگذر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جی جان سے کسی سورما کی طرح میزبانوں سے برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ ان کے ہر سوال کا جواب اتنی ہی شدت سے دے کر اپنی بالادستی ثابت کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ جس کے لئے وہ حسب ضرورت تان کا جواب الاپ سے دیتا ہے تو زمزمہ کا جواب بھی سرگم کی ادائیگی سے دیتا ہے۔ اکیلا ہی تمام مخالفین کو مختلف لے میں بروقت برموقع و برمحل تانوں کی ادائیگی کر کے میدان مارنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ بہرحال ان کی یہ جنگل بندی کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ اور جب بات بنتی نظر نہ آتی ہو تو تشدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ پھر تو گلے کے ساتھ ساتھ اعضاو جوارح کی حرکت بھی ماحول میں سراسیمگی اور خوف و ہراس کا سماں پیدا کر دیتی ہے۔ ترنم بھی تشدد اختیار کر لیتا ہے اور چیخ و پکار سے سارا محلہ سر پر اٹھانے کی بھرپور

کوشش ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رزمیہ گائیکی کا نمونہ بچشم خود دیکھنے کا موقع مل رہا ہے بشرطیکہ ناظر خود محفوظ مقام پر موجود ہو ورنہ تمام کتے باہم تنازعے کو بھول کر ناظر کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ بلآخر مہمان کتا راہ فرار اختیار کر لیتا ہے یا کسی نالی میں پناہ لیتا ہے۔ بہرحال جب تک میزبان کتے اس بات کا تیقن نہ کر لیں کہ ان کا مہماں اس گلی سے رخصت ہو گیا ہے تب تک جلے پیر کی بلی کی طرح آگے پیچھے چلتے رہتے ہیں اور نو وارد کتے کو جب تک اپنی سرحد سے نکال باہر نہ کریں۔ ان کتوں کے دل کو سکون و چین میسر نہیں آتا۔

موسیقی میں راگوں کے گانے کے اوقات متعین ہوتے ہیں۔ صبح صادق بوقت اذان جب بھیروں گاین کا وقت ہوتا ہے۔ بالاتفاق راگ بھیروں کی لاپ کاری اسی مناسبت سے کرتے ہیں۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی کتے یکے بعد دیگرے تارسپتک کے سروں میں راگ بھیروں کا الاپ ایسا لیتے ہیں گویا بنی نوع انسان درد سے کراہ کر چیخ رہا ہو اور پرسوز تان لے کر اپنے درد کا اظہار کر رہا ہو۔ کہتے ہیں کتوں کو فرشتوں (ملائکہ) کی آمد کا درک ہوتا ہے۔ وہ جنات اور دیگر غیر مرئی مخلوقات کی آمد سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ البتہ یقین کامل ہے کہ صبح صادق میں کتے اونچے سروں میں دعا تو نہیں دیتے ہوں گے بددعا ضرور کرتے ہوں گے۔ بلکہ بنی نوع انسان کی شکایت ہی کرتے ہوں گے یا کتے بھی انسان کی موت مارے جانے سے پناہ طلب کرتے ہوں گے یا پھر اپنی ناقدری و ناسپاسی کا نوحہ کرتے ہوں گے۔ جس عادت کا ہر تیسرا شخص شکار وازلی طور پر بیمار اور شاکی بھی ہے۔

کتوں میں جذبہ رقابت اور حسد کے معاملات بھی انسان سے کسی درجہ کم نہیں ہیں۔ جب کوئی کتا کسی جواں سال بانکی سجیلی کتیا پر عاشق ہوتا ہے تو دوسرے کتے فرط رقابت سے اس کی راہ میں روڑے اٹکانے میں سبقت لے جاتے ہیں۔ انسانوں کی مانند ہر کتے کی کوشش یہی

www.urduchannel.in

ہوتی ہے کہ کس طرح اس کے جمے جمائے رنگ میں بھنگ ڈالا جائے اور مدمقابل میں موجود کتے کا قافیہ تنگ کیا جائے اور اگر وہ ہار نہ مانے تو جنگ کی جائے۔ یا اسقدر مارا جائے وہ دنگ رہ جائے۔ البتہ کتے دھن کے پکے ہوتے ہیں مجنوں کی طرح لیلیٰ لیلیٰ کرتے ہیں۔ رومانٹک گیت گا کر کتیا کو متاثر کر لیتے ہیں تو جنون شوق میں اسے پا کر ہی دم لیتے ہیں۔ خواہ کتیا کی لن ترانیاں دوسرا اونچی یعنی کالی دوسے اور فلک شگاف احتجاج کیوں نہ بلند کریں۔

کتے موسیقی اور گائیکی کا شوق عموماً رات کے اوقات میں پورا کرتے ہیں۔ رات رات بھر باہم گائیکی کے مقابلے ومناظرے کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گروہ کو نیچا دکھانے کے لئے حسب ضرورت چھوٹا خیال، بڑا خیال، ٹھمری، دادرہ اور ٹپہ گائیگی، دھرپد دھمار اور لوک گیتوں کے ایسے ایسے نمونے پیش کرتے ہیں کہ رات کہاں اور کیسے گذر جاتی ہے بے چاروں کو احساس بھی نہ رہتا ہو۔ درمیان میں کتوں کا گروہ الاپ کاری کرے پھر اس کا جواب بول تان سے دینا۔ اگر مدمقابل زمزمہ پردازی کر رہا ہو تو سرگم میں اس کا جواب دینا۔ اور جہاں جس فنی محاسن کی گنجائش ہوتی ہے اسے ضرور روبہ کار لے آتے ہیں گویا ہر طرح سے متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ حسب موسم حسب اوقت راگوں کا انتخاب بھی فطرت کا تقاضہ ہے جس میں کتے بڑے طاق ہیں۔

کتوں کا ایک گروہ راگ توڑی چھیڑ دیتا ہے تو کتوں کا دوسرا گروہ فوراً راگ درباری چھیڑ دیتا ہے۔ ابھی کھرج کے سر ہی الاپے جا رہے تھے کہ ایک نوعمر کتے کے پلے نے ایک سر اونچی آواز میں جے جے ونتی کی آستھائی سنادی کہ شاید یہ اس کی نفسیاتی ضرورت ہو۔ کتیا کو راگ پیلو بہت بھا گیا تو اس نے بھی الاپ کاری کی۔ کتے کے پلے کا پیر ایک گڑھے میں پھنس گیا تو بے ساختہ شیورنجنی کا ایک طویل اور اونچے سروں کا الاپ لیا۔ کتے کو اہیر بھیروں سے دلچسپی تھی۔ جونہی اس کی باری آئی اس نے بھی اپنی آواز میں راگ اہیر بھیروں اندازاً نصف گھنٹہ تک

www.urduchannel.in

چھوٹے بڑے الاپ لیا۔ دوسری سمت سے کسی نے راگ ملتانی چھیڑا جواب میں راگ جونپوری کے الاپ شروع ہوا۔ جب سب کر کے بھی حسرت باقی رہی تو اس کتے نے بڑا خیال مالوس میں پیش کیا۔ جواب بھی نہ بن پڑا تو دوسرے نے مدھوونتی کیں چھوٹا خیال پیش کیا۔ الغرض ساری رات رامائن پڑھی صبح صادق کے آتے آتے اگلا پاٹھ پچھلا سپاٹ کی کیفیت باقی رہتی ہے جیسے کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہے گی۔

۶۸۔دل کے بہلانے کو۔۔۔۔

جب انسان کے پاس کوئی ڈھنگ کا کام بچ نہ رہے تو دل بہلانے کا کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ تراش ہی لیتا ہے تاکہ وہ وقت نازک اس کے حساس مزاج پر گراں نہ گذرے اور وقت گذاری کا شکوہ بھی لبوں پر نہ آئے کہ

رات کٹتی نہیں دن گذرتا نہیں

لہذا وہ دل بہلانے کے مختلف ٹوٹکے دریافت کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ کتنے دل زدہ کام کاج سے نجات (فرار) حاصل کرکے گھر سے باہر سیر وتفریح کی غرض سے نکل جاتے ہیں۔ کبھی صدر بازار کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا آتے ہیں۔ اس چکر کہ پس پشت اس چکر میں بھی رہتے ہیں کہ کہیں کوئی حسین، نازنین سے نگاہیں چار ہو جائیں، کوئی اشارہ بازی ہو جائے، کوئی آنکھوں آنکھوں میں قول وقرار ہو جائے۔ اسی چکر میں ان کی متجسس نگاہیں اپنا مطلوبہ ہدف تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ بقول ناصر کاظمی،

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے ——— اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے
کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن ——— گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے

اگر خوش قسمتی سے مراد برآئی تو آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ پھر ان کی چال رندانہ میں وہ شاہانہ تفاخر در آتا ہے جو مغلیہ سلطنت کے تاجداروں کو ہندوستان فتح کرنے پر بھی نہ ملا تھا، جو ان کو فقط خم ابرو کے اشارے سے میسر آجاتا ہے۔ بالفرض وہ نامراد بھی لوٹے تو اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ حفظان صحت اور ہاضمے کے لئے چہل قدمی بھی تو زندگی کا لازمہ ہے۔

کچھ اہل دل حقہ بازی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جوں ہی کام سے فرصت میسر آئی (جان

www.urduchannel.in

چھوٹی) کہ محفل یاراں میں آبیٹھے۔ حقے کی نے سنبھالی اور قہقہوں اور گپ بازیوں کے درمیان دھوئیں کے مرغولوں سے محفل کو دوچند کر دیا۔ چلم پر چلم چڑھائے جاتے ہیں۔ جب مزاج محفل کے ہم آہنگ ہو جائے تو ترنگ میں آکر کوئی داستان چھیڑ دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے تجربات، محسوسات، سنی ان سنی کہہ کر بات کو اتنا طول دیتا ہے۔ محفل کو چار چاند لگاتا ہے (ہانکتا ہے) کہ بشری تقاضوں کا وقت آپہنچتا ہے۔ پھر خوش گپیوں کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے اور یہ احساس لئے گھر کی طرف چل دیتے ہیں کہ چلو جو بھی کٹی اچھی ہی کٹی۔ ابھی گھر کا راستہ عبور بھی نہ ہو سکا کہ کوئی شاسا یا دور افتادہ رشتہ دار میسر آجاتا ہے۔ جن سے تمام کچی پکی خبروں کی مفت نشریات جیسے فلاں کی موت کی افسوس ناک خبر، فلاں کی شادی، فلاں کی کامیابی اور فلاں کی ملازمت کی خبر سے مستفیض ہوئے۔ کبھی آہ کبھی واہ کے اظہار کے ساتھ گھر لوٹے تو اہل خانہ پر رعب داب ایسا کہ گویا ہمالیہ کے ماؤنٹ ایوریسٹ کو تن تنہا سر کر کے لوٹے ہوں۔ الغرض ساری تھکن اور کسل مندی جاتی رہی۔ دل کو بہلانے کی سبیل بھی تقریباً مفت میسر آئی۔

خواتین کے ہاں دل بہلانے کے انداز جدا ہیں۔ وہ باہم غیبت، چغلیاں، بہتان تراشیاں، حسد جلن اور سب سے محبوب مشغلہ ادھر کی بات ادھر اس انداز میں کرتی ہیں کہ شرط راز داری قائم رہے، وہ بھی بالکل مفت اور بڑی سرعت کے ساتھ انجام دے کر فریضۂ تعلقات نبھاتی ہیں۔ یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ بظاہر خواتین اگرچہ فربہ اندام نظر آئیں اور بعض اوقات (بصد معذرت) توندوالی بھی نظر آئیں لیکن پیٹ کی بڑی ہلکی واقع ہوئی ہیں۔ جس کی پاداش میں پہلے تصدیق وتحقیق، پھر باہم لڑائیاں، جھگڑے، پھر جوابی ردعمل میں وہی سارے مراحل درپیش ہیں جو آپ چند سطروں قبل ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس کے کئی فوائد ہیں۔ ایک تو گھر گرہستی جیسے محنت طلب اور تھکا دینے والے کاموں سے فراغت مل جاتی ہے۔ جہاں پذیرائی اور تشکر تو دور، کوئی بھولے

بھٹکے احساس بھی نہیں کرتا تو پھر بلا وجہ نعمت خانے میں اشیائے خوردنی کو ٹنے، پیسنے، گھسنے، پکانے ابالنے، بھوننے، جلانے سے تن و مند جسم کو تکلیف دینے کی بجائے محترمہ چھٹانک بھر کی زبان سے جو ذائقہ پیدا کرتی ہیں۔ اس مرچ مصالحے کی لذت گھروں گھر منتقل ہوتی ہے او روہاں بھی نت نیا چٹخارہ پیدا کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپس میں دانت پیس پیس کر لعنت وملامت کے بعد آپس میں گتھم گتھا ہو کر اور پھر بھی دل نہ بہلے تو باہم بال پکڑ ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش جب تک اپنی معراج کو نہ پہنچ جائے۔ تب تک سکون کہاں میسر آتا ہے؟ اور کلیجہ کہاں ٹھنڈا ہوتا ہے؟ تعلیم یافتہ طبقے میں خواتین کے شوق، حسد و رقابت، ذاتی فوقیت کی خاطر باہم سرد جنگ، خاموش مقابلہ آرائی اس درجے کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کا راست فائدہ ملبوسات کے دکانداروں اور میک اپ اور آرائش و زیبائش کی اشیا فروشوں کی بگڑی آمدنی میں مزید اضافے کا سبب بنتا نظر آتا ہے۔ اگر خواتین کو یہ مشاغل میسر نہ آئیں تو شکم سیری کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ابھی وہ روزے سے ہیں۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

مردوں کی طرح خواتین میں بھی سماجی جانور ہونے کے ناطے زبانی جگالی کی عادت بہر حال ہوتی ہے۔ ان کے پاس عہد ماضی کے قصے کہانیاں، خبیث اور بدروحوں کا تذکرے، گھر گھر کی کہانیاں سب ہوتی ہیں۔ پھر اس پر ستم بالائے ستم انداز بیاں کہ پان کی پیک منہ میں رکھ کر لذت اور چٹخارے کے ساتھ، چہرے کے تاثرات اور ہاتھ کے اشاروں کی چاشنی گھول کر وہ داستان بگھارتی ہیں کہ فرضی داستان میں حقیقت کا رنگ ابھرنے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ ذات برادری کے تنازعے، ناک بھوں چڑھا کر بیان کرنے میں نیز باتوں باتوں میں اپنے میکے کی فضیلت اور سسرال کی برائی کا کوئی موضوع بھی گوش گذار کرنے سے باز نہیں آتی تا کہ نیند اچھی آئے اور دل کو طمانیت محسوس ہو کہ آج کو کوٹہ مکمل کرلیا۔ درمیان میں پیچ پیچ کر کے دیواروں کو

www.urduchannel.in

لالہ زار کرنا اور پان کے ساتھ بھڑاس بھی اگلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کسی بھلے شخص کے نیک کردار میں عیب جوئی کا پہلو تلاش کر لینا۔ گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس ضمن میں دو چار کچی پکی حکایتیں، مثالیں، سنا کر اخیر میں کان کو ہاتھ لگا کر کمال ادائے معصومیت سے معذرت بھی طلب کر لینا اور یہ کہنا ’’مر کے مالک کو منہ دکھانا ہے۔‘‘ لیجئے دل کو بہلانے کا راستہ بھی نکل آیا اور تفریح طبع بھی میسر آ گئی۔

مردوں میں کچھ منحوس قسم کے افراد بھی ہوتے ہیں۔ جن کو انسان کی بنیادی تعریف ’سماجی جانور‘ میں سے ثانی الذکر صفت کے حوالے سے یاد کیا جائے تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ ان کے دل بہلانے کا سامان کال کوٹھریوں (تاریک گوشوں) میں منہ دے کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے سے بھی میسر آ جاتا ہے۔ یہ غیر مجلسی اور آدم بیزار اشخاص نہ جانے کن باتوں اور افراد سے حظ اٹھاتے ہیں۔ ان سے تو اللہ ہی سمجھے۔

ان کے بالکل برعکس کچھ ایسے نو آموز مقرر حضرات ہیں جن کے نزدیک قوم کی ترقی کا راز صرف جوشیلی، دھواں دھار اور آدھا تیتر آدھا بٹیر قسم کی تقاریر کرنے میں پنہاں ہیں۔ وہ زور خطابت اور اپنی نیم صحیح نیم غلط معلومات کو فلاں ابن فلاں کے حوالوں سے کمال اعتماد سے بیان کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کے دل بہلانے کا ذریعہ ہے خود ستائی، زور خطابت اور اس کے لئے پیدا کئے گئے سیاق وسباق ہوتے ہیں تا کہ تعریف کا محور ان کی اپنی ذات اور ان کے الفاظ کی فضول خرچی کی تعریف وتوصیف کے گرد گھومتا رہے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں آج اس پروگرام میں سمع خراشی کی کل اس پروگرام میں اپنی تقریر کا زور آزمانے میں مصروف ہو گئے۔ انہیں چاہئے کہ وہ چچا غالب کے دیوان سے یہ سیکھ لیں کہ ؎ دیکھنا تقریر کی لذت۔۔۔۔

دل کے بہلانے کا انداز تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ حضرات میں بھی مختلف نوعیت کا

حامل ہے۔غیر تعلیم یافتہ حضرات کے نزدیک نیند بھر سونا، وقت گذاری کے لئے فلم دیکھنا، مشاعروں میں اشعار و غزلیات سمجھے نہ سمجھے واہ واہ کرنا۔شاعرات کو مرد شعرا کی بانسبت زیادہ داد اور پذیرائی سے نوازنا ہوسکتا ہے۔ان کی معصومیت کے برعکس تعلیم یافتہ حضرات ایک فرضی مسئلے کو لایعنی طور پر پیدا کر کے اسے اپنے اپنے مطلوبہ حل تک لانے کے لئے اس کی بال کی کھال نکالنے اور اس کے اجزائے ترکیبی لوازمات اور حسنات اور سئیات پر بحث کرنے ۔اس میں منطق ،فلسفہ، اقوال، اصول، قانون حتی کہ مذہب کو گھسیٹ لاتے ہیں ۔اس معمولی موضوع پر اتنی دیر تک گفتگو کرتے ہیں (بلفظ دیگر اپنی علمیت کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں) کہ ہاتھی کا گوشت گل جائے لیکن ان کی دال نہ گلے ۔اخیر میں منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ مصلحت کے پس پردہ مصافحہ کر کے رخصت لیتے ہیں ۔اکثر دماغ یہ سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے کہ آیا یہ سارا مباحثہ دماغ کی ورزش کے لئے تھا یا دل کی فرحت انگیزی اور لطف اندوزی کی خاطر تھا۔امید کے تحریر کی خواندگی بھی آپ کے دل کے بہلانے کا سبب بن سکی ہو۔

www.urduchannel.in

اٹکھیلیاں

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	۵
۲	چچا چھکن کا وصیت نامہ	۸
۳	کراماتی لوٹا	۱۷
۴	طبقہ واریت	۲۴
۵	خرگوش کے سینگ	۳۴
۶	قانونی شیر	۲۴
۷	دانت کھٹے	۲۹
۸	بڑھتی کا نام داڑھی	۵۳
۹	تماشہ کرسی کا	
۱۰	لیڈر	
۱۱	کوائف مصنف	

www.urduchannel.in

پیش لفظ

جدید ادب میں طنز کی بالا دستی کے سبب اسے آزاد ادبی صنف سخن تصور کیا جا رہا ہے۔اسے مخصوص شعبے اور اظہار کے اسالیب میں برتنے سے قاری کی توجہ یک لخت طنز کی طرف جاتی ہے۔قاری معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مفہوم کی تہ تک پہنچ کر اس طنز کا مکمل لطف اور حظ اٹھاتا ہے۔البتہ اگر یہی طنز خالصتاً سنجیدگی سے کیا جائے تو باعث تنازعہ، دل شکنی کا یا تنقید کا مظہر ہوسکتا ہے۔البتہ اس میں مزاح کی چاشنی سے جہاں طنز کی شدت میں دلچسپی کی آمیزش بصورت ظرافت پیدا ہوتی ہے۔وہیں قاری کو اس آمیزے سے مطالعے کا لطف ضرور آتا ہے اور قاری مذکورہ تحریر میں توجہ اور دلچسپی کا عنصر تلاش کر لیتا ہے۔جو اس کے دماغ کو اس سوچ کے محور پر جلد ہی گامزن کر دیتا ہے۔لہذا اس آمیزش سے نہ صرف ترسیل آسان ہوتی ہے بلکہ موضوع کی اہمیت اور وقعت بھی قابل توجہ ہوتی ہے۔

خالص مزاح اگرچہ نو رسوں میں ایک مقبول اور پسندیدہ رس ہے۔گو حس مزاح کو فرحت طبع اور خوشی کی علامت تسلیم کیا جاتا ہے۔مگر اس کی زیادتی بھی تحریر کو معیار فراہم کرنے کی بجائے پھوہڑ پن یا کھوکھلے پن کی طرف گامزن کر دیتی ہے۔اس تحریر میں معیار صرف طنز کی آمیزش اور توازن سے ہی پیدا ہوتا ہے۔لہذا جہاں تحریر میں طنز کی کاٹ کے ساتھ مزاح کا پھاہا بھی ہو۔وہاں بے شک ایسی تحریر معرض وجود میں آتی ہے جنہیں عام قارئین کے ساتھ ساتھ بالغ ذہن، سنجیدہ اور مدبر حضرات بھی بصد شوق مطالعے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ان تحریروں میں پنہاں مواد ان کی توجہ کا مرکز بھی با آسانی بن جاتے ہیں بلکہ جا بجا حوالے اور مقولے کی حیثیت سے دہرائے جاتے ہیں۔جس سے ان کی آفاقیت جگ ظاہر ہو جاتی ہے۔

لہذا سنجیدہ ادب سے کہیں زیادہ مقبولیت اورعوامی رغبت طنز ومزاح پر مبنی ادب کے حصے میں آئی ہے ۔مگر اسے برتنے کے لئے مصنف کے رجحانات ،میلانات ،آفاقیت اورمہارت زبان کی مہارت کے ساتھ ساتھ مصنف کے مشاہدات ،تجربات ،احساسات ،ادراک کو مخصوص تناظر میں پیش کرنے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے جس سے قاری کا واسطہ اب تک نہ پڑا ہو۔طنز ومزاح کے مصنف کو بے انتہا سنجیدگی کے بطن سے شگفتہ ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت میسر ہوتی ہے۔

اس تناظر میں طنز ومزاح کے میدان میں اگر چہ موضوعات کا انتخاب ایک پیچیدہ مسئلہ ہے ۔جو بے قت بھی چھن سے ماغ میں وارد ہوجاتے ہیں ۔البتہ راقم اگرانتخاب موضوع کے معاملے میں مصنف اگر چابک دستی اور ذہانت کا ثبوت دے تو بسیار نویسی ،زود گوئی ،یاوہ گوئی کی علت سے گریز کرتے ہوئے اہم اور حساس موضوعات پر قلم اٹھا سکتا ہے ۔جس سے نہ صرف طنز و مزاح پرمبنی تحریر کی مقبولیت ومعنویت میں اضافہ ہوگا بلکہ اس مصنف کا ادبی قد بھی بلند ہوگا۔

انشائیہ میں گو آزادیٔ تحریر اور موضوعاتی تنوع کی گنجائش کمال کی ہے ۔مگر کہانیت کا سرا ہاتھ سے کہیں پیچھے چھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔البتہ سارا زور بیاں موضوع سے انصاف کرنے نیز اس کی جہتوں سے شگفتگی پیدا کرنے کی نذر ہوجاتا ہے ۔انشائیہ وہ صنف سخن ہے جو مصنف کی ہمہ جہت صلاحیت اور توجہ کا مستحق اور شگفتگی کا متقاضی ہے ۔قارئین نے کہانیت کے فقدان کو لے کر جو زبانی کلامی تبصرے فرمائے ہیں ۔میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں اوران کی تفریح طبع کے لئے کہانیوں میں طنز ومزاح اور ظرافت کے مہین فقروں کے ذریعئے تحریر کو دلچسپی اور ترسیل کے وصف سے مرصع کرنے کی ہر چند کوشش کی ہے ۔البتہ میں اس کاوش میں کہاں تک کامیاب وکامران رہا ہوں ۔میں اس کا فیصلہ جملہ قارئین ،ناقدین مبصرین اور ماہرین کے ذمے سونپتا ہوں ۔

میں اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں مالی تعاون فراہم کرنے والی سرکاری ونیم

www.urduchannel.in

سرکاری اکائیوں جیسے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی ،حکومت اتر پردیش ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،نئی دہلی کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی کا بے حد ممنون ہوں ۔جن کی مالی اعانت کے بغیر ان کتب کی تصنیف ،ترتیب وتدوین نیز طباعت واشاعت تنہا میری گنجائش میں ممکن نہ تھی ۔

زیرِنظر کتاب میں درج بالا تمام تر معیار و کسوٹیوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کی نیز مذکورہ عیوب سے اجتناب کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے ۔اس کوشش میں احقر کس قدر کامیاب ہوا ہے اس کا فیصلہ میں ارباب میزان ،اہل نقد ونظر اور جملہ قارئین کو سونپتا ہوں ۔امید ہے کہ انسانی اعضاء کی منفرد ومزاحیہ پیشکش ،روزمرہ کے عام مشاہدات ،احساسات ،تجربات اور رجحانات کی پر مزاح عکاسی قارئین کو حظ وفرحت فراہم کرے گی ۔

کامیابی کسی واحد عامل کی سزاوار نہیں ہوتی بلکہ ہمہ جہت عوامل کا مرکب ہوتی ہے ۔میں اپنے قارئین ،خیر خواہوں اور تنقید نگاروں کا ممنون ہوں جن کے گرانقدر مشورے ،پذیرائی اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کیلئے آمادہ کیا ۔میں مقامی تمام انجمنوں کے صدور واراکین کا بھی ممنون وسپاس گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تخلیقات پیش کرنے کی اجازت دی اور اس پر مجھے اپنی آراء سے مستفید کیا ۔اسی طرح ان تمام اخبارات ورسائل کے مدیران کا بھی ممنون ہوں ۔جن کی بروقت اشاعت کے سبب احقر کی تخلیقات کو عوامی ترسیل نصیب ہوئی ۔

اخیر میں اس کتاب کی ترتیب وتدوین ،کتابت وطباعت نشر واشاعت اور پیشکش کے سلسلے میں اپنے تمام بہی خواہوں ،خیر اندیشوں اور مخلصین کا بصمیم قلب ممنون ہوں ۔جن کی دعاؤں اور نادر مشوروں کے سبب زیرنظر کتاب کی تکمیل ہوسکی ۔

احقر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔**شہزاد بخت انصاری (شب انصاری)**

۶۹۔ چچا چھکن کا وصیت نامہ

پروفیسر امتیاز علی صاحب جنہیں ہمارے کالج کے تمام طلبا مذاقاً امتیاز علی تاج کے مشہور کردار 'چچا چھکن' کے نام سے ہی یاد کرتے تھے اور کبھی کبھی اسٹاف کے دیگر پروفیسر بھی بطور غائبانہ تخاطب اسی عرفیت کے ساتھ کرتے تھے۔ گو چچا چھکن اب اپنے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اب وہ یکمشت وظیفہ یابی کا مزا اور بڑھاپے کی سزا کا لطف لے رہے تھے۔ کالج میں نئی نسل انہیں یکسر بھول چکی تھی۔ پرانی پود انہیں بھلانا پائے بھی تو ان کی انمٹ یادگاروں اور لافانی مکالموں کے سبب بھلا نہیں سکتی تھی۔ ان کے ذکر سے ہی چہروں پر شرارتی تبسم ابھر آتا ہے۔ خوئ قسمت کہ چند سال مجھے ان کی نیابت (نگرانی) میں کچھ سیکھنے، روزانہ مشفقانہ ڈانٹ سہنے اور اس کا عادی بن جانے کا زریں موقع بھی میسر آیا تھا۔ ان کی ایک چبھتی ہوئی عادت بلکہ وطیرۂ خاص بقول مومنؔ یوں تھا جو نا قابل برداشت تھا۔

؎ کہتے تو ہیں بھلے کی لیکن بری طرح

ایک روز ان کا نادر شاہی پیغام ان کا پرانا وفادار ملازم جمن میاں لے کر کالج میں حاضر ہوا۔ ایسا محسوس ہوا کہ دل نے اچانک چھلانگ لگا کر گلے میں پھنس جانے کی ٹھان لی ہے۔ اب صورتحال یہ تھی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ بلکہ مجھے اپنے پائے استقلال میں ایک ہلکا سا ارتعاش سا محسوس ہوا۔ میں نے پرچی پر نظر ڈالی اور جمن کو اشارہ کرکے کہا ''شام کو کالج سے لوٹتے وقت آجاؤں گا۔ ان سے ضرور کہہ دینا۔''

دل و دماغ میں ہزار اندیشے سر ابھار رہے تھے طبیعت متذبذب بلکہ الجھن کا شکار تھی۔ میں فری پیریڈ میں کینٹین کے ایک تنہا گوشے میں جا بیٹھا۔ میں نے گرم چائے کی چسکیاں لیتے

www.urduchannel.in

وقت اپنی تمام غلطیوں کو کھنگال کر، الٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔ جب کوئی بڑی عزت باختہ فاش غلطی نہ تلاش کر سکا۔ تو وہی روایتی جملہ زبان سے ادا ہوا ''جو ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔۔۔''

شام کو میں نے کالج سے فارغ ہوتے ہی چچا چھکن کے دولت کدے کا رخ کیا۔ موصوف کا شمار کامیاب، خوشحال، متمول حیثیت کے اشخاص میں ہوتا ہے۔ چچا چھکن کے دو بیٹے عین الدین اور معین الدین ہیں۔ عین الدین کسی سرکاری بینک میں مینجر ہے۔ معین الدین سکریٹریٹ میں ڈپٹی سکریٹری ہے۔ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش اور اپنے والد گرامی کے مزاج کے مطابق اپنے شوہروں پر راج کرتی ہیں۔ یہ وصف خاص انہیں وراثت میں ملا ہے۔ میرا اور چچا چھکن کا ساتھ پچھلے چند سالوں کا تھا۔ جب میں کالج میں نیا نیا لکچرر مقرر ہوا تھا اور موصوف شعبۂ صدر کے عہدے سے ترقی پا کر اب ریڈر بن چکے تھے۔ ان کے نادر شاہی مزاج سے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ان کی اہلیہ کئی سالوں سے چھوٹے بیٹے معین الدین کے ساتھ بمبئی میں رہتی ہیں۔ گویا جان بچی تو لاکھوں پائے۔ اس طرح ان کی ساری نگرانی اور دیکھ بھال اب جمن میاں جنہیں خود سہارے کی ضرورت تھی۔ ان کے ناتواں کاندھوں پر آ گئی۔ بے چارے دم سادھے، بال بچوں کی صورت دیکھ کر، مجبوریوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے یہاں دن، ہفتے، مہینے، سال بلکہ عمر کاٹ رہے ہیں۔

جب میں نے اوپری منزل پر واقع ان کی آرام گاہ میں داخل ہوا تو چچا چھکن آنکھیں موند کے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک خاص تشنج تھا جسے میں بخوبی سمجھتا تھا۔ چونکہ یہ تشنج درد اور غصے کی آمیزش کے آثار کا نتیجہ تھا۔ اس وقت وہ بالکل تنہا تھے۔ جمن میاں مجھے کمرے کی دہلیز تک ایسے چھوڑ گئے تھے گویا جیسے مردے کے عزیز اس کا ساتھ قبر کے دہانے تک چھوڑ جاتے ہیں اور

لکم دینکم ولی یدین

کے مصداق ہاتھ سے مٹی بھی جھاڑ جاتے ہیں۔تھوڑی دیر تک تو میں ان کے بستر کے قریب ادب سے کھڑا رہا کہ وہ آنکھیں کھولیں تو مخاطب کروں۔ پھر ہار کر مجھے ہی پہل کرنی پڑی۔''سر! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔''

میری بات سن کر چچا چھکن نے آنکھیں کھولیں۔ان کی آواز میں لرزہ تھا۔''اب میرا آخری وقت قریب آچکا ہے۔تم میرے سب سے معتبر اور وفادار ساتھی ہو۔اسی لئے تمہیں بلا بھیجا۔زحمت تو نہیں اٹھانی پڑی؟''

میں نے انکساری سے کہا۔''سر! میں اسے اپنی سعادت جانتا ہوں۔''

میں نے دولت کدے میں داخل ہوتے ہی عین الدین سے ان کے حال احوال دریافت کر لئے تھے۔چونکہ مجھ میں یہ ہمت نہ تھی کہ میں راست چچا چھکن سے استفسار کر سکتا۔

میں نے ہمت مجتمع کیا اور کہا۔''یہ دنیا فانی اور جسم تو عارضی قالب ہے۔جسے کبھی نہ کبھی تو ترک کرنا ہی پڑتا ہے۔''

وہ کمزور آواز میں کہنے لگے۔''میں نے ساری زندگی یہی تعلیم دی ہے۔ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ صرف پچھتر سال۔سوچ رہا ہوں کہ باقی ماندہ عمر میں گوشہ نشینی کا بھی تجربہ کر لوں۔جو بڑے بڑے اولیا،صوفیا اور پیر صاحبان کی عادت رہی ہے۔بلآخر سادات ہوں۔''

میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔میں سوچ رہا تھا کہ موت تو چچا چھکن کے سر پر کھیل رہی ہے اور چچا چھکن ہیں کہ شوخیوں سے باز آنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔

انہوں نے کہا۔''مجھے موت سے بڑا خوف آتا ہے۔''

میں نے دل میں سوچا چچا چھکن ہمارا دم نکالتے تو ذرا بھی نہیں چوکتے تھے آپ؟ اب ذرا ملک

www.urduchannel.in

الموت کو بھی ڈرا دھمکا کر مرعوب کر بتائیں۔ذرا منکر نکیر پر بھی نادر شاہی حکم چلا کے بتا دیں۔ڈرتے کیوں ہیں؟ مگر میری زبان خاموش اور چہرہ افسردہ تھا۔

میں نے کہا۔''سر! آپ قطعی دل چھوٹا نہ کریں۔مرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔''

انہوں نے پہلو تبدیل کیا اور کہا۔''ارے ہاں! میرے تکئے کے نیچے کچھ کاغذات رکھے ہیں۔ان میں میرا وصیت نامہ ہے۔میں کل اس کی رجسٹری یہیں گھر پر کر چکا ہوں۔ایک نقل کورٹ میں ہے۔دوسری نقل یہ ہے۔اسے نکال لو صرف تم ہی دنیا میں میرے سب سے قریبی،قابل اعتبار اور بھروسہ مند ساتھی ہو۔میں نے کل ہی تمام رشتہ داروں اور عزیزوں کو ٹیلیگرام اور فون کال دے کر بلوا لیا ہے۔جن کے سامنے اس وصیت نامے کا ذکر ہو جائے کہ میرے بعد انہیں کیا کیا ملے گا۔اس وصیت کی تکمیل کے لئے میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔لہٰذا میں اس کی نقل تمہیں سونپتا ہوں۔ میرے وصال کے فوراً بعد اس وصیت کا اطلاق ہو جائے گا۔''

جب مجھے کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے رسمی سا جملہ ادا کر دینے میں عافیت جان۔''سر! آپ کے بڑے احسانات ہیں مجھ پر۔''

یہ کہہ کر میں نے احتیاط سے ان کے تکئے کے نیچے سے تصدیق شدہ وصیت نامہ برآمد کیا۔ادھر میں نے وصیت نامے کے صفحات الٹنے شروع ہی کئے تھے کہ چچا چھکن کی آنکھیں الٹنا شروع ہو گئیں۔ میں گھبرا گیا۔دل میں چل رہی ساری ہلچل اور ساری شوخی کافور ہو چکی تھی۔میں نے بے اختیار جمن میاں کو بلند آواز سے پکارا۔جمن میاں نے فوری طور پر سرہانے رکھی بوتل سے زمزم کے قطرے ان کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔روح ان کے قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔تب تک عین الدین بھی آرام گاہ میں آچکا تھا۔ہم سب نے مل کر انہیں بستر سے زمین پر لٹا کر سیدھا کیا۔جمن میاں کو اشارے سے وہاں رکنے کی ہدایت کر کے میں اور عین الدین زیریں ہال میں جا رہے

تھے۔وصیت کے کاغذات کا پلندہ میرے ہاتھوں میں تھا۔عین الدین پوچھ بیٹھا۔’’پروفیسر صاحب یہ کاغذات کیسے ہیں؟‘‘

میں نے افسردگی سے جواب دیا۔’’یہ آپ کے والد ماجد کا وصیت نامہ ہے۔مرحوم کے قول کے مطابق اس کا اطلاق چونکہ فی الفور ہونا ہے۔لہذا اسے پڑھنا بہت ضروری ہے۔‘‘

عین الدین نے تشویش سے کہا۔’’ہاں جمن چچا کہہ رہے تھے کہ والد صاحب نے سب رجسٹرار صاحب کو گھر بلوایا تھا۔‘‘

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں پہلی ہدایت درج تھی۔’’میں سید امتیاز علی ولد ممتاز علی یہ حکم دیتا ہوں کہ میری تجہیز وتکفین نیز تدفین کے لئے درکار رقم مبلغ پچاس ہزار روپئے میں نے الماری میں علحدہ رکھ چھوڑے ہیں۔مجھے اپنی پشتینی قبرستان میں اپنے والد کے قدموں میں دفن کرنا۔اخراجات سے جو رقم بچے اسے بڑے بیٹے کو ادا کر دینا۔‘‘

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں دوسری ہدایت درج تھی۔’’میرے بعد تمام ذمہ داریاں بطور سربراہ خاندان اور بیٹیوں اور دامادوں کے حقوق کا خیال رکھنے والا میرا بڑا بیٹا عین الدین ہوگا۔‘‘

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں تیسری ہدایت درج تھی۔’’مجھے قبر میں وہی بیٹا اتارے جو پنج وقتہ نمازی اور متبع شرع ہو۔اگر یہ شرائط میرا ے بیٹے نہ ادا کرسکیں تو میرے بھانجوں،بھتیجوں اور بھائیوں کو یہ کام انجام دینا چاہئے۔‘‘

عین الدین زیرلب بڑبڑایا۔’’پنج وقتہ نمازی،متبع شرع اور بینک کی نوکری؟ یہ کیا مذاق ہے؟ ...ہاں؟ ٹوپی تو ہر دوسرے تیسرے دن میلی ہوجاتی ہے اور کیا سوٹ پر جچتی بھی ہے؟‘‘

تب میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔’’تب تو پچاس ہزار روپئے گئے آپ کے ہاتھ سے۔‘‘

www.urduchannel.in

میں نے جان بوجھ کر ضرب لگائی۔’’اب باری ہے معین الدین کی۔‘‘

جھٹ سے عین الدین نے احتجاج کیا۔’’وہ تو بڑا رشوت خور افسر ہے۔وہ کہاں سے بن گیا؟ پنج وقتہ نمازی اور متبع شرع؟‘‘

میں نے پرتشویش انداز میں سوال کیا۔’’پھر کون ہے؟ جو ان شرائط پر پورا اترتا ہو؟‘‘

عین الدین نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔’’ہاں ظفر ہے۔جو میرا چچیرا بھائی ہے۔نمازی بھی ہے حلیہ بھی متبع شرع والا ہے۔مگر نہایت جھوٹا،آوارہ،دغاباز اور گاہکوں کو پھانسنے کے لئے بڑی لمبی سی ٹوپی پہنتا ہے۔‘‘

میں نے سرگوشی کی۔’’ظفر تو مجھے بھی ایک مرتبہ پانچ ہزار روپیوں کا دغا دے چکا ہے۔لہذا وہ اس لائق تو ہرگز نہیں ہے۔‘‘

میں نے صلاح دی۔’’عین الدین تم تو ہمیشہ چکنے رہتے ہو۔مگر اتفاق سے تمہاری داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔جاؤ فوراً کسی حجام سے ترشوا کر متبع شریعت والا حلیہ بنالو اور لوٹتے وقت ایک عدد ٹوپی بھی پہن لینا۔‘‘

میری بات سنتے ہی عین الدین کمان سے تیر کی طرح نکلا اور میری ہدایت پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔لہذا عین الدین کے جانے کے بعد جب میں نے چوتھی ہدایت پڑھی جس میں درج تھا۔’’میں سید امتیاز علی ممتاز علی یہ چاہتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اس کی خبر میری بیوی،بچوں عین الدین اور معین الدین کے علاوہ میری تینوں بیٹیوں اور دامادوں کے علاوہ میرے تینوں بھتیجوں،ظفر الدین،زین العابدین اور زین العابدین کو بذریعہ فون یا تار دی جائے۔دیگر رشتہ داروں کو خبر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ان تمام رشتہ داروں کا انتظار کم از کم بارہ تا چوبیس گھنٹے کیا جائے۔اس کے بعد حسب حال میری تجہیز وتکفین وتدفین عمل میں لائی جائے۔جس دن

میرے دہم (دسواں) کی رسومات ہو جائیں ۔اس وقت یہ تمام رشتہ دار جمع ہوں ۔تب میری وصیت کا بقایہ حصہ پڑھا جائے ۔''

مجھے چچا چھکن کی شخصیت عجیب و غریب ہونے میں کبھی دورائے یا تذبذب کا شائبہ نہ تھا۔ مگر اب یہ وصیت خاصی دلچسپ ہوتی جا رہی تھی ۔ چونکہ مجھے ہی ان تمام شرائط کی پابندی سے عمل درآمد کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔لہذا میں نے وصیت نامہ تہ کیا اور اسے جیب میں ٹھونس لیا۔ اب مجھے فکر اور تشویش اس بات کی تھی کہ چچا چھکن کی لاش آئندہ چوبیس گھنٹوں میں کہیں زیادہ خراب نہ ہو جائے ۔نصف گھنٹے میں عین الدین نئے متبع شرع والے حلئے میں موجود تھا۔اس کے سر پر ایک اونچی ٹوپی بھی تھی ۔جو اس کے سادات ہونے کی نمائندگی کر رہی تھی ۔

تب میں نے عین الدین کو اگلی ہدایت کے بارے میں خبر دی ۔'' آپ فون اور تار کی مدد سے جملہ سگے رشتہ داروں کو (جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔) ان کے انتقال کی خبر دے دیں ۔ایک برف کی سل بھی چاہئے تا کہ اس پر لاش رکھی جا سکے ۔ دوسرے روز صبح نو بجے موصوف کا جلوس جنازہ قبرستان جائے گا۔میں صبح ساڑھے سات بجے پہنچ جاؤں گا۔''

دوسرے روز میں علی الصبح تیار ہو کر جب چچا چھکن کے دولت کدے پہنچا ۔تو تقریباً سارے ہی رشتہ دار و اقارب جن کا ذکر آ چکا ہے موجود تھے ۔مزید برآں ہر شعبۂ حیات سے بہت سے ہمدرد، شناسا، طلبا، علمائے کرام اور امیر کبیر اور ایوان سیاست سے بھی نمائندگی کرنے والے بہت سارے لوگ موجود تھے ۔کیا شاندار جلوس جنازہ تھا۔امیروں کی میت کو کاندھا دینے کے لئے بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانا ہم اہل مشرق کا وطیرہ ہے ۔حالانکہ اب اس سے کسی فائدے کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔وہ بے چارہ تو خود اب دوسروں کی دعاؤں اور ایصال ثواب کا متقاضی ہے ۔ غریب کے جنازے میں بادل نخواستہ یوں راستہ طے ہوتا ہے گویا پیچھے سے دھکے دئیے جا رہے

ہوں ۔لہذا باوجود بہت سارے عذر کے قبر میں عین الدین ہی اترے ۔

رفتہ رفتہ دس دن بعد دہم کی رسومات کے بعد وہ موقع بھی آ پہنچا ۔جب وصیت کا باقیماندہ حصہ پڑھا جانا تھا اور مجھے اس پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ داری ملی تھی ۔نیچے کے ہال میں تمام سگے رشتہ دار جمع میرے منتظر تھے ۔ چچا چھکن کی بیوہ شیرین، عین الدین، معین الدین، بیٹیاں نازنین، نسرین اور نیرین اور ان کے شوہر جو حسب معمول اپنے بچوں کو سنبھالے بیٹھے تھے ۔یہ تمام انگریزی آمیز اردو میں گفتگو کے عادی تھے ۔ایک طرف تینوں بھتیجے بھی صوفوں پر قطار کی شکل میں بیٹھے تھے ۔میں اس وقت خاصہ سنجیدہ تھا۔ چچا چھکن کی وصیت پر عمل درآمد کرنے کے لئے میں نے وصیت نامے کا بقایہ جسے میں اپنے گھر پر بھی دیکھ سکتا تھا۔البتہ اس سے دلچسپی کا پہلو ہاتھ سے جاتا رہتا۔لہذا میں نے گلا صاف کر کے ہدایت پڑھی ۔

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں پانچویں ہدایت درج تھی ۔''میری قبر میں اترنے والے وارث کی بیوی روزانہ صبح اٹھ کر پہلے نہا کر چھ ماہ تک گیارہ مجاوروں کا کھانا اپنے ہاتھ سے بنائے اور اسے پہنچانے کا کام وارث کے ذمے ہو گا۔''

عین الدین کی بیوی شبانہ نے منہ سکوڑ کر آنچل کی اوٹ سے احتجاج کیا۔''روزانہ صبح اس کڑاکے کے جاڑے میں اٹھ کر نہانا، کھانا بنا کر ہڈ حرام مجاوروں کو پروسنا ۔بڈھے کی بے سرو پا ضد پر میں اپنی جان کی بازی کیوں لگاؤں؟ میں پہلے ہی نزلے کی دائمی مریضہ ہوں ۔''

میں نے خاتون کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے بقایہ ہدایت مکمل کرنے پر اکتفا کیا۔جس کے مطابق ۔''اگر وہ خاتون اس ذمہ داری کو نبھانے سے انکار کر دے تو یہ دوسرے وارث کی بیوی کے ذمے دے دی جائے اور پچاس ہزار سے باقی ماندہ رقم بھی اسے ہی ادا کر دی جائے ۔''

www.urduchannel.in

عین الدین کو اپنے ہاتھ سے رقم پھسلتی محسوس ہوئی تو اس نے گھور کر شبانہ کی جانب دیکھا۔ مگر دم سادھے بیٹھا رہا۔

یہ سن کے معین الدین کی اہلیہ فردوس نے سنجیدہ اور بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''اباجی کی آخری خواہش کا احترام ناگزیر ہے۔ کیا ہوا اگر بھابھی جان کو نزلے کا مرض ہے تو میں اس کی پوری ذمہ داری اٹھاتی ہوں۔''

یہ سن کر شبانہ تڑپ اٹھی اور انگارے چباتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''بڑی آخری خواہش نبھانے والی بن گئی ہو؟ زندگی میں کبھی کھانا بنانا سیکھا تھا؟ یا اب بناؤ گی۔ بمبئی میں رہ کر ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہو یا ہوٹل سے مہنگا کھانا منگوا لیتی ہو۔ جورو کا غلام شوہر ملا ہے جو ہر بات میں سر جھکا کر کہنا مان لیتا ہے۔''

فردوس نے بھوں چڑھا کر صرف ہونہہ کہنے میں عافیت جانی۔ تب شبانہ نے ہاتھ نچا کر روایتی زنانہ انداز میں کہا۔ ''رہنے دو یہ احسان نہ کرو ہم پر۔ جہاں میں روزانہ چھ آٹھ آدمیوں کا کھانا پکاتی تو ہوں۔ مزید گیارہ کا بھی بنا سکتی ہوں۔ صرف چھ ہی مہینے کی تو بات ہے۔''

شبانہ نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''کہیں یہ تو نہیں لکھا ہے کہ گرم پانی سے نہایا جائے؟''

میں نے مسکرا کے انکار میں سر ہلا دیا اور کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ''شاید وہ یہ شرط عائد کرنا بھول گئے۔''

تو شبانہ نے بانگ دہل انداز میں کہا۔ ''تو پھر مجھے یہ شرط منظور ہے۔ اب آپ آگے پڑھئے۔''

فردوس بھی نہلے پر دہلہ جواب دینے کی تیاری میں تھی۔ مگر معین الدین کے تیور بدلے اور انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ یہ اختیار بھابھی جان کا ہے۔ البتہ بھابھی جان کا فردوس بیگم پر الزام غلط اور قابل گرفت ہے۔ میں خود گواہ ہوں کہ فردوس بیگم نے پچاس پچاس آدمیوں کا کھانا تیار کیا ہے۔ میں کہتا ہوں بھابھی جان کو اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں۔''

www.urduchannel.in

شبانہ بیگم بھی تڑپ کر چیخ اٹھی۔ ''میں اپنے الفاظ کسی صورت واپس نہیں لے سکتی۔ جو حقیقت تھی بیاں کر دی۔''

عین الدین نے مصالحت کے لئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں شبانہ کے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ اب آپ آگے وصت نامہ پڑھئے۔''

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں چھٹی ہدایت درج تھی۔ ''میں سید امتیاز علی ممتاز علی ساری حیات اپنی بیوی سے حد درجہ زچ رہا ہوں۔ نہایت ہڈحرام، آلسی، چٹوری اور لاپرواہ خاتون ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں نے دال، چاول اور ستو پھانک کر زندگی بسر کی۔ البتہ یہ حرامزادی مجھ سے چوری چھپے، ملائی، دیسی گھی کی مٹھائیاں اور مشہور ہوٹلوں سے کھانا منگوا کر کھاتی رہی۔''

تب شیریں بیگم نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''یا میرے خدایا۔۔۔ یہ سب لکھا ہے؟ اس بڈھے کھوسٹ نے میری خدمات کے عوض؟ میرے گھر والوں نے کیسے خبیث شخص کے پلے باندھ دیا۔ دن تمام سارے گھر کو ستاتا کر پڑوسیوں کا جمگھٹا اکٹھا کرنے والے بڈھے!۔۔ تجھے جہنم میں بھی جگہ نہ ملے۔۔۔۔''

عین الدین اور معین الدین نے اپنی والدہ کو ڈانٹا۔ ''امی جان! اباجی کو گالی نہ دیں ہاں آپ وصیت نامہ آگے پڑھیں۔''

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں ساتویں ہدایت درج تھی۔ ''میری موت کے بعد میری بیوہ کو اپنے بیٹوں پر انحصار کرنا ہوگا۔ جو ازلی زن مرید ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری بہوئیں اسے بھوکا مار دینے میں کوئی کسر نہیں رکھیں گی۔ اس سے زیادہ تکلیف خود اسے اپنی بگڑی ہوئی عادتوں کے سبب ہوگی۔ پھر بھی صلہ رحمی کی خاطر میں دو لاکھ روپئے اپنی بیوہ کے نام کرتا ہوں۔ جس کے منافع پر یہ با آسانی زندگی گذار سکتی ہے۔''

میں نے جوں ہی ساتویں ہدایت مکمل کی۔شیریں بیگم کے منہ سے اختیار سے نکلا۔"ہائے عینو کے
ابا!۔۔۔"

یہ کہہ کر ڈرامائی انداز میں وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑیں۔تمام خواتین نے انہیں گھیر لیا۔ہال میں بھگدڑ سی مچ گئی۔اچانک انہوں نے آنکھیں کھولیں اور چیخ مار کر فریاد کرنے لگیں۔"ہائے عینو کے ابا! تم تو جنت سدھارے اور مجھ بدنصیب کو اس جہنم میں مجھے کیوں چھوڑ دیا۔مجھے معاف کر دیں۔۔۔" پھر انہوں نے زور زور سے سینہ کوبی شروع کر دی۔میں حیران اور انگشت بدنداں کھڑا رہا۔

اب مجھے کڑوے لہجے میں فرض کی ادائیگی پر مجبور ہونا پڑا۔"یہ سب تماشے آپ بعد میں کرتے رہیں۔ابھی تو وصیت نامہ ہی پڑھا جا رہا ہے۔"

اس مرتبہ شیریں بیگم کی بیٹیوں نے بروقت مداخلت کی اور شیریں بیگم کو ڈانٹ کر خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں آٹھویں ہدایت درج تھی۔"میں سید امتیاز علی ممتاز علی اپنی بیٹی نازنین کے شوہر سکندر مرزا سے حد درجہ ناراض ہوں۔ایک ہفتہ قبل میں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ سکندر کے خلاف پانچ لاکھ روپئے غبن کی انکوائری کے لئے کمیشن بٹھائی گئی ہے۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سکندر مرزا بدعنوان اور رشوت خور ہے۔"

سب کی نگاہوں کی سمت سکندر مرزا کی سمت تھی۔سکندر مرزا بذات خود کاٹو تو خون نہیں کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔سکندر مرزا نے احتجاجاً سخت سست سنا کر دامادی کا رعب جھاڑنا چاہا۔"یہ بڑھا سدا کا بدمزاج اور بدزبان رہا ہے۔اب پتہ چلا کہ وہ مرنے سے پہلے پاگل بھی ہو گیا تھا۔چلو نازنین ابھی میرے ساتھ چلو۔میں ایک پل بھی اس چھت کے نیچے نہیں ٹھہر سکتا۔میرا یہاں دم گھٹ رہا

www.urduchannel.in

ہے۔"

نازنین بھی فوراً کھڑی ہو گئی۔لیکن بہن نے فوراً ہی طور پر ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا۔"پہلے پوری بات تو سن لو۔پھر چلی جانا۔"

نازنین نے آنکھ کے اشارے سے اپنے شوہر کو سرزنش کی۔جو بے چارہ سوڈا واٹر کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا تھا۔وہ بیوی کے ابرو کے اشارے پر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔مجھے یکلخت غالبؔ کا مصرعہ یاد آ گیا۔ ؎ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

دوسری طرف مردوں نے بھی بعد از اصرار ہاتھ پکڑ کے سکندر مرزا کو نچلا بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔بیوی کے آگے سارے سکندری اوصاف دھرے کے دھرے رہ گئے۔سب کا روئے سخن اب میری سمت تھا۔میں نے بھی اپنی ساری توجہ وصیت نامے پر مرکوز کر دی۔تب میں نے اس ہدایت کو مکمل کیا۔"اور اگر سکندر مرزا پر انکوائری کمیشن بیٹھتی ہے تو عین ممکن ہے کہ اسے سرکاری ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔شاید کڑی سزا بھی ہو جائے۔اس کے طفیل اس کی رشوت اور بدعنوانی کے نتیجے میں کمائی سیاہ دولت بھی ضبط ہو سکتی ہے۔لہذا میں نازنین کے لئے ایک لاکھ روپئے کی خطیر رقم وصیت کرتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی سارے ہال میں سناٹا چھا گیا۔سکندر مرزا اپنی خشونت مٹانے کے لئے بے نیازی سے چھت پر گھور رہے تھے۔نازنین کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو ٹپک رہے تھے۔خدا جانے یہ نازنین کے آنسو تھے یا مگرمچھ کے۔

شیریں بیگم کی طبیعت سنبھل چکی تھی تب انہوں نے بچوں کی طرح نازنین کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔مصنوعی لاڈ و پیار جتا کر سمجھانے لگی۔کوئی بات نہیں میری بچی! تمہیں تو ان کی عادات کا پتہ ہے۔وہ تو ایسے ہی تھے۔"

تب میں نے وصیت نامے کو آگے بڑھاتے ہوئے وصیت نامے میں موجود ہدایات میں ساتویں ہدایت درج تھی۔ میں اپنی دوسری بیٹی نسرین سے ہمیشہ مطمئن رہا ہوں۔ بہت سلیقہ مند اور فرمانبردار ہے میری بچی۔ اس پر خدا کا بے پایاں کرم ہے کہ اس کے شوہر تلمیذ الدین احمد نہ صرف کامیاب کاروباری ہیں بلکہ ان کی آٹے کی مل، دال مل ہے۔ وہ تو شکر کی ایجنسی کا مالک ہے۔ ان دونوں کے روشن مستقبل کے لئے مری پرخلوص دعائیں۔"

اب میں ڈرامائی انداز میں خاموش کھڑا تھا۔ تلمیذ الدین کے چہرے پر پس و پیش کے آثار تھے، وہ بھی بلآخر بنیا تھا۔

جب تلمیذ الدین کے ضبط کی دیوار ٹوٹ گئی تو اس نے سوال کیا۔ "وصیت کے اعتبار سے ہمیں کچھ ملے گا یا نہیں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں کندھے اچکا دیئے اور کہا۔ "یہ تو انہوں نے نہیں لکھا۔ وصیت کی آٹھویں ہدایت میں آپ کے لئے صرف دعائیں ہیں۔"

نسرین نے نوحہ خوانی کے انداز میں رونا شروع کر دیا۔ "اباجی ہمیشہ ہماری ترقی، خوشحالی، امیری اور کاروبار کی چمک دمک سے حسد کرتے تھے۔ بظاہر تو وہ ہماری خوشحالی کے گن گاتے نہیں تھکتے تھے۔ انہیں کیا پتہ کہ اس سال ہمیں بیس لاکھ کا نقصان ہوا ہے اور ٹیکس کی ریڈ میں بھی اچھا خاصہ جرمانہ (رشوت) دے کر جان چھوٹی ہے۔"

تلمیذ الدین احمد نے نسرین کو زور سے ڈانٹا۔ "ہزار بار تم سے کہا ہے کہ کاروباری راز ہر کسی کے سامنے نہیں کھولے جاتے۔ جو نقصان ہوا ہے وہ ہمیں ہوا ہے کوئی حرامزادہ اس نقصان کی تلافی کیوں کرے گا۔"

اب ہال کے ماحول میں تناؤ مزید بڑھ گیا تھا۔ چونکہ ہال میں موجود تمام افراد کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے سے نظریں چرائے۔۔ اپنے دل کا چور چھپائے ان تمام واقعات کے لئے دوسروں کو مورد الزام اور اپنے آپ کو پرلے درجے کا معصوم سمجھ رہے تھے۔ اچانک نیرین کے شوہر حق نواز فوج میں کرنل تھے۔ ہتھے سے اکھڑ گئے اور طیش میں آ کر کہا۔ "تلمیذ احمد صاحب! گالی گلوج کرنے کا بہت شوق ہو تو اپنے مزدوروں اور ماتحتوں کو دیں۔ اگر یہاں زبان کو لگام نہ دی تو گدی سے کھینچ لوں گا اور جبڑے توڑ دوں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری"

میں نے باآواز بلند کہا۔ "پہلے وصیت نامے کی خواندگی مکمل کر لی جائے۔ تب دل بھر کے آپس میں لڑیئے جھگڑیئے۔ اور ہاں اس سے پہلے مجھے نکل کر گھر جانے کی اجازت اور مہلت دے دیں پلیز۔"

مچھلی بازار کی مانند سرگوشیوں کا سلسلہ بڑی مشکل سے تھما۔ وصیت نامے میں موجود ہدایات میں نویں ہدایت درج تھی۔ "میں سید امتیاز علی ممتاز علی اپنی چھوٹی بیٹی نیرین کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ میرے منہ پر کالک مل رہی ہے۔ اس کے بال انگریزی میموں کی طرح کٹے ہوئے ہیں۔ فرفر انگریزی میں بات چیت کرتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مفت کوٹے سے ملنے والی شراب اور سگریٹ نوشی کا بھی لطف لیتی ہے، جس کا مجھے قطعی یقین نہیں۔"

مجھے پڑھتے پڑھتے رک جانا پڑا۔ ہال میں پھر سے نیرین کی چیخ ابھری۔ "یہ سب سکندر بھائی جان کی حرکت ہے۔ وہ ہمیشہ اباجی کے تنہائی میں کان بھرتے رہتے ہیں۔ میرے میاں کی ملازمت اور سہولیات سے جلتے جو ہیں۔ اسی لئے کبھی اباجی نے مجھے خود سے کبھی گھر نہیں بلوایا۔"

اسی وقت کرنل حق نواز غصے میں اٹھا اور سکندر مرزا کا گلا دبانے لگا اور کہہ رہا تھا۔ "کیوں بے سوٴر کے بچے! ہمارے یہاں آ کر وہسکی اور اسکاچ مانگ کر مفت اڑاتا ہے۔ سگریٹوں کے کارٹون اپنے

www.urduchannel.in

شب نور دیار | کلیات شب انصاری

گھر لے جاتا ہے اور ہمارے پیچھے بیٹھ یہاں آ کر بڈھے کے کان بھرتا ہے۔ چغلیاں کرتا ہے۔"
ادھر سکندر مرزا کی حلق سے ایک کریہہ چیخ برآمد ہو رہی تھی۔ "غوں۔۔۔غوں۔۔۔"
نسرین چیخی۔ "ہائے۔۔ ہائے یہ کیا ظلم ہے۔ عینو بھائی آپ کے ہوتے ہوئے آپ کے گھر میں میرے شوہر سے یہ سلوک؟ اباجی کیا اٹھے کہ مروت و محبت بھی اس گھر سے اٹھ گئی۔ ہائے۔۔۔ ہائے؟"
تلمیذ احمد، عین الدین اور معین الدین کی بروقت مداخلت سے کرنل حق نواز کو سکندر مرزا سے الگ کر کے بٹھا دیا گیا۔ تب سب میری طرف از سر نو متوجہ ہو گئے۔ میں نے گلا کھنکھار کے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "آپ تمام کو اس مقدس رسم و رواج کا پاس بھی نہیں ہے۔ بات بات پر لڑنا جھگڑنا پروفیسر امتیاز علی صاحب کے خاندان والوں کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے مرحوم کی روح کو کیا خاک سکون ملے گا؟ پہلے میں وصیت نامے کی خواندگی کا فریضہ مکمل کر لوں۔ تب آپ اپنے نئے پرانے حساب کتاب مل بیٹھ کر چکتا کیجئے گا۔ ابھی تک نویں ہدایت مکمل نہیں ہوئی ہے۔"
سب نے دوبارہ چپی سادھ لی۔ عین الدین نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ دیا۔ "پروفیسر صاحب آپ آگے بڑھیں۔"
وصیت نامے میں موجود ہدایات میں نویں ہدایت کا بقایہ حصہ یوں درج تھا۔ "لیکن اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ نیرین کے ساتھ کچھ ناانصافی ہو گئی ہے۔ ایک وفا شعار اور نیک بیوی ہونے کے حیثیت سے جو اس کے فرائض ہیں۔ انہیں وہ بخوبی انجام دے رہی ہے۔ میں کرنل حق نواز کو بھی قصوروار تسلیم نہیں کرتا۔ ہندوستان کی فوج میں کتنا بڑا اور بہادر کرنل ہے۔ چین کی فوج سے لڑا۔ پاکستان کی فوج کے دانت کھٹے کئے اور خوش قسمتی سے زندہ رہا اور غازی کہلایا۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ موت کا سایہ اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ شراب،

www.urduchannel.in

سگریٹ اور حرام کے گوشت جیسے مکروہات کو استعمال کرنا عیب نہیں جانتا۔ فضول خرچ بلکہ شاہ خرچ بھی ہے۔ اس کی جیب میں مہینے کی اخیر میں ڈھیلا بھی بچ نہیں رہتا۔ اگر وہ مر جائے گا تو ناحق میری پھول سی بچی اور اس کے بچوں کو در در بھیک مانگنے کی نوبت آجائے گی۔ لہذا میں ڈیڑھ لاکھ روپئے نیرین کے نام کرتا ہوں۔ جس کا منافع آٹھ فیصد منافع کے حساب سے بارہ ہزار روپئے سالانہ یعنی ہزار روپئے ماہوار مل جائے گا۔"
کرنل حق نواز یہ سن کر تلملا اٹھا۔ طنزیہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ "آفرین جی آفرین! اباجی آپ تو یقیناً جنت میں جائیں گے۔"
میں نے دیکھا کہ کرنل حق نواز اپنی جگہ سے اٹھے اور سکندر مرزا کو گلے لگا لیا اور طنزیہ لہجے میں مخاطب ہوئے۔ "میرے بڑے! سکندر مرزا بھائی جان! گستاخی معاف۔ خطا معاف۔ آپ کی کرم فرمائیوں کے عوض اس خبیث بڈھے سے ڈیڑھ لاکھ روپئے کی رقم ہاتھ لگی۔ مجھے تو اندیشہ تھا مجھے بھی دعاؤں یا بددعاؤں کے تحفے دے کر ٹال دیا جاتا۔"
نسرین نے برا سا منہ بنا لیا اور غصے میں رخ پھیر لیا اور تلمیذ احمد نے حق نواز کو گھور کر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ اس حرکت پر جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے کرنل حق نواز کو کھری کھری سنائی۔ "کرنل! آپ کو شرم نہیں آتی اپنے باپ داخل آنجہانی خسر کو خبیث بڈھا کہتے ہوئے۔"
پھر عین الدین نے اشارہ کیا۔ "آپ آگے بڑھئے پروفیسر صاحب!"
وصیت نامے میں موجود ہدایات میں دسویں ہدایت درج تھی۔ "میں سید امتیاز علی ممتاز علی یہ بات بخوبی جانتا ہوں کہ میرے ذہین بھتیجہ ظفر الدین کے پاس کوئی معقول آفس نہیں ہے۔ لہذا کوئی گاہک خود آ کر اس کے جال میں نہیں پھنستا۔ اسے گھوم پھر کر گاہک پھانسنے پڑتے ہیں۔ بجائے

اپنی ذہانت جھوٹ، چرب زبانی اور جعلسازی کے ظفر اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے پا رہا ہے۔
لہذا اسے جمن میاں کا کمرہ جو لب سڑک ہے اسے آفس کے لئے مستقل طور پر دینے کا اعلان کرتا
ہوں۔اس کے ساتھ ہی دس ہزار کی رقم بھی اس کے نام کرتا ہوں تاکہ وہ ایک اچھا سا خوبصورت
سائن بورڈ بنوالے اور ٹیلیفون اور فرنیچر کا بھی انتظام کرلے۔جو رقم بچ جائے اس سے اپنے پیشے
کے مطابق چند جوڑے سلوالے۔"

ظفر الدین نے آہستہ سے احتجاج کیا۔"ہمارے لئے صرف اتنا ہی؟"

اس پر معین الدین تلملا اٹھا اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔"پہلے اپنی حیثیت بنالو۔کچھ تجربہ حاصل کرلو۔
تب بمبئی آجانا تم جیسے نگینوں کی بمبئی میں بڑی مانگ ہے۔وہاں چند دنوں میں مالامال ہو
جاؤ گے۔"

مجھے دوبارہ ڈانٹنا پڑا۔"یہ تمام ضمنی اور فروعی باتیں بعد میں۔ابھی وصیت نامے کی خواندگی جاری
ہے"۔

ہاں تو وصیت نامے میں موجود ہدایات میں گیارھویں ہدایت درج تھی۔"میں سید امتیاز علی ممتاز علی
اپنے بھتیجے زین العابدین کی کامیابی سے بہت مطمئن ہوں۔جب ہائی اسکول میں ناکام ہو گیا تو
بغیر کسی پونجی کے کاروبار یعنی میدان سیاست میں آگیا۔جہاں وہ سیاسی لیڈروں کی چمچہ گیری
کرکے اپنے خوشحال معیار زندگی کے لئے بجٹ ہر ماہ جھٹک لیتا ہے۔البتہ اسے اس حال میں
قناعت کرنے اور خوشی بجائے رکن اسمبلی یا وزارت کی کوشش کرنی چاہئے۔میں اسے اپنی
خوشی سے پچاس ہزار روپئے دیتا ہوں تاکہ وہ اگلے چناؤ میں لڑ سکے۔اپنی مکاری، دغابازی، توڑ
جوڑ کی عادت اور غنڈہ گردی کے سبب نہ صرف اپنے صوبے ہی نہیں بلکہ سارے ملک کا سیاسی
رہنما ہو چاہئے۔"

www.urduchannel.in

یہ سننا تھا زین العابدین نے اپنی آنکھوں کے کنارے سے آنسو خشک کئے اور جذباتی انداز میں
رندھے ہوئے گلے سے مخاطب ہوا۔"چچا جان! آپ نے جو کچھ الزامات میرے کردار پر لگائے
ہیں وہ سراسر آپ کی معصومیت اور لاعلمی کے سبب ہے۔میں آپ کی مردم شناسی کی داد دیتا
ہوں۔میں آپ کے حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھتا ہوں۔صرف آپ ہی میرے سچے قدرداں نکلے۔"
میں نے ورق پلٹا۔وصیت نامے میں موجود ہدایات میں بارہویں ہدایت درج تھی۔"میں سید
امتیاز علی ممتاز علی اپنے عزیز زین الدین کی بہت عزت کرتا ہوں۔نرم گو، نرم گو، فرمانبردار اور
پڑھا کو بچہ رہا ہے۔اپنی جہد مسلسل کے بعد وہ ہائی اسکول میں عربی اور فارسی کا ٹیچر بن گیا ہے۔میں
اسے اپنی تمام کتابیں اور موقر رسالوں کی تمام شمارے اسے دیتا ہوں۔جن پر نئی جلد بندی کرکے
وہ نیچے کے ایک کمرے میں ایک کتب خانہ بنا دے۔اسے اختیار ہوگا کہ وہ اسی مکان میں آکر
رہے اور ساتھ ساتھ شیریں بیگم کا خیال بھی رکھے۔شیریں بیگم کی وفات کے بعد نیچے کا سارا حصہ سید
زین الدین کے نام ہوگا۔اگر شیریں بیگم کو زین الدین کے ساتھ رہنا نامنظور ہو تب وہ اپنے
بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ کہیں دور جا کر بس جانے کی مختار ہے۔اس صورتحال میں شیریں بیگم کی
حیات میں بھی نچلی منزل کا اختیار زین الدین کے پاس ہی ہوگا۔کتابوں کی جلد بندی اور کتب
خانے کے ریک بنوانے کے لئے میں دو ہزار کی رقم زین الدین کے نام کرتا ہوں۔"
یہ سن کر زین الدین صوفے سے اٹھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھکا کر کہا۔چچا جان کا حکم مجھے بسر
وچشم قبول ہے۔البتہ جلد بندی اور ریک کے لئے رقم خاصی قلیل ہے۔"
تب معین الدین نے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔(سرگوشی کے انداز میں)"کتے کو گھی کہاں
ہضم ہوتا ہے؟ جو ہزار، دو ہزار گھٹ جائیں مجھ سے لے لینا۔"
وصیت نامے میں موجود ہدایات میں تیرہویں ہدایت درج تھی۔"میں سید امتیاز علی ممتاز علی اپنے

ملازم جمن میاں کی خدمات سے بہت خوش ہوں۔ جو بیوی کی مجھ سے نجات پا کے بیٹوں کے ساتھ چلے جانے کے بعد بھی گذشتہ بیس برسوں سے میری خدمت کرتا رہا ہے۔ یہ کھانا تو میرے ہاں ہی کھاتا اور کپڑے بھی میرے ہی پہنتا۔ اپنی پوری تنخواہ دیانت داری سے بچا کر اپنے گھر بھیج دیتا ہے۔ میری وفات کے بعد اسے میرے تمام سوتی، اونی، ریشمی کپڑے اور شیشم کی بیش قیمت چھڑی بھی اسے دے دینا اس کے علاوہ جتنا بھی راشن اناج میوہ تیل اور کچن میں سامان ہے وہ تمام جمن میاں کو ہی دے دیا جائے اور وقت رخصت اسے سو روپئے ادا کر دئے جائیں۔ میری وفات کے بعد اگر میرے گھر کا کوئی فرد جمن میاں کو ملازم رکھنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ اس سے میرے راز نہ پوچھے۔''

شیریں بیگم نے گرجدار آواز میں جمن میاں سے پوچھا ''کتنا سامان ہے اسٹور روم اور کچن میں؟''

جمن میاں نے سر جھکا کر کہا ''بڑی مالکن! ایک بوری چاول، ایک بوری گیہوں، پانچ کلو شکر، ایک من گڑ، ایک ٹن گھی، دو کنستر تیل اور کچھ پانچ کلو کے قریب ستو ہوگا اور دالیں تو تھوڑی ہی بچی ہیں۔''

شیریں بیگم نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا ''ابھی چہلم کے وقت جو کھانا دیا جائے گا۔ اسی میں یہ اناج کام آئے گا۔ تب جمن میاں کو کہاں سے دیا جائے گا؟''

تب مجھے مداخلت کرنی پڑی۔ ''اس کا انتظام عین الدین کے ذمے ہوگا۔ جس کے لئے اسے پچاس ہزار میں سے باقیماندہ رقم ملی ہے۔ اگر عین الدین چاہیں تو یہ اناج وہ جمن میاں سے بازار کے نرخ کے مطابق خرید سکتے ہیں۔''

عین الدین نے جھنجھلا کر کہا ''پروفیسر صاحب! یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے آپ وصیت کا بقایہ حصے کی خواندگی مکمل کر لیں۔''

وصیت نامے کی اگلی ہدایت میں تمام افراد ہمہ تن گوش تھے۔

www.urduchannel.in

وصیت نامے میں موجود ہدایات میں چودھویں ہدایت درج تھی۔ ''میں سید امتیاز علی ممتاز علی اپنے مکان کی شکل میں غیر منقولہ جائداد، بینک میں جمع شدہ گیارہ لاکھ روپیوں کا بلاشرکت غیرے مالک ومختار ہوں۔ گیارہ لاکھ کی رقم اپریل مہینے میں میرے نام پر تھی۔ جس میں سود شامل کر کے اب یہ رقم مزید اضافی ہو چکی ہوگی۔ لہٰذا میری وفات کے بعد وصیت نامے میں درج شدہ رقموں کی تقسیم کے بعد جو رقم بچ جائے۔ اسے میرے زن مرید فرزندان عین الدین اور معین الدین میں مساوی تقسیم کر دی جائے۔''

میں نے ایک طائرانہ نظر ڈال کر مجموعی تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد کہا ''سر کے تحریر کردہ وصیت نامے کی خواندگی تو تکمیل کو پہنچی۔ اگر اجازت ہو تو میں فوٹ نوٹ بھی پڑھ لوں؟''

سب نے بے صبری سے حمایت کی۔

وصیت نامے میں موجود فوٹ نوٹ درج تھی۔ ''میں سید امتیاز علی اپنے معتبر ساتھی ممتاز علی پروفیسر شمشاد احمد آفاقی کا ممنون ہوں۔ تمہارا فریضہ صرف اس وصیت نامے کی میرے وارثین تک خواندگی تک تھا۔ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ باوجود تمام چہ مگوئیوں کے تم نے اپنا فریضہ جان پر کھیل کر بخوبی نبھایا ہوگا۔ اس وصیت نامے کا رجسٹریشن مقامی سب رجسٹرار کے دفتر میں ہو چکا ہے۔ اب تمہیں آخری زحمت یہ دوں گا کہ تم تمام وارثین کی دستخط اس وصیت نامے پر فوری طور پر حاصل کر لو اور اسے عدالت میں سب رجسٹرار کو پہلی فرصت میں سونپ دو۔ جہاں تک تمہارا اپنا تعلق ہے۔ تم ایک نہایت جذباتی شخص واقع ہوئے ہو۔ آخری نشانی کی شکل میں میں تمہیں اپنا سب سے عزیز سبز طوطا دینا چاہتا ہوں۔ جسے میں نے اولاد سے زیادہ لاڈ و پیار سے پالا ہے۔ جب تم عدالت سے آخری ذمہ داری بھی مکمل کر لو اپنا طوطا پنجرہ سمیت جمن میاں سے حاصل کرتے ہوئے جانا۔''

میں نے گھڑی دیکھی تو صبح ساڑھے گیارہ بج چکے تھے ۔میں اٹھ کھڑا ہوا اور تمام وارثین سے دستخط کی درخواست کی ۔''عدالت کھل گئی ہوگی ۔میں محترم پروفیسر سید امیتاز علی ممتاز علی صاحب کی وصیت ان کی ہدایت کے مطابق جمع کرواکے واپس لوٹتا ہوں ۔''

سب کام نمٹانے میں مجھے دو گھنٹے مزید سرف کرنے پڑے ۔میں چچا چھکن کی آخری سوغات طوطے کے پنجرے کی زنجیر تھامے خراماں خراماں قدم بڑھاتا اپنے گھر کی طرف چلا جارہا تھا ۔دل میں خیال آیا چچا چھکن اتنے امیر اور متوازن اور ٹھہرے ہوئے مزاج کے انسان بھی ہوسکتے تھے ۔ اس کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا ۔میں اپنی دھن میں مگن جارہا تھا تب پنجرے سے طوطے نے کہا ۔''تم بدھو ہو ۔''

میں چونک پڑا ۔آواز بالکل صاف طور پر کانوں میں ایسی گونجی گویا چرچ کا گھنٹہ ہو ۔میں نے تصدیق کے لئے جب پنجرے میں جھانکا تو طوطے 'اینگری ینگ مین' کے جارحانہ انداز اس بات کا ثبوت دے رہا تھا ۔میرے ذہن کے کسی کونے سے ایک محاورہ کلبلا کر زبان سے پھسل پڑا ۔''قاضی کے گھر کے چوہے بھی ہوشیار ہوتے ہیں ۔''

میں نے سوچا ۔چچا چھکن نے اتنی خطیر رقم گیارہ لاکھ روپئے ان لوگوں میں تقسیم کردئے ۔جن سے وہ حد درجہ ناراض تھے ۔جنہیں وہ دشنام طرازی اور برے القابات کا نشانہ بناتے تھے ۔البتہ میں جو ان کے لئے معتبر، بھروسہ مند ساتھی تھا ۔اس کے لئے ایک ڈھیلا بھی نہیں رکھ چھوڑا؟ اب مجھے چچا چھکن سے بالکل ہی الجھن ہونے لگی جیسی ان کی ماتحتی میں ہوتی تھی ۔اسی الجھن کا ردعمل یہ تھا میں تیز قدموں سے راستہ طے کرنے لگا

تب ہی پنجرے سے آواز آئی ۔''میں سادات میں سے ہوں ۔میں پروفیسر ہوں ۔''

مجھے اس لہجے میں چچا چھکن کا انداز صاف محسوس ہوا ۔ایسا محسوس ہوا کہ وہ طوطا نہیں چچا چھکن خود کہہ

www.urduchannel.in

رہے ہوں ۔میں خاموشی سے چلتا رہا ۔میری خاموشی کو حماقت سمجھ کر طوطے نے پھر وہی رٹا جو اس کی فطرت تھی ۔''تم بدھو ہو ۔''

اب اطراف کے راہگیر بھی حیرت سے مجھے سرتاپا اور کبھی پنجرے کی طرف حیرت اور عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔مجھے بڑی ہتک کا احساس ہوا ۔اب احساس محرومی بہت بڑھنے لگا ۔ پہلے تو چچا چھکن نے مجھے ٹھینگا دکھا آخرت کی راہ لی ۔اب اپنے عزیز طوطے کے ذریعئے میری تضحیک پر تلے ہوئے ہیں ۔وہ جب تک میرے ساتھ رہے گا ۔یوں ہی رٹ رٹ کر میری بار بار تضحیک کرتا رہے گا ۔میرے اندر کے ضمیر نے دھتکار کر ملامت کی ۔میں نے پوری آواز سے کہا ۔'' میں چچا چھکن کی ساری عمر عزت کروں گا ۔انہیں سادات بھی تسلیم کروں گا ۔مگر چچا چھکن نما طوطے کو دن رات ہرگز نہیں جھیل سکتا ۔میں نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور طوطے کو آزاد کردیا اور شکست خوردہ قدموں سے اپنے گھر کی راہ لی ۔یہ واقعہ آج بھی احتساب کی دعوت دیتا ہے ۔آخر میں بھی ایک پروفیسر ہی ٹھہرا ۔

۷۰۔ کراماتی لوٹا

فخرو میاں گورے چٹے، نازک مزاج، دھان پان شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے کام کاج کی کیا امید کی جا سکتی تھی؟ ان کا دن بھر چلنا پھرنا ہی ان پر گراں گذرتا تھا۔ شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ محنت مشقت تو ہونے سے رہی۔ لہٰذا گھر میں قدر و قیمت بھی ویسی ہی تھی جو عموماً شعرا حضرات کی پس پشت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے صدر بازار کے احاطے میں بالائی منزل پر آبائی رہائش تھی۔ وہ بھی باوا آدم کے زمانے کی ایسی کہ اب گری کہ تب گری۔ کوئی بھلا مانس اس میں دکان بیمہ کروائے بغیر تو کرائے سے نہیں لیتا تھا۔ یہ تو فخرو میاں ہی تھے جو اللہ توکل اس آثار قدیمہ کی نشانی عمارت میں بڑے حوصلے سے رہتے تھے۔ زیریں منزل پر دس دوکانیں تھیں جن سے کم و بیش ڈیڑھ سو روپئے ماہانہ آمدنی کرائے کی شکل میں وصول کر پاتے تھے۔ بس یہی ان کا اکلوتا ذریعۂ معاش تھا۔ کفایت شعاری اور سفید پوشی کے بھرم کے درمیان کا طرز حیات تھا۔

ایک روز جب کرسی پر نیم دراز فخرو میاں اخبار بینی میں مصروف تھے۔ بیگم نے مرزا کی بیوی کے جڑاؤ ہار اور کنگنوں کی تعریف کا ذکر چھیڑ دیا۔ فخرو میاں نے حسب معمول کوئی توجہ نہ دی اور بات سنی ان سنی کر دی۔ اب تو صابرہ و شاکرہ بیگم نے فرمائش کر ہی ڈالی کہ مجھے بھی بالکل ویسے ہی جڑاؤ ہار اور کنگن ہر قیمت پر چاہئیں۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ کفایت شعاری اور رقم جوڑ جوڑ کر، حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے طبیعت عاجز آ چکی تھی۔ لہٰذا تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق فخرو میاں کی بیوی نے یکلخت ڈھائی سو روپیوں کا مطالبہ کر ہی ڈالا۔ اتنی خطیر رقم تو فخرو میاں کو کبھی اپنی آنکھ سینکنے کی خاطر بھی نہ ملی تھی۔ ان کا دل اس مطالبے کی تاب نہ لا کر سوکھے پتے کی طرح کھڑکا اور جسم میں سر دلہر کے ساتھ جھرجھری سی آ گئی۔ حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے بڑی

مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ بیگم نے جب یہ کیفیت دیکھی تو کہا۔ ’’ڈرئیے مت! خاطر جمع رکھئے اگر آپ یہ رقم نہ دے سکے تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنے بھائی صاحب سے مانگ لوں گی۔‘‘

فخرو میاں بھلے ہی خواتین کے اس نفسیاتی حربے کو نہ جانتے ہوں لیکن خاتون خانہ کی اس میٹھی سی دھمکی سے تو واقف تھے۔ لہٰذا بڑے تیکھے سر میں جواب دیا۔ ’’اجی ہٹو! ڈھائی سو روپئے کے لئے بھائی کے آگے کیا جھولی پھیلاؤ گی؟ مجھ سے لے لینا۔‘‘

بیگم بھی فخرو میاں کی ہر کل سے واقف تھی لہٰذا اتنک کر بولی۔ ’’میاں جی! مجھے ڈھائی سو اپنی زندگی میں چاہئے۔ اپنی میت پر چڑھانے کے لئے نہیں۔‘‘

فخرو میاں نے ترکی باترکی جواب دیا۔ ’’اجی آپ آخر مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ اسی ہفتے یہ رقم مجھ سے لینا۔‘‘

بیگم نے ہاتھ نچا کر سوال کیا۔ ’’ہفتے سے آپ کی مراد کہیں سات مہینے ہیں یا سات سال؟ یا سات جنم تو نہیں ہیں؟‘‘

اب فخرو میاں تاؤ میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ غصے سے تمتماتے چہرے پر آنکھیں نکال کر مخاطب ہوئے۔ ’’آج سے ٹھیک ساتویں دن مجھ سے ڈھائی سو روپئے لے لینا۔ وہ بھی بالکل نقد۔ تم دیکھ لو گی کہ مرد کی ایک ہی زبان ہوتی ہے۔‘‘

بیگم نے ہوا میں ہاتھ لہرا کے ایک کا عدد انگلیوں سے ظاہر کیا اور کہا۔ ’’ہاں جی ہاں! مرد کی زباں ایک ہی ہوتی ہے۔‘‘

لیکن جب چار دن یوں ہی خواب خرگوش اور بے کار و بے سود منصوبہ بندی کی نذر ہو گئے اور رقم کا انتظام نہ ہو سکا تو تشویش بڑھتی ہی جا رہی تھی اور اعتماد کافور ہوا جا رہا تھا۔ سب سے بڑی بات کہ یہ مطالبے کی تکمیل سے زیادہ انا کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ سارا وقار اور آن، بان، شان نہ صرف اپنی بلکہ ساری مرد برادری کی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ان کو رقم دینے کے بلند بانگ دعوؤں اور وعدوں کے بعد بھی

www.urduchannel.in

اگر رقم کی ادائیگی نہ ہوسکی تو گھر میں کیا قدر و قیمت رہ جائے گی؟ بیگم کی نظر میں کیا وقعت بنے گی؟ اب تک اپنی واہ واہ اور تعریف کے سینکڑوں پل جو باندھے تھے۔چشم تصور سے انہیں یک بارگی دھڑام سے نیچے گرتے محسوس کر رہے تھے اور ان کی چھن سے ٹوٹنے کی آواز حواس پر چھا گئی تھی۔اگر کوئی اور فریق مقابلے پر ہوتا تو زیادہ سے زیادہ تعلقات پر حرف آتا، قطع کلامی و قطع تعلق پر بات ختم ہو جاتی اور فخرو میاں کا آئندہ وطیرہ یوں ہوتا کہ۔جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

لیکن یہاں تو معاملہ گھریلو محاذ کا تھا جہاں سے بیر لینا آسان نہ تھا۔جہاں بقول خاطر ہوشیار پوری۔

خاطرؔ یہ ہے بازیٔ دل　　　اس میں جیت سے مات بھلی

مقابلے میں سابقہ اپنی شریک حیات سے تھا۔جہاں رشتوں کی ڈور کچے دھاگے سے بندھی ہوئی تھی لیکن اس کی گرفت کا عالم یوں تھا۔بقول چچا غالب

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟　　　ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

رہ رہ کر کانوں میں وہی فقرہ گونج رہا تھا۔مرد کی زباں ایک ہی ہوتی ہے۔مرد کی زباں ایک ہی ہوتی ہے۔اب وہ اس منحوس گھڑی کو کوس رہے تھے جب مرزا کی ملعون بیگم کا تذکرہ چھڑ گیا تھا۔مزید ایک روز خدا خدا کر کے بیتا۔اب تو تشویش نے پیٹ کے مروڑ کی شکل اختیار کر لی تھی جو زیادہ باعث تشویش بات تھی۔چار و ناچار انہوں نے اپنے مشیر اور ہمراز و دمساز عزیز بھائی کو ڈرتے ڈرتے شریک راز کیا اور ڈھائی سو روپے بطور قرض اس احتیاط کے ساتھ طلب کئے کہ کہیں اس میں اپنی سبکی کا کوئی پہلو نہ نکل آئے۔

عزیز بھائی ذرا زندہ دل اور متمول شخص واقع ہوئے تھے۔انہوں نے شوخی کے انداز میں کہا۔"فخرو میاں! آپ تو صاحب جائداد اور ماشاءاللہ بڑے وجیہہ اور خوبرو ہیں۔ایسا کریں نکاح

www.urduchannel.in

ثانی کر لیں۔ڈھیر سارا جہیز، جائداد و زمین، مال و دولت اور ساز و سامان کے ساتھ اگر کسی امیر کی بیوہ کو بھی گوارا کرنا پڑے تو کیا برا ہے؟ ادھر ایک بیگم ناراض ہو جائے تو دوسری بیگم کے ساتھ رہ جائیے گا۔آپس کی جذبۂ رقابت میں دونوں آپ کی بہت خاطر مدارت کریں گی۔" اور حسب عادت زیر لب مسکراتے رہے۔

فخرو میاں نے تنک کر سوال کیا۔"عزیز بھائی! اماں یار آپ ہمارے دوست ہیں یا دشمن؟ ہم آپ سے کیا مطالبہ کر رہے ہیں اور آپ ہمیں کیا مشورہ دے رہے ہیں؟ ابھی جو آفت بیٹھے بٹھائے وارد ہو گئی ہے اس کا حل بتانے کی بجائے آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟ دونوں اتنے جوتے ماریں گی کہ سر کے بال بھی سلامت نہ رہیں گے۔"

عزیز بھائی نے ظرافت آمیز گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔"جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر مسلیں دو کم کیا اور دو زیادہ کیا؟ خیر مجھے کچھ وقت دیں۔میں انتظام کرتا ہوں۔"

فخرو میاں نے گڑگڑا کر کہا۔"عزیز بھائی! دو دن۔۔۔بس دو ہی دن ہیں۔"

آج آخری دن تھا۔وہ شام چند گھنٹوں دور تھی جب یا تو بیگم کے ہاتھ میں ڈھائی سو کی رقم رکھنا تھی یا ساری ہیکڑی سے ہاتھ دھو کر مرد برادری کی ساری عزت ناموس داؤ پر لگا دینا تھا۔یہ بات بھی سچ تھی کہ روپیہ نہ لانے کے جرم میں بیگم پھانسی یا سولی پر نہیں چڑھا دیتی۔بس ہنس ہنس کر تمسخر ہی اڑا دیتی تھی۔لیکن ان کی طنزیہ ہنسی کی کاٹ ابھی تصور میں ہی کلیجہ گھائل اور پیٹ میں مروڑ کی شدت میں اضافہ بھی کر رہی تھی۔اگرچہ عزیز بھائی کا شدت سے انتظار تھا لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔گویا

کوئی آہٹ، نہ اشارہ نہ سراب　　　کیسا ویراں ہے یہ دشت امکاں

فخرو میاں کا دل تھا کہ منفی و مثبت افکار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔کبھی برے برے اندیشے

خوفزدہ کرتے تو کبھی امید اور آس بھی بندھ جاتی تھی۔اسی گومگو صورتحال میں فخرومیاں چھت پر ٹہل رہے تھے۔جب گلہ سوکھنے لگا اور پیاس کی شدت میں اضافہ ہوا تو ملازم کو آواز دی۔مگر نوکر چھٹی پر تھا۔لہذا بیگم کو خود ہی پانی لے کر حاضر ہونا پڑا۔مشرق میں خواتین کو سب کچھ سہہ کر ہی تھوڑا سا پیار ملتا ہے۔وہ جلد بازی میں گلاس لا نہ سکیں چونکہ ابھی دھلا ہوا نہیں تھا۔پانی وہ پرانے تانبے کے لوٹے میں ہی لے آئیں۔لوٹا بھی وہی بے ڈھنگا، بدشکل اور پرانا جس سے فخرومیاں کو ازلی چڑ تھی۔چونکہ اس لوٹے کی ہئیت ایسی تھی گویا اس کا باپ ڈمرو اور ماں چلمچی رہی ہو۔

فخرومیاں نے بیگم کے ہاتھ سے خاموشی سے لوٹا لے لیا۔وہ شریف النفس تھے خواتین کی بہت عزت کرتے تھے۔وہ شوہر شوہر ہی کیا جو بیوی کی عزت نہ کرے؟ یہی ہماری تہذیب بھی ہے۔خیر۔انہوں نے سوچا آج اس لوٹے میں پانی مل رہا ہے یہی غنیمت ہے۔اگر میں چوں بھی کرتا ہوں تب بالٹی میں کھانا ملے گا تب کیا عزت و وقار باقی رہ جائے گا؟۔لہذا ابھی یہی بہتر ہے۔

انہوں نے غصہ پینے کے ساتھ پانی سے گلہ تر کیا۔اس وقت وہ منڈیر کے پاس کھڑے عزیز میاں کا راستہ دیکھ رہے تھے۔بڑوں نے پانی پینے بہت سے قانون وضع کئے اور ہم کو بھی سکھائے لیکن منڈیر کے قریب نہ جانے کی تدبیر بتانا غالباً بھول گئے۔نہ جانے کیسے وہ لوٹا ان کے ہاتھ سے پھسلا اور زمین پر آ گرا۔اپنی رفتار سے زمین کی طرف گرتے لوٹے نے نہ دائیں دیکھا نہ بائیں دیکھا۔
بس تیسرے منزلے سے زمین پر گرا۔کسی زمانے میں نیوٹن نامی خرافاتی شخص نے زمین کی کشش نام کی ایک طاقت ایجاد کی تھی۔یہ کہنے میں کیا تامل ہے کہ وہ ساری طاقت اس ناہنجار لوٹے میں سما گئی اور فخرومیاں تشنہ لب رہ گئے۔فخرومیاں کا چہرہ فق ہو گیا اور صورتحال یوں تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔سر بازار پرانا بھاری بھرکم پانی سے بھرا لوٹا گر جانا کوئی منہ کا کھیل نہ تھا۔نہ جانے یہ کراماتی لوٹا بلدیہ کے کس افسر کے سر پر گرے تو شہر کی منصوبہ بندی کے نقشے مرتب ہو جائیں؟ یہ تو اللہ ہی

www.urduchannel.in

جانتا ہے۔

شاید قدرت کو بھی یہی منظور تھا آن کی آن میں گلی میں شور وغل مچ گیا۔جب تک فخرومیاں دوڑ کے نیچے اترتے تب تک ایک بھیڑ اژدھام کی شکل میں ان کے آنگن میں گھس آئی تھی۔
انہوں نے دیکھا کہ اس بھیڑ میں ایک انگریز بھی ہے۔جو ایک پیر کو ہاتھ سے پکڑ سہلاتے ہوئے دوسرے پاؤں پر ناچ رہا تھا۔اسی کے پاس اس گستاخ لوٹے کو دیکھ کر فخرومیاں کی سمجھ میں سارا ماجرا آ گیا۔ماجرا کچھ یوں ہوا تھا کہ گلی میں گرنے سے قبل وہ البیلا لوٹا پہلے دوکان کے سائبان سے ٹکرایا۔وہاں ٹکراتے ہی اس نے انگریز کو غسل کروا دیا پھر جب اس ستم ظریف لوٹے کا دل نہ بھرا تو نیوٹن کی طاقت کے سبب اس کے بوٹ پر پوری شدت سے جا گرا۔جب اس انگریز کو یہ علم ہوا کہ یہ لوٹا جو کسی بم کی طرح اس کے پیر مجروح کر چکا ہے ان صاحب کا ہے تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔فخرومیاں کبھی برطانیہ نہیں گئے تھے، انہوں نے سوچا شاید انگریزوں کے ہاں گالیاں دینے کا یہی طریقہ رائج ہو گا۔

سوئے اتفاق اللہ کی رحمت بن کر عزیز بھائی نازل ہو گئے۔اگر لوٹا نہ گرتا تو وہ فخرومیاں کے لئے فرشتۂ رحمت کی حیثیت رکھتے۔مگر اب جو نئی مصیبت آن پڑی تھی کہ حواس جاتے رہے۔
انہوں نے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی معاملہ بھانپ لیا۔ایک نیک کام یہ کیا کہ دالان سے ایک کرسی کھینچ کر انگریز شخص کو عزت سے بٹھا دیا اور انکساری سے انگریزی میں مخاطب ہوئے۔’’آپ کے پیر میں شاید چوٹ آ گئی ہے۔آپ تشریف رکھئے۔‘‘
دوسرا ضروری کام یہ کیا کہ جتنے اشخاص تماشہ دیکھنے کی غرض سے آنگن میں گھس آئے تھے۔انہیں رفع دفع کیا۔

فخرومیاں نے اشارے سے عزیز بھائی کا شکریہ ادا کیا۔اس وقت تک عزیز بھائی بھی دالان کی

فرش پر ٹک گئے۔ انہوں نے فخرو میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں اس انگریز سے سوال کیا۔ ''جنٹلمین! کیا آپ اس شخص سے واقف ہیں؟''

اس شخص نے ناراضگی میں انکار میں سر ہلایا اور غصے میں گویا ہوا۔ ''جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں ایسے لاپرواہ شخص کو جاننا بھی نہیں چاہتا جو سرِ راہ چلتے راہ گیروں پر لوٹے سے وار کرے۔''

عزیز میاں نے مصنوعی استعجاب سے انگریزی میں کہا۔ ''آپ کو نہیں معلوم؟ یہ شخص بڑا خطرناک پاگل ہے۔''

انگریز نے عزیز میاں کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے اپنی رائے پیش کی۔ ''نہیں! میری دانست میں یہ خطرناک مجرم ہوسکتا ہے۔''

اگر اللہ تعالیٰ نے فخرو میاں کو آنکھوں سے خورد و نوش کی صلاحیت بخشی ہوتی تو یقیناً وہ عزیز میاں کو کچا چبا جانے میں ذرا بھی تامل و تاخیر نہ کرتے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ عزیز بھائی کا برتاؤ اتنا مختلف اور حیران کن کیوں ہے؟

انگریز نے عزیز بھائی سے سوال کیا۔ ''اب کیا کیا جانا چاہئے۔''

عزیز بھائی نے فوراً جواب دیا۔ ''پولس میں اس معاملے کی رپٹ لکھوانا چاہئے تاکہ اس شخص کو فوراً حراست میں لے لیا جائے۔''

انگریز نے سوال کیا۔ ''پولس اسٹیشن کہاں ہے؟''

عزیز بھائی نے تعاون کے انداز میں کہا۔ ''پاس ہی ہے چلئے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔''

انگریز رضامند ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں چلئے۔''

ابھی دونوں اٹھے ہی تھے کہ عزیز میاں نے انگریز سے درخواست کی۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پولس اسٹیشن جانے سے پہلے یہ لوٹا پچاس روپیوں میں خریدنا چاہتا ہوں۔''

www.urduchannel.in

انگریز یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے حقارت آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''اس پرانے تانبے کے دبے پچکے کباڑ کے لوٹے کا آپ کیا کیجئے گا؟''

عزیز بھائی نے حیرت سے سوال کیا۔ ''آپ اس تاریخی لوٹے کو کاٹھ کباڑ اور دبا پچکا کہہ رہے ہیں؟ میں تو آپ کو تعلیم یافتہ اور مہذب انسان سمجھتا تھا۔''

انگریز بے چین ہوگیا اس نے تعجب سے کہا۔ ''آخر کیا بات ہے اس لوٹے میں کچھ تاریخی اہمیت تو واضح کیجئے۔''

عزیز بھائی نے بھاری لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ایک تاریخی لوٹا ہے مجھے کامل یقین ہے کہ یہ وہی مشہور و مطلوب زمانہ اکبری لوٹا ہے جس کی تلاش میں دنیا بھر کے عجائب گھر پریشان ہیں۔ ملکوں ملکوں اس کی کھوج جاری ہے۔''

انگریز کا اشتیاق دو چند ہوگیا۔ آنکھیں کمال حیرت سے خود بخود پھیل گئی۔ وہ کچھ انہماک سے آگے کو خم ہوا اور کہا۔ ''اوہ! تو یہ بات ہے؟

عزیز بھائی نے اپنا بیان اسی لے میں جاری رکھا۔ ''جی ہاں جناب من! یہ سولھویں صدی کی بات ہے۔ بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست فاش کے بعد سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ سندھ کے بے آب و گیاہ صحراؤں اور نخلستانوں میں بھٹکتا رہا۔ جب بادشاہ ہمایوں کی پیاس کی شدت جان لیوا ہوگئی تو ایک برہمن نے اسی لوٹے سے پانی پلا کر بادشاہ ہمایوں کی جان بچائی تھی۔ ہمایوں کے بعد جب اکبر اعظم دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو انہوں نے برہمن کو تلاش کرکے اس سے وہی لوٹا حاصل کیا اور اس کے بدلے میں ایسے ہی سونے کے دس لوٹے بنا کر اس برہمن کی نذر کئے۔ یہ لوٹا اکبر اعظم کو بہت عزیز تھا۔ وہ ہمیشہ اسی لوٹے سے وضو کرتا تھا۔ تب سے اس کا نام اکبری لوٹا پڑ گیا۔ غدر کے بعد تک اکبری لوٹے کا خاندان مغلیہ میں استعمال کی سند دستیاب ہے۔ مگر اس

کے بعد جو یہ لوٹا لاپتہ ہوا ہے تو اب کہیں جا کر ہاتھ آیا ہے۔ کلکتے کے میوزیم میں اکبری لوٹے کا پلاسٹر ماڈل رکھا ہوا ہے۔ پتہ نہیں یہ بیش قیمت اکبری لوٹا اس شخص کے ہاتھ کیسے آگیا ہے؟ اگر میوزیم کی انتظامیہ کو علم ہو جائے تو فینسی قیمت دے کر اسے خرید لے جائیں گے۔''

یہ سننا تھا کہ انگریز نہایت مرعوب ہوگیا۔ سنتے سنتے اس کی آنکھوں میں استعجاب اور لالچ کا جذبہ غالب آچکا تھا۔ گویا وہ کوڑی کی شکل تبدیل کر کے پکوڑی کی ہیئت میں آگیا۔ اس نے تعجب سے عزیز بھائی سے سوال کیا۔'' تو آخر آپ اس لوٹے کو خرید کر کرو گے کیا؟

عزیز میاں نے انکساری سے کہا۔'' مجھے آثار قدیمہ کی اشیا اور نوادرات جمع کرنے کا شوق بہت عرصے سے ہے۔''

انگریز نے خوش ہو کر کہا۔'' تب تو ہمارے شوق مشترک ہیں۔ اتفاق سے مجھے بھی آثار قدیمہ کے نوادرات، سکے اور اشیا جمع کرنے کا شوق ہے۔ جس وقت یہ لوٹا مجھ پر گرا تب بھی میں اس دوکان سے تانبے پیتل اور کانسے کی قدیم مورتیاں ہی خرید رہا تھا'' کچھ بھی ہو لوٹا تو میں ہی خریدوں گا۔''

عزیز میاں نے اصرار کیا۔'' جناب! میں نے پہلے پیش کش کی ہے اس لئے میرا حق ہے۔''

انگریز نے کہا۔'' واہ! آپ کیسے خریدیں گے؟ اسے میں خریدوں گا۔ اس پر میرا حق ہے۔''

عزیز بھائی نے سوال کیا۔'' آپ کیسے حق جما سکتے ہیں؟''

انگریز نے جوش میں آ کر سوال کیا۔'' ضرور حق ہوگا! یہ بتائیے کہ اس لوٹے سے غسل آپ نے کیا ہے یا میں نے؟''

عزیز بھائی نے کہا۔'' آپ نے۔''

انگریز نے سوال کیا۔'' لوٹا آپ کے پیروں پر گرا تھا یا میرے؟''

عزیز بھائی نے کہا۔'' آپ کے''

www.urduchannel.in

انگریز نے سوال کیا۔'' اس لوٹے نے آپ کے پیر کے انگوٹھے کا بھرتا بنایا تھا یا میرے؟''

عزیز بھائی نے کہا۔'' آپ کے''

انگریز نے منطقی طور پر اپنی بات منوا لی اور کہا۔'' لہٰذا اسے خریدنے کا حق تنہا مجھے پہنچتا ہے۔''

عزیز بھائی بھی کہاں آسانی سے ہار ماننے والے تھے۔ انہوں نے کہا۔'' یہ فضول باتیں ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ جو اس کا سب سے زیادہ دام دے گا یہ لوٹا اسی کا حق ہے۔''

اب انگریز بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے تاسف سے کہا۔'' چلو یوں ہی سہی۔ آپ اس لوٹے کے پچاس روپے دے رہے تھے۔ میں سو روپے دیتا ہوں۔''

عزیز بھائی نے کہا۔'' میں ڈیڑھ سو روپے دینے پر تیار ہوں۔''

انگریز نے کہا۔'' میں دو سو روپیوں کی پیشکش کرتا ہوں۔''

عزیز بھائی نے کہا۔'' میں ڈھائی سو روپے میں خریدنے پر تیار ہوں۔''

یہ کہہ کر عزیز بھائی نے ڈھائی سو روپے فخرو میاں کے کرتے کے دامن میں پھینک دیئے۔ فخرو میاں ہونقوں کی طرح یہ عجیب و غریب کھیل دیکھ رہے تھے۔ یہ تمام باتیں ان کی عقل سے ماورا تھیں۔ وہ سراپا سوال بنے باری باری دونوں کی مقابلہ آرائی دیکھ رہے تھے۔ انہیں عزیز بھائی کی بالکل نئی عادات کا عل ہو رہا تھا جو اس سے پہلے ان کی نگاہوں سے اوجھل تھیں۔

اچانک انگریز کو جوش آگیا اس نے قدرے بلند آواز میں فیصلہ کن انداز میں کہا۔'' اگر آپ ڈھائی سو روپے دیتے ہیں تو میں پانچ سو ادا کرنے پر تیار ہوں۔''

عزیز بھائی نے بصد افسوس فخرو میاں کے دامن سے رقم یوں اٹھائی جیسے اپنے ارمانوں کی لاش اٹھا رہے ہوں۔ انہوں نے رشک کے انداز میں انگریز کے چہرے کو دیکھا اور کہا۔'' یہ لوٹا آپ کا ہوا اسے لے جائیے۔ میرے پاس ڈھائی سو روپیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔''

انگریز خوشی کے مارے اچھل پڑا۔اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔اس نے فوراً اپنے بٹوے سے پانچ سو روپئے کے نوٹ فخرو میاں کی طرف بڑھا دیئے اور جھٹ سے اس لوٹے کی طرف جھپٹا۔اس لے کر اپنے سفری بیگ میں کسی بیش قیمت شے کی طرح رکھ لیا۔اس نے فخریہ انداز میں خود کلامی کی۔"اب میں ہنستا ہوا خوش باش اپنے وطن لوٹ جاؤں گا۔میجر ڈگلس کی ڈینگیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔"

عزیز بھائی نے کہا۔"یہ میجر ڈگلس کون ہیں؟"

انگریز نے کہا۔"مسٹر ڈگلس میرے ہمسائے ہیں۔آثار قدیمہ کے نوادرات جمع کرنا ان کا بھی شوق ہے۔میری ان سے مقابلہ آرائی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔پچھلے برس جب وہ ہندوستان کی سیر کو آئے تو یہاں سے جہانگیری انڈہ لے گئے تھے۔"

فخرو میاں اور عزیز بھائی نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔"جہانگیری انڈہ؟"

انگریز نے معلومات افزا لہجے میں کہا۔"جی ہاں! جہانگیری انڈہ۔میجر ڈوگلس نے سمجھ رکھا ہے کہ وہی ہندوستان سے عجائبات اور نوادرات لے جاسکتے ہیں۔"

عزیز بھائی نے دوبارہ سوال اٹھایا۔"جنٹلمین! یہ جہانگیری انڈہ کیا بلا ہے؟"

انگریز نے وضاحت پیش کی۔"آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایک کبوتر نے نور جہاں کی نور الدین محمد سلیم جہانگیر سے ملاقات کروائی تھی جو بعد میں محبت میں تبدیل ہوگئی۔جہانگیر کے پوچھنے پر کہ تم نے میرا ایک کبوتر کیسے اڑا دیا؟ تب نور جہاں نے دوسرا کبوتر فضا میں اڑا کر دکھا دیا تھا کہ ایسے۔اس کے اس بھولپن اور معصومیت پر جہانگیر سو جان سے فریفتہ ہوگیا تھا۔اسی لمحے اس نے اپنے آپ کو نور جہاں کے ہاتھ بیچ کر دیا۔البتہ اس نے اس کبوتری کا احسان فراموش نہ کیا۔اس نے اس کبوتری کا ایک انڈہ بلوریں مرتبان میں محفوظ کر لیا۔جسے وہ اپنی نظروں کے سامنے

www.urduchannel.in

آویزاں رکھتا تھا۔بعد میں وہی انڈہ جہانگیر سے موسوم ہوگیا۔اس انڈے کو پچھلے سال دلی میں مسٹر ڈوگلس نے ایک مسلمان تاجر سے تین سو روپیوں میں خریدا ہے۔"

عزیز بھائی نے کہا۔"اچھا تو یہ بات ہے۔"

انگریز نے کہا۔"ہاں اب وہ ہزار کوشش کر لے مجھ سے سبقت نہ لے جاسکے گا،میرے پاس اب اکبری لوٹا ہے جو جہانگیری انڈے سے بھی ایک پشت پرانا ہے۔"

پانچ سو روپئے کی رقم وہ بھی اس ناکارہ ناپسندیدہ لوٹ کے عوض جسے ملیں۔وہ کیوں نہ خوش وخرم اور شاد وآباد رہے۔فخرو میاں کے دل میں پھوٹ رہے تھے کہ کہاں ابھی دونوں ان کے خلاف پولس اسٹیشن میں چالان اور رپٹ کی دھمکیاں دے رہے تھے اور کہاں یہ غیر متوقع پانچ سو روپئے کا مبادلہ بلکہ نعمت غیر مترقبہ انعام ہاتھ آگیا۔معلوم ہوتا تھا پورے ہفتے بھر کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کا ایک ایک بال خوشی سے کھڑا ہوگیا ہو۔فخرو میاں سے آخر رہا نہ گیا۔انہوں نے عزیز بھائی سے دریافت کر ہی لیا۔"عزیز بھائی! آپ یہ ڈھائی سو روپئے میری خاطر گھر سے لے کر چلے تھے؟ مگر یہ آپ کو کہاں سے ملے؟ آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے پاس تو......"

عزیز بھائی نے سر جھکا کر مسکرا کے کہا۔"اس راز میں صرف میرا خدا ہی شریک ہے۔خدارا اسے راز ہی رہنے دو۔پردہ نہ اٹھاؤ۔چونکہ پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا یا تو آپ اللہ سے براہ راست دریافت کرلیں یہ میرے منہ سے ادا نہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر عزیز بھائی اپنے مکان کی طرف چل دئے۔فخرو میاں نے لاکھ روکا مگر نہ مانے۔فخرو میاں نے گلی کے نکڑ تک پہنچنے تک آواز دی۔"لیکن آپ کہاں چل دئے؟ مجھے آپ سے کام ہے۔"

عزیز بھائی نے مختصر سا جواب دیا اور گلی میں مڑ گئے۔"دو گھنٹے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔"

فخرو میاں نے حیرت سے سوال کیا۔"دو گھنٹے کے بعد؟"

عزیز بھائی نے واپس اسی موڑ سے گردن نکال کر جواب دیا۔ ”قبلہ! ابھی آپ ایک گھنٹہ میری ذہانت کی تعریف کریں گے اور ایک گھنٹہ میری پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیں گے۔ اچھا پہلے اپنے پانچ سو سنبھال کر رکھئے مونچھوں کا تاؤ گرنا نہیں چاہئے۔“

مال اگر ذاتی ہو تو اسے سنبھالنے میں یک گونہ جذبۂ افتخار و ملکیت کو دخل حاصل ہے۔ جس سے انسان کو طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ فخرو میاں نے عزیز بھائی کی ہدایت پر عمل کیا۔ کچھ وقت سارے واقعات پر از سر نو غور کرنے میں صرف ہوا۔ جوں ہی ان کی نظر اوپر اٹھی۔ انہوں نے دیکھا کہ عزیز بھائی اپنی چھت پر بڑی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے ہیں۔

اس روز عزیز میاں رات دیر گئے تک چارپائی پر چادر لپیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دبے قدموں خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ اپنی بیگم کے تکئے کے نیچے چھوٹی سی چابی ٹوہنے کی کوشش کی۔ جب چابی مل گئی تو انہوں نے پلنگ کے نیچے صندوق کا تالا اتنے ہی احتیاط سے کھولا کہ آواز ذرا بھی نہ ہوئی۔ انہوں نے ایک مخصوص جگہ وہ ڈھائی سو کے نوٹ جیب سے نکال کر جوں کے توں رکھ دئے۔ ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کیا اور صندوق بند کر کے اسی جگہ لوٹا دیا اور چابی بھی۔ اس کے بعد سکھ کا ایک طویل سانس لیا اور ایک مکمل بھرپور انگڑائی لی اور میٹھی نیند بستر پر جا کر سو رہے۔ اس طرح فخرو میاں نے مرد برادری کی عزت و ناموس پامال ہونے سے بچائی اور خواتین کے لعن طعن سے بچا کر مردوں پر احسان عظیم کیا۔

www.urduchannel.in

۱۷۔ طبقہ واریت

سائنسدانوں، فلسفیوں اور وی پی سے پارسل بھیجنے والوں نے بنی نوع انسان کی اپنے اپنے طرز پر طبقہ واری تقسیم کر لی ہے۔ گو ان کے نقطۂ نظر اور اپنے اپنے فوائد کے اعتبار سے یہ تقسیم کچھ مفید بھی رہی ہو۔ عموماً اسے ہر حال میں برا ہی سمجھا جاتا ہے۔ سائنسی ایجادات اور فلسفہ کے میدان میں ہماری واقفیت بالکل اسی طرح ہے کہ بس کسی سے دریافت کیا گیا۔ ”بھئی تیرنا کتنا جانتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”کچھ افراد ہاتھ پیر مارے بغیر با آسانی ڈوب سکتے ہیں۔ ہم ڈوبنے سے پہلے بساط بھر ہاتھ پاؤں بھی ماریں گے۔“

جہاں تک وی پی سے مال منگوانے کا تجربہ ہے۔ ہم نے صرف وی پی سے مال چھڑوایا ہی چھڑوایا ہے۔ ایک دو مرتبہ کچھ ایسا مال چھڑوا بیٹھے کہ اگر اس کا ذکر یہاں کر دیں تو ہماری شبیہہ مشکوک ہو جائے گی یا ہمارا شمار احمدؔ کی بجائے احمق کے زمرے میں ہو جائے گا۔ خیر جہاں سب نے وہی غلطیاں کر دی ہیں تو ہم بھی اس سے کہاں باز آنے والے تھے۔ ہم نے انسان کی تقسیم دو طبقے میں کی ہے۔ جسے ہندی میں 'کو کرمانو' اور 'بلا رمانو' کہا جا سکتا ہے۔ یہ کام ہم نے جس مہارت اور چابک دستی سے کیا ہے کہ اس کی اہمیت سے فقط ہم ہی واقف ہیں۔ کہیں طبقہ واریت کے بہیمانہ اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ یہ نہ فرض کر لیں کہ ہم انسانوں پر جانوروں کی صفات کے اعتبار سے طنز کر رہے ہیں۔ البتہ اپنی صفائی میں یہ یاد دہانی بھی ہمارا فریضہ ہے کہ بھارت کی قدیم مذہبی کتب میں بنی نوع انسان کو مرد و زن ملا کر آٹھ طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ وہ طبقے بھی جانوروں کے نام سے ہی موسوم تھے۔ لہٰذا طنز تو تب بھی پیدا ہوتا ہے۔

ایک سیدھا سادہ طریقہ تو یہ ہے کہ کچھ لوگ بلیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کچھ افراد کتوں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ جتنا پیار شاید انسان کو کرلیں تو ساری نااتفاقیاں، حسد، جلن، بغض، عناد، کینہ، کپٹ، کدورت اور تنازعے پل بھر میں ڈھل کر صاف ہوجائیں۔ اشرف المخلوقات پر مبنی معاشرہ معرض وجود میں آجائے گا جہاں نہ پولس، نہ سیاست اور نہ عدالت ہوں گی۔ ہم بیک وقت کتوں اور بلیوں دونوں طبقات سے خوف کھاتے ہیں۔ کتے کے کاٹنے سے پیٹ میں چودہ یا اکیس انجکشن لینے پڑتے ہیں۔ بلی ٹھہری شیر کی خالہ۔ جس میں کچھ مروت یا انسانیت کے آثار کے بعد تمام اوصاف درندوں کے ہیں۔ بہر حال دونوں میں کون سا طبقہ زیادہ مہلک اور خونخوار ہے۔ اس پر رائے زنی میں تذبذب برقرار ہے جو حالات اور محسوسات کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے اور کھسیانی بلیاں ہمیشہ کھمبا نوچتی ہیں۔ اس مقابلے کا کبھی ہم فیصلہ نہ کرسکے۔ چونکہ کبھی دونوں سے ہمدردی اور نفرت بھی ہوجاتی ہے۔ کبھی کتے نے بلی کو پیچھے سے کھدیڑ دیا تو کبھی بلی بھی کبھی کھسیا کر کتے پر ایسے جھپٹی کہ کتا اپنی دم کو لنگوٹ بنا کر ایک سمت کو بھاگ نکلا۔ جیسے وہ سادھو جن کی پول کھل جائے پھر وہ محلوں میں کبھی نہیں پھٹکتے۔

ویسے ایک عام اندازے کے مطابق کتے اور بلی شاید ہی کسی کو پسند آتے ہوں۔ البتہ محاوروں کے استعمال میں بھی کچھ بلیوں کے تو کچھ کتوں کے محاوروں کو اپنی خالص فطرت اور پسند اور لہجے کی حدت، شدت اور موزونیت کے لحاظ سے بیان کردیتے ہیں۔ حضرت انسان اگر یہ اظہار مدعا بھی نہ کریں تو پارہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ دل کی آگ سرد نہ ہو تو نہ جانے کتنے دامنوں سے لپٹ سکتی ہے۔ یوں بھی کتے اور بلی کے استعاروں، معاف کیجئے گا محاروں کے استعمال سے وہ معصوم جانور ہتک عزت کا دعوی کرنے کی انسانی سطح تک نہیں گرجاتے ورنہ ان بے زبان، نادان اور غیر خواندہ جانوروں کا ادب میں کیا کام؟

www.urduchannel.in

اب ترقی یافتہ قوموں کا حال ہی دیکھ لیجئے۔ انگریز کتے بہت پالتے ہیں۔ انگریزی میمیں کتے کے ساتھ جس قسم کی انسیت، محبت اور دل آویزی سے پیش آتی ہیں کہ اچھے اچھوں کو کتا بن جانے کی حسرت دلوں میں کروٹ لے کر رہ جاتی ہے۔ انگریزوں کے ہاں تقریباً ہر دوسرے گھروں میں بلیاں بھی پالنے کا رواج ہے۔ بحسن خوبی ان سے بھی اسی قسم کا رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ جو کتوں کے ساتھ روا رکھنا ایک متمدن قوم کا شیوہ ہے۔

متمدن قوم میں کتوں اور بلیوں کی صورتحال ہمارے ملک کی بانسبت کافی مختلف بلکہ قدرے بہتر بلکہ قابل رشک ہے۔ کچھ حضرات کو متمدن کہلانے کا خبط جب حد سے سوا ہوجاتا ہے تو احقر کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے۔ منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے کہ پرانی کہاوت میں معمولی ترمیم کے ساتھ اگر یوں کہا جائے کہ 'ہمیں بتادو کہ کس کے کتے یا بلی کیسے ہیں؟ اور ہم بتادیں گے کہ وہ انسان کیسے ہیں'۔

عام رائے یہ ہے کہ بلی پالنے والے مرد و خواتین بے انتہا احمق ہوتے ہیں۔ ہمیشہ فکر و تردد، تشویش اور خلجان کا شکار نظر آتے ہیں۔ جلدی اپنے بارے میں نہیں کھلتے اور اپنی سرگرمیوں میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتے۔ ان میں مشکوک رہنے اور تذبذب کا شکار ہونے کی عادت ہوتی ہے۔ مگر وہ اسے ظاہر نہیں کرتے۔ ان میں کچھ اقتدار کے حریص بھی ہوتے ہیں۔ لہذا اقتدار کے حصول کے لئے کڑی سے کڑی آزمائش سے گذرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اپنے محدود دائرہ عمل کے سبب ان کی صحت متوازن ہوتی ہے۔ جب بھی وہ گفتگو کرتے ہیں تو اس کا پچاس فیصدی سے زائد حصہ بلی کی تعریف و توصیف، عادات و اطوار، محاسن و آداب پر منحصر ہوتا ہے۔ جس پر وہ داد طلب نظروں سے سامع کو ضرور دیکھتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان سے بھی تعریف اگلوا کر ہی دم لیتے ہیں۔

ان کے برخلاف کتے پالنے والے نرے مورکھ اور بڑے صابر اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔جس کا وہ بار بار مظاہرہ کرتے ہیں۔جہاں کتا منہ مارتا ہے اس کے گلے کے پٹے کے ساتھ کھنچے چلے جاتے ہیں۔مگر مطمئن ہونا بھی چاہیں تو کتا انہیں اطمینان کی دولت سے ایسے ہی دور رکھتا ہے جیسے وہ کتے کو پٹے میں گلے سے باندھ کر رکھتے ہیں۔پہلے خود کوئی اچھی بات کہہ لیتے ہیں پھر اپنی ہی بات کی حمایت میں دلائل کے ڈونگرے برساتے ہیں۔اسے دہرا دہرا کر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو متاثر کرنے کی ناکام کوشش میں بھی مصروف عمل نظر آتے ہیں۔آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کتا کوئی گیند یا چھڑی منہ سے پکڑ لائے تو کس ناز و ادا سے داد طلب ہیئت (POSTURE) میں مالک کے سامنے منہ اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔داد نہ ملنے پر مایوس ہو کے بلکہ منہ پھیر کر اپنی جگہ جا بیٹھتا ہے۔من وعن یہی حرکات وسکنات اور تاثرات آپ صاحب سگ کے چہرے بشرے پر بھی باآسانی دیکھ سکتے ہیں۔

کہیں آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ہم انسانوں کے مزاج کی ترجمانی کتے بلیوں کی عادات واطوار سے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔یہ تو گویا وہی بات ہوئی کہ چقندر کھانے سے خون بڑھتا ہے اور طوطے کا جھوٹا امرود کھانے سے زبان طوطے کی طرح فر فر چلنے لگتی ہے۔یہ ہمارا محض انکشاف ہی نہیں ہے کہ کتے پالنے والے،انسان اور کتے کے موازنے میں کیا کرتے ہیں اور فیصلہ بھی اپنے کتے کے حق میں سنایا کرتے ہیں۔لہٰذا برسبیل تذکرہ ایک مقولے کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔"جتنا زیادہ میں انسان کو جانتا ہوں۔اتنا ہی کتے سے پیار کرتا ہوں"۔بات اگرچہ گہری اور فلسفیانہ انداز فکر کی ہے مگر کہنے کا اسلوب بھی کرشماتی معلوم ہوتا ہے۔البتہ اس بات سے کتے پالنے والے کس قدر مسرور ہوتے ہیں کہ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہ جاتا۔

بعض آدم بیزار افراد کو کتوں سے بھلے کوئی رغبت ہو یا نہ ہو۔البتہ بنی نوع انسان کی

www.urduchannel.in

معمولی خامیوں اور غلطیوں پر بھی بھاری سرزنش اور لعن طعن اپنا ملی،اخلاقی،معاشرتی اور جبلیاتی فریضہ جانتے ہیں۔موقع ملتے ہی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے باز نہیں آتے۔لہٰذا اس قسم کے فقروں کو بہیمانہ فقرے تسلیم کرتے ہوئے درکنار کر دیں تو ان کے پاس حضرت انسان کے حق میں کہنے،سوچنے اور اظہار کرنے کے لئے کچھ نہیں رہ جاتا۔یوں تو بطور اشرف المخلوقات ہمیں اس قول پر غور کرنا چاہئے کہ آپ کو حضرت انسان کے مقابلے میں ایک کتا (خواہ کتنی ہی اونچی نسل اور دام کا یا بلفظ دیگر سگ لیلیٰ ہی) کیوں نہ ہو بہتر نظر آتا ہے۔تو کیا ایسا کہنے والے اپنا شمار انسانوں کے طبقے میں کیوں کر لیتے ہیں؟ کیوں وہ اپنی جبلت،فطرت اور عادت پر شاداں وناز اں ہیں؟ یا اپنی ذات گرامی کو اقدس جان کر،اپنے آپ کو فوق البشر فرض کر لیتے ہیں۔جس سے ان کو خود پسندی وخود ستائی جگ ظاہر ہو جاتی ہے۔

دوسرا قوی امکان یہ ہے کہ آپ اپنی ذات کو بنی نوع انسان میں ہی شمار تو کرتے ہیں۔البتہ کتوں کی بانسبت انسانوں کو پہچاننے کا نظریہ آپ نے اپنی ہی ذات گرامی،عادات واطوار (بھونکنے اور بعض اوقات کاٹنے) سے قائم کر لیا ہے۔یعنی اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جتنا آپ اپنے آپ کو جتنا جانتے ہیں۔اتنا ہی آپ کتوں کو زیادہ پیارا سمجھتے ہیں۔یہ خوبصورت اعتراف مزاح ضرور پیدا کرتا ہے۔جس سے یہ تو ظاہر ہے کہ آپ کتوں کو پسند کرتے ہیں۔البتہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا کتے بھی آپ کو پسند کرتے ہیں؟ اگر یہی بات ہے تو آزمائش شرط ہے۔آپ اپنے قول کی صداقت جاننے کے لئے کسی اور محلے میں رات میں مستانہ وار گذر جائیے۔کتوں نے دوران خون کی تیز گردش،پیروں کی ورزش اور دماغ کی چولیں نہ ہلا دیں اور رہا سہا بھرم بھی چکنا چور نہ کر دیا۔تب کہئے گا۔ہمیں یقین ہے کہ سارا فوق البشری کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔ساری شیخی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

تیسرا قوی امکان یہ ہے کہ آپ مجنوں ہوں۔ سگ لیلیٰ کو لپٹ لپٹ کر یوں خود فراموشی کی حد تک پیار کرتے ہوں کہ دنیا و مافیہا سے یکسر بے خبر ہوں۔ دنیا خواہ پتھر مارے، دیوانہ کہے یا گالیاں دیں۔ آپ اپنے کام سے کام یعنی سگ لیلیٰ سے باہم دست و گریباں لپٹے رہنا ہی پسند فرماتے ہوں۔

دراصل انسان بڑا انا پرست اور خود پسند واقع ہوا ہے۔ کتے کی وفاداری سے اس نے اپنی مطلب براری کا سامان پیدا کرلیا ہے۔ کتے کی وفاداری اپنی ذات کے لئے، کتے کا دم ہلانا اپنی ذات کے لئے، کتے کی فرض شناسی اپنی ذات کے لئے۔ البتہ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ انسان کی اناتسکین اہمیت کی حامل شاید نہ ہوتب بھی اس مادے سے صرف نظر کیا جائے تو بنیادی طور پر وفاداری سے کہیں زیادہ وقعت آزادی کی محبت کو حاصل ہے؟

رحم (بھیک) کے دو ٹکڑوں پر مسلسل دم ہلانے، تلوے چاٹنے اور پیچھے پھرنے والا کتا عظیم ہے، وفادار ہے کیوں؟ چونکہ دھتکارنے پر بھی لوٹ آتا ہے۔ دوبارہ تلوے چاٹتا ہے۔ طوطے کو پنجرے میں قید رکھئے، کھلائیے، پلائیے، جیسا آپ کہیں گے وہ دہرائے گا، رٹے گا۔ ایک دن پنجرے سے نکل جانے دیجئے۔ بس باغی ہو کر فرار ہو جائے گا۔ جب کہ ہر اشارے پر 'جی حضور' رٹنے والا طوطا ناشکرا اور بے وفا اور طوطا چشم ہوتا ہے۔ موقع پاتے ہی پنجرے سے ہمیشہ کے لئے فرار ہو جاتا ہے۔ پھر پلٹ کر وہ آپ کو کانی آنکھ سے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اپنے برتاؤ سے یہ کہتا ہے۔ ''کیوں صاحب! آپ ہی دنیا کا مرکز ہیں؟ اور آپ سے لگاؤ ہی نجات کا آخری راستہ ہے کیا؟''

کہاں گیا وہ کھلانا، پلانا، روٹی مرچیں، امرود اور وہ لاڈ و پیار جو ایک عرصے تک آپ نے اپنے چہیتے طوطے کے ساتھ روا رکھا۔ اسے بہر حال اپنی آزادی سے محبت ہے۔ جس کی خاطر زنجیر میں بندھا ہوا کتا بھی تھوڑی بہت جدو جہد تو کر ہی لیتا ہے۔

www.urduchannel.in

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آزادی کے لئے سونے کی زنجیر سے فرار طوطا از خود موت کے منہ میں چھلانگ لگانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یوں بھی جو طوطا ایک مرتبہ قید (غلامی) میں رہ چکا ہے۔ اسے طوطوں کی قوم ہرگز قبول نہیں کرتی۔ بلکہ اسے چونچوں سے مار مار کر ہلاک کر دیتی ہے۔ لہذا یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ غلامی کے نتیجے میں موت ہی مقدر ہے۔ طوطا بغیر محنت اور جدو جہد کے مفت رزق اور سونے کی زنجیریں اور مالک کی محبت توجہ اور خاطر مدارت کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کی ہی خواہش رکھتا ہے۔ کیا یہی اس کا فریضۂ منصبی ہے؟

طبقات کی تقسیم عموماً محنت کی اقسام کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ یعنی مالک اپنے ملازم کے کام لینے اور دینے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لحاظ سے ہم اگر کتے، بلیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے کئی دلچسپ جانور بھی شمار ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں پیشوں کی تقسیم ہے۔ مثلاً چاپلوس، مدح سرا، قصیدہ خواں، نائی، بھنگی، بہشتی، نوکر چاکر رئیسوں کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کتے بلیاں اور دیگر جانوروں کے بھی ملازم ہوتے ہیں۔ خاندانی کتے بلیوں کے بھی ملازمین ہوتے ہیں۔ راجہ کے پیچھے اس کا پلہ اٹھائے چلنے والا کوئی فخر و مباہات میں مبتلا ملازم ہوتا ہے تو کتے کے پیچھے پیچھے اس کا پلہ (پٹا یا زنجیر) تھامے چلنے بلکہ گھسٹنے والے کو بھی ملازم ہی قرار دیا جائے گا۔ خواہ وہ خود کو افلاطون جانتا ہو۔

؎ مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو۔

اسی طرح رانی کا دامن تھام کر ان کی پیروی کرنے والی خادمہ کو فخر محسوس ہوتا ہے۔ اسے فوقیت اور شان کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ جو لوگ پارکوں، باغیچوں اور ساحل سمندر پر کتوں کی زنجیر تھامے بڑے شاہانہ انداز میں تکبر کے ساتھ گھومتے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی اسی (ملازم کے) زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ بس نظریئے کی عینک تبدیل کر کے صحیح زاویۂ نگاہ سے فراخ دلانہ انداز سے

دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ مشاہد بھی بنی نوع انسان ہیں۔لہٰذا ایک کتابردار پہلے ایک کتابردار کو ہی دیکھتا ہے،خود کتے کو نہیں۔ہمارے نزدیک تو اس بات کی اہمیت ہے کہ ایک کتے کی زنجیر تھامے کلو بیرا ہے اور دوسرے کتے کی زنجیر تھامے ڈپٹی (کلکٹر) صاحب ہیں۔بھلے ہی کلو بیرے کی زنجیر سے شاہی نسل کا السیشین ڈاگ یا گریٹ ڈین ڈاگ بندھا ہو اور ڈپٹی صاحب کی زنجیر سے وابستہ نرا،بوچڑ ڈاگ ہو۔کتوں کو ذاتی طور پر اس نسلی تفریق اور طبقہ واریت کا نہ تو شعور ہے اور دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ہے۔کتے کتیاں تو پارک میں اپنے ہم جنس کو دیکھتے ہی بھونک کر یا تو مبارک سلامت دیتے ہیں یا گالی گفتاری اس کا تعین بھی ان کے اپنے ہمسفروں پر ہی چھوڑتے ہیں۔چونکہ کتوں کے نزدیک ان کے زنجیر بردار کبھی کسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔

شاید اسی لئے ہم مارکس وادیوں کو قائل ہیں۔انہوں نے اس قضیہ کا تصفیہ کر دیا ہے کہ الفاظ کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے۔معنی محض الفاظ کے سر تھوپا گیا الزام ہے۔جو طبقہ واریت سے مزین ہوتا ہے اور زیادہ زور بیاں جذبات کی ادائیگی کو دیتا ہے۔جیسے ہمارے معاشرتی رشتے ہوں۔من وعن وہی معنی ہمیں زبان بھی عطا کرتی ہے یا ہم زبان کو دیتے ہیں یا زبان سے نکالتے ہیں۔الفاظ و معنی پر مبنی ان کی یہ اساس اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اسے لسانیات میں نئے سائنس کا نام سیمینٹکس دیا جارہا ہے۔چونکہ معنی تو مستقل رہ نہیں گئے۔

اب دیکھئے ناں۔ہم کہتے ہیں دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔کہتے کہتے ہم اس بات کی توقع کر بیٹھے کہ ہماری بات اپنا مافی الضمیر ادا کر رہی ہے۔البتہ ہم اپنے قول سے ان جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ کتا کہیں کا نہیں رہ گیا۔اگرچہ ابتدا میں ہی واضح کر دیا جاتا کہ کتا دھوبی کا ہے تب بھی کسے کیا سروکار کہ آیا وہ گھر کا ہے یا گھاٹ کا؟ وہ تو بہر حال دھوبی کا ہی ہے۔اب ذرا کہاوت

www.urduchannel.in

گڑھنے والے انسان سے پوچھا جائے کہ کتے کا دھوبی کہاں کا ہے گھر کا ہے یا گھاٹ کا؟ دراصل وہ بھی علی الصبح چڑیا کی طرح کسب معاش کے لئے گھر سے بھوکے پیٹ نکل جاتا ہے اور مارامار اپھرتا ہے۔بلآخر وہ ایک محنتی انسان ہے۔اس لئے ہم نے اس کا الزام بیچارے کتے کے سر لگا دیا۔جو کبھی صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا،نہ اپنے دفع میں کھڑا ہوتا ہے،نہ کورٹ میں ہتک عزت کا دعوی کرتا ہے اور نہ ہی اس الزام کے انتقام کے اقدام ہی کرتا ہے۔

جی نہیں ہم بالکل نہیں بہکے اسی پٹری پر سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔یہ طبقہ واریت کی فکر کا نتیجہ ہے۔ایک مرتبہ کسی چیز کو دیکھنے کے انداز میں طبقہ واری تقسیم در آتی ہے تو ہر جگہ یہی علت نظر آتی ہے۔چونکہ جسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اسے بہر حال چار حصوں میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔اس طرح ہر حصے کے ضمنی حصے بنا کر اس سے اپنا فائدہ کس طرح کشید کیا جائے۔اس توڑ جوڑ کے ماہرین کا ایک ہی قول ہے۔"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" جو پچھلے ستر سالوں میں اپنے سابق آقاؤں کی سب سے کامیاب سیاسی حکمت عملی (مخفی سلوگن) یہی رہی ہے۔جسے جذبات کی چادر تلے در پردہ رکھا جاتا ہے۔آپ بھی جانتے ہیں کہ پیاز کو بہت زیادہ چھیلنے سے آخرکار کچھ ہاتھ نہیں آتا۔پرت در پرت تہہ اتار کر ہم صفر تک پہنچ جاتے ہیں پھر کف افسوس ملنے کے سوا چارہ نہیں رہ جاتا۔لہٰذا عقل مندی اس بات میں ہے کہ اب عمل معکوس اختیار کیا جائے اور ہم تو پرت پر پرت چڑھانے کے قائل ہیں۔تب سے ہم چاروں خانے چت پڑے ہیں۔دراصل تمام کھیل ذہانت اور نقطۂ نظر کا ہے۔ورنہ سب کچھ ایک ہی ہے۔انگریزی کہاوت "فائٹنگ لائیک کیٹس اینڈ ڈاگز" یعنی کتے بلیوں کی طرح لڑنا۔دراصل کتے اور بلی دونہیں بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔جن کی اساس پر یہ محاورہ استوار ہیں وہ ایک ہی ہے۔وہ ہے 'دم' جو دونوں کی کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

۷۲۔ خرگوش کے سینگ

بزرگوں نے ارشاد فرمایا ہے ”انسان میں حیوان سے صرف ایک قدر زیادہ ہے وہ ہے علم ورنہ وہ بغیر سینگ اور پونچھ کا حیوان ہی ہے۔“ علم تو عقل سے حاصل ہوتا ہے لیکن ہمارے طالبان علم جو کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کی حالت دیگر ہے۔ عنفوان شباب سے ہی انہیں پنکھ پھوٹ جاتے ہیں یا سینگ نکل آتے ہیں۔ ان کی حیات کا ایک نکاتی پروگرام اس خیال کے محور پر گردش کرتا ہے۔ البتہ احمقوں کی دلی کیفیت اس شعر سے بھی لمحہ بھر کے لئے تبدیل نہیں ہوتی۔

عشق نازک مزاج ہے بے حد　　عقل کا بوجھ سہہ نہیں سکتا

مستقبل قریب میں جھنجھنوں (راجستھان) کا عازم سفر ہوا۔ وہاں سنتا ہوں اکثر سیاح آتے ہیں اور بھٹک جاتے ہیں۔ البتہ میں باوجود ایک تجربے کے بھٹک نہ سکا۔ وہیں سڑک کے کنارے سینگ پر بڑی کاریگری سے کام کیا گیا تھا جو فٹ پاتھ پر برائے فروخت رکھا ہوا تھا۔ لہذا میں بھی اسے دیکھنے کے لئے رک گیا تھا۔ سینگ کی چھڑی، سارس، سانپ، گلدان، قلم، کھلونے اور خرگوش بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دل نے ایک خاموش چٹکی لی۔ سینگ کے خرگوش یا خرگوش کے سینگ؟ اکثر جو چیز ناممکن، نادر و نایاب ہو۔ اسے ریت سے تیل نکالنے یا خرگوش کے سینگ نکل آنے سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح غائب ہو جانے کے لئے گدھے کے سر سے سینگ کی کہاوت مشہور ہے۔

خوبئ قسمت کہ میری نصف پیشہ ورانہ حیات مارکیٹنگ کے پیشے میں گذری۔ جہاں مردم شناسی اور انسانی نفسیات سے کھیلے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا۔ جہاں کئی ڈگری اور پوسٹ ڈگری یافتہ احمقوں سے روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔ جنہیں کئی تلخ اور ترش تجربات کے بعد اتنی عقل سلیم تو یوں ہی آجاتی ہے۔ جیسے شادی سے پہلے تصوراتی محبوبہ اور شادی کے بعد ایک عدد (حقیقی) بیوی کے

www.urduchannel.in

امتیاز کی سمجھ ہو جاتی ہے۔ اسی خیال کی پختگی میں گمان ہوتا ہے یا یہ کوئی عجب نہیں کہ کہیں کسی روز یہ انکشاف سننے کی سعادت نصیب ہو جائے کہ خرگوش کو سینگ نکل آئے ہیں۔ اجی امید کرنا بھی کیا گناہ ہے؟ نہیں۔ امید پر تو دنیا قائم ہے۔ جیسے بیشتر اہل مشرق کے مذاہب کی مقدس کتابوں کے مطابق گائے کی سینگ پر دنیا قائم ہے۔ بہتری کی امید میں ہم نے بتدریج اس کائنات کا بڑے جتن سے ستیہ ناش کر دیا۔ ورنہ قدرت کے توازن کی کیا بات تھی!

جب خرگوش کے سینگ پر گفتگو چھڑ ہی چکی ہے تو ذہن میں کئی سوالات سر ابھارتے ہیں۔ آخر ان سینگوں کی افادیت کیا ہے؟ قدرت نے دو سینگوں کے درمیان (بین القرنین) کیا راز پنہاں رکھا ہے؟ کیا قدرت نے بین السطور کی طرح بین القرنین BETWEEN TWO HORNS میں کیا کوئی راز پوشیدہ رکھا ہے؟ یا کہ اس کی الجھن ناحق مول لے لی؟ نہیں۔ قدرت کی کاریگری کی دلیل تو علامہ اقبال نے بیان کر دی ہے۔ کہ کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں۔ جس سے سر مو انکار تو کجا انحراف بھی کفر کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ سستا سودا مجھ جیسے بے سینگ شخص کو قطعی گوارا نہیں جو صرف اک تبسم کے لئے کھلتا ہو۔

کہتے ہیں گائے کو سینگ بھاری نہیں ہوتے۔ یعنی بوقت مصیبت وہ ان سینگوں کی مدد سے اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ گینڈے کی تھوتھنی پر ایک نوک دار سینگ آگے کی طرف ہی ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر شہنشاہ جنگل کو بھی سر دلہر کی جھرجھری آجاتی ہوگی۔ لہذا میں مختصراً یہ نتیجہ اخذ کر سکا کہ سینگ لڑنے کا سب سے کارآمد ہتھیار رہا ہوگا۔ خاص طور پر ان جانوروں کے لئے جو پیروں کے بل مضبوطی سے کھڑے رہ کر سر سے اپنا دفاع کر سکیں (انسان اس وصف سے محروم ہے حالانکہ وہ بھی سنگھ یا سینہہ ہے)۔ بالفظ دیگر جن کا دماغ اس قدر ترقی یافتہ نہ ہو سکا کہ وہ بے چارے بہیمانہ داؤ پیچ یا اپنی کمال ذہانت سے دشمن کو زیر کر سکیں۔ لہذا بطور تلافی انہیں سینگ عطا کر دئے گئے ہوں

گے۔ ورنہ لومڑی، گلہری اور ریچھ وغیرہ کی قبیل کے تمام جانوروں کو بھی سینگ ہو سکتے تھے۔ یہی کام ہاتھی اپنے دانت سے اور پانی کا گھوڑا HIPPO اپنی کٹی ہوئی پونچھ اور بھاری بھرکم تھوتھنی سے لیتا ہے۔

قدرت کی حکمت عملی بھی قابل تعریف ہے کہ جوں جوں جانوروں میں تہذیب و تمدن در آتا ہے یعنی کھوپڑی میں عقل سرایت کرنے لگتی ہے۔ وہ سینگ کا استعمال بھی قدرے کم کر دیتا ہے۔ جو جنگلی ہرن، رینڈیر، نیل گائے، بارہ سنگھے (جن کے سر پر بااسم مسمیٰ درجن بھر سینگ قدرت نے کچھ مصلحت کے تحت ہی عطا کئے ہوں گے) تھے۔ وہ بعد میں بغیر سینگ کے پالتو جانور بن بیٹھے۔ جہاں کوہستانی علاقوں میں 'سینگ والے یاک' ہوتے تھے۔ وہیں میدانی علاقوں میں گھوڑے، گدھے اور خچر بغیر سینگ کے مال بردار اور بعض وقت مانس بردار جانور کا منفعت بخش کردار ادا کرتے ہیں۔

اس معاملے میں ہمارے فخرو میاں بھی قابل شمار ہیں۔ چونکہ (جسمانی طور پر) لڑنا بھڑنا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اگر ان کا غصہ اپنے نقطۂ اشتعال کو پہنچ جائے تو اٹھ کر پوری طاقت سے زمین پر دولتیاں پیچھے کی سمت جھاڑ کر کمال سادگی سے اپنا غصہ بھی جھاڑ لیتے ہیں۔ مگر وہ بے چارے اپنی معصومیت کے سبب معاصی (گنہگار) بھی نہیں ہوتے۔ جیسے درمیانی طبقے کی عوام جب اپنے آپ کو لاچار اور بے بس محسوس کرتی ہے تو گھر بیٹھے بڑی معصومیت سے بحر معصیت میں غوطہ زنی شروع کر دیتی ہے۔ حیرت تو اس امر پر ہے کہ اس عمل میں بھی مقابلہ آرائی اور علمی تفاخر کی قائل ہے۔ مثلاً غیبت، چغلی، برائی، حسد، منافقت، عیب جوئی، الزام و بہتان تراشیاں، تنقید کے اجزائے ترکیبی سے ایک ایسا شاندار، لذیذ، دیرپا، قابل تشہیر اور تیز رفتار SCANDAL تماشہ منظم طور پر تیار کرتی ہے تاکہ نادیدہ طور سینگ مارنے کی تعمیل ہو سکے۔ جس سے نہ صرف اس

www.urduchannel.in

جہان فانی میں ان کی پچھلی دولتیوں کا جواز بآسانی نکل آتا ہے بلکہ آخرت میں بھی دولتیوں کی ضمانت یقینی طور پر دی جا سکتی ہے۔ صرف اس استثنیٰ کے ساتھ کہ خدا مہربان اور گدھا پہلوان کا فرمودہ اپنا کام کر جائے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی ازلی عادات کے مطابق از سرِ نو اپنے آپ کو معصوم، مظلوم اور مقسوم جان کر منتظر فردا کی تصویر بن جاتی ہیں یعنی دوسروں سے بہتری کی توقع رکھتی ہیں۔

جانوروں میں سینگ پہلے بلند رہا ہوگا۔ بعد میں جنگل میں چھپے رہنے کے لئے ایک خول اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ندارد ہونے لگا۔ البتہ ہمارے ہاں توفی زمانہ بھی گائے، بھینس اور ان کے شوہر نامداروں میں سینگ برداری کا رواج موجود ہے۔ ورنہ یورپ کے ناروے، سویڈن میں بغیر سینگ کی گائیں ہوتی ہیں۔ جوں جوں بدلتے عہد کے ساتھ جانوروں میں ترقی ہوئی یعنی سر کے اندر کے حصے (عقل) سے زیادہ کام لینے لگا تو قدرت نے ان کے نمائشی ہتھیار بھی کم کر دئیے۔ البتہ ایٹم بموں کے جدید عہد میں ہمیں ناممکن سے ناممکن ایجادات و انکشافات سے بہرہ ور ہونے کا عادی ہونا چاہئے۔ لہٰذا اگر خرگوش بہت خوبصورت، ننھے ننھے بکری کی مانند سینگ سے ایک دوسرے سے الجھنے لگ جائیں تو حیرت کی کیا بات ہے؟ بے چارے خرگوش کے دل میں بھی تو بکری کے نوک دار سینگ دیکھ کر دشمنوں کو زیر کرنے کی حسرت پیدا ہو سکتی ہے کہ دیکھیں ہم سینگ اگ جانے یا پہن لینے کے بعد کتنے سورما، بہادر اور جارح نظر آتے ہیں۔

مذکورہ شوق میں بنی نوع انسان بھی وقتاً فوقتاً سر پر ٹیڑھی تکونی ٹوپی پہن لیتا ہے یا سینگ دار پگڑی پہن کر اپنی جبلیاتی جذبات کی تسکین حاصل کرتا ہے۔ ناٹک، ڈرامہ، تماشوں اور رام لیلاؤں میں نقلی سینگ لگا کر نندی بیل کا کردار نبھانے والا بھی احمق سوالات کے ایسے پرمزاح جواب دیتا ہے کہ طنز تو پیدا ہوتا ہی ہے ساتھ مزاح کی چاشنی کا بھی لطف آجاتا ہے۔ جس سے سینگ بردار کا کردار عیاں ہو جاتا ہے۔

سینگ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے مرد و خواتین اسے اپنے سر پر سجا کر بھلے نہ گھوم سکتے ہوں۔ البتہ نام کا دم چھلہ ضرور بڑی مرغوبیت کے ساتھ بنا لیتے ہیں۔ یوں بھی ہندوستان میں 'سینگ' نام اس قدر پسند کیا گیا کہ اسے سینہہ، سنہا، سنگھ کی عرفیت کے ساتھ ناموں کا لاحقہ بنالیا گیا۔ شتریہ، راجپوت، سکھ، کسان، لوہار الغرض ایک کثیر المکاتب طبقے کے ہاں باعث صد افتخار ہے۔

سینگ کا استعمال جسم میں درد کے علاج کے لئے بعد سینگ میں سوراخ کر کے رفع درد کے لئے بدن پر لگاتے ہیں۔ جسے پچھنا لگوانا یا حجامہ بھی کہتے ہیں۔ سینگ کے سرے سے مہنگے ترین کوٹ کے بٹن تیار کئے جاتے ہیں۔ انسان نے سینگوں کو بگل بجانے کا بھی اوزار بنا رکھا ہے۔ جنگ میں ہتھیار اور اوزار حرب و ضرب کے ساتھ ایک آلۂ بے ہنگم موسیقی یعنی بگل بھی ہوتا ہے۔ جس کی آواز سے یہ مرحلہ آغاز کیا جاتا ہے۔ سینگ یا بگل یونان کے کئی دیوی دیوتاؤں کا مستقل ہتھیار رہا ہے۔ جب انسان کی عقل بھی پختگی کی طرف مائل ہوئی تو اس نے سینگ کے کھوکھلے پن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سینگوں کا استعمال بطور 'تھرماس' بھی کیا جو برفیلے علاقوں میں بڑا کارگر ہوتا ہے۔ بہت سارے مہذب اور تعلیم یافتہ افراد اپنے دیوان خانوں میں بطور آرائش و زیبائش جانوروں کے سینگ سجا کر رکھتے ہیں۔ جب اس سینگ سے بھی حسرت پوری نہ سکتے ہوں تو اپنے یا دوسروں کے شکار کئے ہوئے جانوروں کے سینگ سمیت سر دیواروں پر آویزاں کر کے اپنی بہادری کا ثبوت دیتے ہیں۔ جن پر از خود ہیٹ ٹانگنے، تمغے، کوٹ، پینٹ اور دیگر اشیا لٹکانے کی افادیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

نپولین بوناپارٹ کے قول کی صداقت اگر قرار واقعی تسلیم کر لی جائے کہ اپنی ڈکشنری سے ناممکن کا لفظ نکال دیا جائے۔ تب تو خرگوش کو سینگ ضرور اگیں گے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ میں

www.urduchannel.in

نے ایک نان کرپٹ (غیر رشوت ستاں) کسٹم آفیسر دیکھا ہے۔ فیشن سے مستثنیٰ کالج کی طالبہ دیکھی ہے۔ اپنے ملک کی عیب جوئی، نکتہ چینی اور مخالفت نہ کرنے والا سچا سماج وادی شخص دیکھا ہے۔ جس کے ہاں علاقائی، لسانی، مذہبی، طبقہ واری، تہذیبی و تمدنی تعصب بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ خواہ پنجابی، بنگالی، گجراتی، مدراسی، کشمیری، راجستھانی، مراٹھی کسی بھی ریاست کے شخص کو دل سے صرف ہندوستانی جانتا ہے۔ اور انیکتا میں ایکتا UNITY IN DIVERSITY کا قائل ہے۔ ابھی میرا یہ اعتبار قائم ہے کہ قدرت کے پردۂ خفا سے نت نئے کرشمے، انکشافات اور انہونیاں باہر آنے کا دور جاری ہے۔ اسی طرح ابھی خرگوش کے سینگ نکل سکتے ہیں اور دنیا میں خوشحال زندگی بسر کرنے کے قابل ابھی بہت امید کا سامان موجود ہے۔ جس دن خرگوش کے سینگ نکل آئیں گے وہ کچھوے سے دوڑ کی شرط لگانے کے تفاخر کی بجائے۔ دیر آید درست آید کی تاثیر سے اپنے مقررہ ہدف تک پہنچنے کی حکمت عملی کو پالے گا۔ نوجوان طبقہ خرگوش کی طرح الہڑ، شوخ، تیز رفتار، چنچل ہوتا ہے۔ لہٰذا کبھی کبھار وہ مئی کے خرگوش کی طرح حماقتیں بھی کر بیٹھتا ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار کی حدود خواہ وہ گھر، اسکول، کالج، عام مقامات کے اور بیرون شہر اور ممالک کے فرائض منصبی کو سمجھ لیں۔ تب تو ان کی خواہشات کے اڑے جارہے کاغذوں پر پیپر ویٹ رکھا جا سکتا ہے۔ بے قابوندی سے استفادے کی خاطر باندھ باندھے جاسکیں۔ ورنہ یہ کاروان شباب جہاں سینگ سمائے وہیں روانہ ہوتا رہے گا۔

۷۳۔قانونی شیر

کورٹ میں وکیل کو قانونی مشیر بھی کہتے ہیں۔ دراصل 'م' حذف کر دیا جائے تو یہی وکیل قانونی شیر بن جاتا ہے۔ پھر کاغذوں کے جنگل میں فریق مخالف پر اپنا شب خون مار کر اس کا شکار تو خوب کرتا ہے مگر گوشت اپنے ہی مؤکل کا کھا جاتا ہے اور اپنے ہی مؤکل کے ارمانوں کا خون بھی پی جاتا ہے۔ مگر کیا وکیل واقعی قانونی شیر ہوتے ہیں؟ مرے دوست کی رائے میں یہ بھینس کی کھال میں سفید پوش، قانون پیشہ وکیل برطانوی تسلط کے ساتھ ہی ہندوستان آیا تھا۔ جس کے دوغلے پن اور تعذیرات ہند کی بھول بھلیوں میں الجھا کر بے وقوف بنانے کے شعار سے تنگ آ کر، اپنے مؤکلین کے گھر پھونکوا کر تماشہ دیکھنے کی عادت کے سبب برطانوی وائسرائے نے انہیں عذاب کی شکل میں ہمارے سروں پر مسلط کر کے راتوں رات راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت جانی۔

مسلمان سلاطین کے عہد میں چھوٹے موٹے راجاؤں اور باج گذاروں کی طرف سے منشی، پٹواری یا مہاجن کی شکل میں چنندہ افراد ہی بادشاہ کے دربار میں ثالثی کرتے تھے۔ البتہ انصاف کی عدالت میں منصف کے سامنے مدعی اور مدعا علیہ کی طرف سے تنازعے میں پیروی مقدمے بازی کے داؤ پیچ سے ان سادہ لوح حضرات کو سروکار نہ تھا۔ دراصل وکیلوں کو باعزت پیشہ فراہم کرنے میں برطانوی سامراج کی بڑی گھناؤنی سازش پوشیدہ رہی ہے۔ جسے سچ پوچھئے تو ان ظالموں نے معزز پیشہ وکیل کہہ کر ہم بے گناہوں کے سروں پر انہیں مسلط کر دیا ہے۔ جنہیں بقول ہندی زبان کے میسحا ٹنڈن جی 'بھاڑ' اور بقول اکبر الہ آبادی یوں یاد کیا گیا ہے کہ

پیدا ہوا وکیل تو شیطان نے کہا　　لو ہم بھی آج صاحب اولاد ہو گئے۔

www.urduchannel.in

دراصل پہلے پہل انہیں برطانیہ میں بار ایٹ لاء کی تربیت کے زیر اثر کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے کرنے کا گر سکھایا جاتا تھا۔ اب دیسی طور پر یہی ساری تربیت ایل ایل بی (جس کے معروضی معنی لچا لفنگا بدمعاش سے بھی تعبیر کئے جاتے ہیں) کے مرحلے سے گذار کر بھی دے دی جاتی ہیں۔ البتہ اس میں ساری ہوشیاری، چوکسی، ذہانت اور پلٹ وار کرنے کی صلاحیت چوروں کی طرح جب تک پیدا نہ ہو تو فرض کر لیجئے کہ وکالت ہو چکی۔ باوجود اس کے یہ بڑا ناقابل اعتبار پیشہ ہے۔ جہاں مؤکل کو شک ہی نہیں بعض اوقات یقین ہو جاتا ہے کہ

مؤکلوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا　　کہ نہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے؟

یوں تو وکیل کو بھی تمام شعبۂ حیات میں مہارت ضروری ہے خواہ وہ سرکاری امور ہوں یا غیر سرکاری، معاشیات ہوں یا تجارت اس پیمانے کا علم لازمی ہوتا ہے۔ گویا اس بے چارے نے ساری حیات یہی کام کیا ہو۔ کبھی زمینداری کا رس بنا انگلی بھر زمین اپنے اختیار اور ملکیت میں رکھنے کے اسے بھی چکھنا پڑتا ہے تجربہ کرنا ہوتا ہے۔

اس پیشے کی آمدنی کا کوئی خاص تخمینہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ جس وکیل میں جتنی مؤکل کو خوفزدہ کرنے، عدم تحفظ کا شکار بنانے کی، انسانی نفسیات پر قابو پانے کی صلاحیت، موقع شناسی اور ابن الوقتی ہوگی۔ وہ وکیل ترقی کا زینہ مستانہ وار طے کرتا جاتا ہے۔ جس وکیل کے ہاں خاندانی شرافت، لحاظ ملاحظے کے ساتھ ضمیر زندہ، رحم دلی کی پرانی نہ چھوٹنے والی عادت اور انسان دوستی کی علت ہو ان کی شکم پروری اکثر خطرے میں ہوتی ہے۔ یعنی اس بے چارے کو روز، روزہ رکھنا پڑتا ہے۔ اس بے چارے کا حال بھی ایک جواری کی طرح ہوتا ہے جو اپنا کام پوری ایمانداری، محنت، ذہانت اور تندہی سے کرتا ہے۔ کبھی داؤ سیدھا پڑ گیا تو ایک ہی جست میں ایک طویل عرصے تک کا کھانا کپڑا اور دیگر ضروریات زندگی کا سامان ہو جاتا ہے۔ اگر داؤ الٹا پڑ گیا۔

تو سارے گھر کے پیٹ میں چوہے دوڑ جاتے ہیں۔کسی کو منہ دکھاتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔مگر اب جواری روز روز تو نہیں جیت سکتا ناں؟ کبھی ہار بھی جاتا ہے۔یا پھر کسی عیار بڑے وکیل کے ہاں ساری عمر نیابت JUNIORSHIP میں گذر جاتی ہے۔ان کے بیوی بچے بھی ان کا مذاق بنانے سے باز نہیں آتے۔

بہت سارے افراد وکلا کے پیشے کو صرف جھوٹ کے سبب ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔مگر یہ کسی طرح سچ نہیں ہے۔بہت سے اچھے اچھے تجربہ کار وکلا نے فتح،شہرت،عزت اور دولت سچ کہہ کر کمائی ہے۔بس ذرا یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ دل اور دماغ دونوں کو دو مخالف سمتوں میں پوری تندہی اور ایمانداری سے کام کرنا پڑتا ہے۔اپنے مؤکل کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر اسے دور کرنے کی غرض سے میدان کارزار میں اتر جانا پڑتا ہے۔مشہور حکایت ہے کہ ایک گڈریئے پر بھیڑ چرانے کا الزام عائد کیا گیا۔گڈریئے کے وکیل صاحب نے عدالت میں بحث کر کے اپنے مؤکل کو چھڑوا لیا۔گڈریا اور اس کر دوست عدالت سے گھر لوٹ آئے۔

دوست نے دریافت کیا۔"یار سچ سچ بتاؤ۔تم نے بھیڑ چرائی تھی یا نہیں؟"

گڈریئے نے معصومیت سے کہا۔"بھائی! بھیڑ چرائی تھی یہ تو یاد ہے۔پر جب سے وکیل صاحب کی بات سنی ہے تب سے یہ تذبذب ہوتا ہے کہ بھیڑ چرائی بھی تھی یا نہیں۔"

حکما نے اپنی کتابوں میں تجربات درج کئے ہیں کہ شہد سے زیادہ تاثیر زبان کے خوبصورت الفاظ میں ہوتی ہے۔لہٰذا وکالت کے پیشے میں الفاظ کی چھڑپ،الفاظ کی تاثیر،الفاظ کی نشست و برخاست،الفاظ کی ادائیگی،الفاظ کی صحت اور الفاظ کے موافق اور ناموافق معنی کے مباحثوں میں کتنے الفاظ کی فضول خرچی اور کفایت شعاری کی جا سکتی ہے۔ایسا کوئی لائحہ عمل اب تک وضع نہ کیا جا سکا ہے۔جس سے وکلا کا باتونی اور زود گو ہونا بھی فطری ہے۔جس کو مالی طور پر نقد

www.urduchannel.in

کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہونی چاہئے ورنہ وکیل پر بسیار گوئی کا الزام بھی عائد ہو جاتا ہے۔

یوں بھی وکلا کے پیشے کی صورتحال سب سے مختلف ہوتی ہے۔آنکھوں پر پٹی بندھی انصاف کی دیوی کے خاموش اور بے جان مجسمے کے سامنے ایک ایسی کتاب تعزیرات کے حوالے سے ایسے مؤکل کے حق میں مقدمے بازی کرنا ہوتی ہے۔جسے نہ تو مؤکل جانتا ہے اور نہ جاننے کی صلاحیت اور کچھ کہنے کی جسارت ہی کر سکتا ہے۔وکلا کی مدمقابل کے وکیل سے جاری پیشہ ورانہ چشمک نہ جانے کب پیشہ ورانہ یارانے میں تبدیل ہو کر مؤکل کی لٹیا ڈبو بیٹھیں۔اس پر احقر کا قلم خاموش ہے اور قاری کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ جب چاہے اس راز سے پردہ اٹھا لے۔خیر

جب عدالت میں کسی کیس کے دوران دونوں وکلا تیتر بٹیر بازی کی طرح بحث بازی میں مصروف ہوتے ہیں۔تب ان کے سامعین میں دو طرح کے افراد پائے جاتے ہیں۔ایک طبقہ مدعی کا حامی اور پسندیدہ ہو سکتا ہے۔دوسرے طبقے کے افراد نرے تماش بین ہوتے ہیں۔جن کے لئے مقدمات بھی دلبستگی اور وقت گذاری کا سامان ہوتے ہیں۔ہر دو فریقین اپنے وکیل کی باتیں سن سن کے نا صرف خوشی سے زیر لب مسکراتے ہیں۔بلکہ معنی خیز مسکراہٹ سے اپنے مطلب کی معنویت اخذ کر کے بحث کے مغز تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔وکیل کی ہر بات کو اخلاقی فریضہ جان کر اس کی فرمانبرداری بھی کرتے ہیں۔جب کے مدمقابل وکیل کی بحث بڑے غصیلے انداز میں سماعت کر کے انہیں ٹیڑھی نظر سے دیکھتے ہیں۔بس نہیں چلتا ورنہ دانت پیس کر بھری عدالت میں مدمقابل کے وکیل سے دو دو ہاتھ کر بیٹھیں۔جو سامعین صرف سیر سپاٹے یا وقت گذاری کی غرض سے کورٹ میں آئے ہیں۔ان کے تناظر میں بظاہر دونوں فریقین تو حق پر ہیں۔بحث بھی دونوں جانب سے حق اور انصاف کی تلاش میں ہی جاری ہے تو پھر

؎ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؎

مقدمہ فوجداری ہو یا دیوانی اپنے مؤکل کے حق میں ہر صحیح وغلط بات کی پیروی کر کے فیصلے اپنے حق میں کروانا اور اپنی فیس ڈھیلی کروانا ہی وکیل کا پیشہ ہے، جب کہ فریضہ ہے حق اور انصاف قائم کرنا ہوتا ہے۔ مگر ثانی الذکر پالیسی بڑا مجاہدہ چاہتی ہے۔ روزی کو روزہ بنانا پڑتا ہے۔

انگلینڈ میں ایک شاہی دلہن نے ولی عہد برطانیہ پر الزام لگایا۔

شاہی دلہن کے وکیل نے کہا۔ ”ہم اپنا سارا کام نہایت پاک صاف طور پر اور ایمانداری و دیانت داری سے کرتے ہیں۔ اگرچہ میں اس وقت اس ملک کے ولی عہد سلطنت کے خلاف مقدمہ لڑ رہا ہوں۔ اس کی مجھے رتی برابر بھی تشویش اور فکر نہیں ہے۔ میری ساری سرگرمیاں اپنے مؤکل کے حق میں جاری رہیں گی۔ خواہ اس کام میں مجھے ملک مخالف سمجھا جائے تو بھی میں سے ہرگز خیال نہیں کروں گا۔“

سچ پوچھئے تو اس ملک کی ترقی کا بوجھ وکلا کے کاندھوں پر ہی آن پڑا ہے۔ بڑے بڑے سرکاری مسائل کو سمجھنے، سلجھانے اور ان کے عمل اور ردعمل ان کے نفاذ اور عدم نفاذ کا فیصلہ سیانے کوّے ہی کرتے ہیں۔ یوں بھی ان کے پیشے کو صاف ستھرا تصور کیا جاتا ہے چونکہ یہ سرکار یا سرکاری کارندوں کی عادات ”یس سر۔ نو سر“ کہنے والے نہیں ہو سکتے۔ تدبر، ہمت، صبر یہ تین عادات اس پیشے کی اساس ہیں۔ قابل، لائق اور چلتا پرزہ وکیل وہی ہوگا جس کی عادات میں یہ اوصاف ہوں۔

گورنمنٹ قانون ہندی کی چندی نکالتے ہوئے ملک کی ترقی میں مانو زہر سا گھول رہی ہے۔ اس کا نکتۂ اخیر جواب یہ وکیل ہی ہے۔ بڑے شہروں میں وکلا کی شان ہوتی ہے۔ جو پیدل چلیں تو شان بے نیازی سے چلتے ہیں۔ مگر یہ خیال آتا ہے کہ بندر کے ہاتھ میں تلوار کے کتنے دھنی ہیں جو اس پیشے میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر کے عیاری، مکاری، ساز باز اور رشوت

www.urduchannel.in

ستانی کے بل پر جج کا فیصلے ان کے اپنے حق میں کروا لیتے ہیں۔ جو اکثر و بیشتر انصاف کے منافی ہوتے ہیں۔ فیصلے کے من جانب مؤکل ظاہر ہوتے ہی وکیل کی عزت وتوقیر بڑھ جاتی ہے۔ مؤکل اپنی دلی مراد بر آنے کے نتیجے میں نہ صرف وکلا کو تگڑی فیس کے ساتھ ان کا احسان مند ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات انہیں عمدہ تحفے بھی عطا کرتے ہیں۔ اس ظاہری چمک دمک اور چکا چوند سے متاثر نسل نو کا معصوم نوجوان جو بنیادی شرافت، ایمانداری، اخلاص، محنت ومشقت کا عازم ہوتا ہے۔ اس پیشہ ورانہ چکا چوند اور عزت وتوقیر کی چکا چوند سے اپنی آنکھیں چندھیا کر خیرہ کر بیٹھتا ہے۔ ایک عمر جب اسی دشت کی سیاحی میں گذار لیتا ہے تب ہوش آتا ہے اور تب کہیں جا کے اکبر الٰہ آبادی کے شعر کا مفہوم سمجھ شریف میں جا گزیں ہوتا ہے۔ بقول غالبؔ

آہ کو چاہئے، ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

۴۷۔ دانت کھٹے

دانت کی اہمیت وافادیت پر قلم اٹھانا گویا سورج کو دیا دکھانے کے مترادف ہے۔ چونکہ کہتے وقت تو ہونٹ بھی اپنے اور دانت بھی اپنے ہوتے ہیں۔آپ خدانخواستہ یہ نہ فرض کرلیجئے گا کہ ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے کہ دانتوں جیسے خطرناک عضو پر طبع آزمائی کی ابتدا کردی ہے۔البتہ جب راقم کو عقل کے دانت نکل آئے تو حوصلہ مجتمع کر کے دانت کے موضوع پر دانت گاڑنے کی سعی پر طبیعت آمادہ ہوگئی ہے۔یوں بھی قربانی کے ذبیحہ کے دانت دیکھ کر ہی اس کی قربانی جائز یا ناجائز یا قبول و ناقبول کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

یہ چار حرفی دانت صرف صیغۂ واحد نہیں ہے بلکہ ایک عدد مکمل بتیسی کی نمائندگی کرتا ہے۔بتیسی دانتوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہمہ اقسام کے دانت انسان کی عمر کے تفاوت کے مطابق منہ کے اسٹیج پر اپنا کردار بخوبی ادا کر کے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔دانت بھی کبھی دودھ کے،کبھی ڈاڑھ کے،کبھی مستقل،کبھی عقل،کبھی نقل،کبھی سونے کے،کبھی کونے کے،کبھی کھانے کے کبھی دکھانے کے ہوتے ہیں۔الغرض دانتوں کے آواگون کا سلسلہ قبر کے دہانے تک دراز رہتا ہے۔دانتوں کا ساتھ زندگی کے ساتھ تک محدود ہے۔اب انسان کے دانت ہاتھی کے دانت تو نہیں ہیں کہ پس مرگ بھی مالی منفعت کے کام آئیں۔جب ان سے تا حیات طبیعت سیر نہیں ہوتی اور بڑھاپے میں یہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو تو زیبائش صورت کی خاطر نقلی بتیسی بھی دندان سازوں کے ہاں میسر ہوتی ہے تا کہ دوران گفتگو باقیماندہ دانتوں کے درمیان سے ہوا ادھر ادھر سے نکل گئی تو اس عمر میں الفاظ، تلفظ، معنی اور ادائیگی میں کہیں کوئی غلط فہمی پیدا ہو کر تماشہ نہ بن جائے اور بات بے بات کا دندان شکن جواب دیا جاسکے۔

www.urduchannel.in

چہرے کے چوکھٹے میں لب ورخسار دانتوں کا پردہ ہیں مردوں کے لئے داڑھی داڑھ کا پردہ ہے۔اس پردے سے تبسم یا ہنسی کے لئے دانتوں کا جھلک جانا بالکل ایسا خوش آئند عمل ہے جیسے گھٹا سے چاند نکل آنا دیدہ زیب ہوتا ہے۔یہ پردہ تو قرار واقعی غیرت کا پردہ ہے۔جسے غیرت کا پردہ نہ ہو اسے بے شرم اور بے غیرت کہہ کر رسوا کیا جاتا ہے جو ناکامیٔ حیات کی دلیل ہے۔تصور کیجئے کہ جب ڈاڑھوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔طبیعت کو بصد اضطراب ایک پل بھی چین نہ آئے تو دل چاہتا ہے کہ ہم اس دانت کو اکھاڑ باہر کریں۔لہٰذا بے غیرتوں اور بے شرموں کو بھی اپنے دائرۂ احباب سے انہیں بھی خراب ڈاڑھوں کی مانند اکھاڑ پھینکنا ہی دانش مندی ہے تا کہ روزانہ کی کوفت اور دردسر سے نجات مل جائے۔

دانت ہمیں اپنی ساخت، اعمال، افعال اور حسن ترتیب سے یہ درس ضرور دیتے ہیں کہ جب تک ہم اپنی جڑ اور ہمسائے دانت سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ نہ ہوں، اپنی ذات اور قوم میں پیوست نہ رہیں ہم اپنا کردار بہتر طور پر ادا نہیں کرسکتے۔اپنی ذات وقوم، جڑ اور ہمسائے سے مضبوط رشتے میں ہماری بقا اور ارتقا ہے۔ورنہ زمانہ شاہد ہے کہ نکلے ہوئے دانت پھر نہیں بیٹھتے۔عصر حاضر بھی مشاہدے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کو اولیت دیتا ہے۔تجربات سے گذرنا تضیع اوقات اور حماقت کی علامت بن چکے ہیں۔جسے محاورتاً یوں کہا جاتا ہے کہ ہاتھوں سے کھلے تو دانت کیوں لگائیں۔

دانتوں کی کہکشاں المعروف بتیسی جو چھوٹی چھوٹی تیز دھار نوکیلی اور چپٹی ہڈیوں پر منحصر ایک خطرناک سانچہ چہرے مہرے کا ایسا حصہ ہے۔جس کے حصار میں اس سے بھی زیادہ خطرناک، مہلک، رقصاں اور روانی سے چلنے والی شہ زبان کا بسیرا ہوتا ہے۔اس لحاظ سے بتیسی اور اس کی حامل زبان ان دونوں کا امتزاج ہی زمانے میں اس شخصیت کے رد و قبول کا امتیاز و

پیمانہ طے کرتے ہیں۔لہٰذا سب سے اہم مقام کے حامل ہیں۔

یاد رہے کہ سنگھاسن بتیسی سے ان دانتوں کی بتیسی کا کوئی تعلق اب تک دریافت نہ ہو سکا ہے۔لہٰذا مذکورہ تعلق کی خبر ہوتے ہی قارئین کے گوش گذار کردی جائے گی۔ہاں تو بتیسی سے چہرے کی ساخت اور زیبائش میں کارگر ہونے کے علاوہ کھانے اور بعض اوقات دکھانے میں بھی یکساں کارآمد ہے۔خوئی قسمت سے اگر دانت زنانہ ہوں تو دانتوں کے حسن تبسم کے دوبالا ہو جانے کی سبیل ہیں دور ماضی کی خواتین دانتوں کی واحد تزئین مسی سے دانتوں پر آرائش و زیبائش کرتی تھیں۔افراط زر کے زمانے میں خواتین سونے کے دانتوں سے مذکورہ امر کی تشفی کر لیتی ہیں۔جانوروں سے قطع نظر حضرت انسان کے ہنسنے اور مسکرانے کے عمل میں سب سے نمایاں کردار دانتوں کی نمائش کا ہی ہوتا ہے۔جسے صحت معکوس کے طور پر دانت نکالنے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔جسے دراصل ماہر دندان یا ڈینٹسٹ کا فریضہ اگرچہ فرض کرلیا گیا ہے۔البتہ اس فریضہ کو بعض منچلے باہمی تنازعوں اور ہاتھاپائی کے دلچسپ کھیل میں مکوں اور دیگر اقسام کی طبع آزمائی کے طفیل انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔جو بغیر مشق کے انجام دیئے جانے کے سبب عبرت ناک ضرور ہوجاتی ہے۔یوں تو دانت توڑنا بھی ایک فن ہے۔جسے ثانی الذکر افراد کے عمل پر بلا تکلف محمول کیا جاسکتا ہے۔ہمیں مطلق اس امر پر کوئی اعتراض نہیں۔بتیسی جسے عرف عام میں چوکھٹا بھی کہا جاتا ہے چوکھٹا بگاڑ دینے کی تنبیہہ کے ساتھ بہت پرانا مگر مقبول و معروف قول ہے۔جو تنازعات میں اکثر و بیشتر خواہ مخواہ سننے میں آجاتا ہے۔

پوپلے بوڑھوں کو منہ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں کہہ کر طنز کرنا ہمارا معصومانہ فعل ہے۔جس میں ہمارا اپنا قصور کم اور محاورے کی شدت بیان کا دوش زیادہ ہے۔خواہ منہ کا ذائقہ ہو یا تلفظ کی ادائیگی دانت زبان کو لگائے بغیر لذت بیان ہو یا لذت کام و دہن کی کیفیت طاری

www.urduchannel.in

نہیں ہوتی ہے۔شعرا نے جہاں محبوب کے حسن کی تعریف میں پیچ و کاکل،لب و رخسار، بھوں، پلکوں و آنکھوں کی بال کی کھال نکالنے میں مطلق کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔وہیں دانتوں یا بتیسی کے بغیر صورت زیبا کا تصور کریں تو پوپلا سا منہ ہی رہ جاتا ہے جو نہایت مضحکہ خیز صورت حال پیش کرتا ہے جہاں پورے چہرے پر سب سے نمایاں نیم دائروی ٹھوڑی ہی بچ رہتی ہے۔جس سے سارے حسن ملیامیٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔

شعرا نے دانت کے لئے تشبیہات اور استعارے بھی خوب وضع کئے ہیں۔جیسے دانتوں کو اکثر موتی،لعل،ہیرا،زمرد،دودھ کی رنگت وغیرہ سے تشبیہہ دی ہے۔یہاں پان سے رنگ و روغن کئے گئے دانتوں کو بھی شامل تحریر کرنا موضوع کے احاطے کی ضرورت ہے۔دراصل دانت مذکورہ بالا اشیا سے بھی بیش قیمتی ہیں۔دودھ،دال،سالن وغیرہ میں روٹی چور چور کر روزانہ گلے کے نیچے اتارنے اور چبانے کے کیف و لطف سے محروم ہونے اور ناشتے میں ستو پھانکنے کا درد کیا ہوتا ہے؟ انواع و اقسام کے لذیذ اور منہ میں پانی لانے والے پکوانوں کو ترس جانے کا کرب کیا ہوتا ہے؟ یہ ہم کیا جانیں۔البتہ اگر ہمارے دلائل پر یقین نہ ہو تو کسی پوپلے بوڑھے سے اس کرب کی تفسیر دریافت کی جاسکتی ہے۔جس کا مدعا سمجھنے میں یقیناً آپ کو دانتوں پسینے آجائیں گے۔

۔بزرگی کی آمد پر اصلی اور نقلی بتیسی کی کشمکش صرف یہی ایک درد نہیں ہوتا۔بزرگی ہزار آفتوں کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔جن میں سب سے بڑی آفت دانتوں سے محرومی ہے۔سردی میں دانت بجنے یا دانت کٹکٹانے کے لطف سے محرومی،غصے میں دانت پیسنے سے محرومی،دانت نکال کر ہنسنے اور بے ساختگی سے قہقہے لگا کر اظہار خیال سے محرومی،اچار،کیری اور املی کھانے کے بعد دانت کھٹے ہونے سے محرومی،علاوہ ازیں ہزیمت آمیز ہار یا شکست فاش سے دانت کھٹے ہونے سے محرومی،روپیہ،پیسہ زمین جائداد دانت سے پکڑنے کی محرومی،دقت اور مشکلات کے

عالم میں دانتوں تلے پسینہ آنے سے محرومی، حیرت واستعجاب کے وقت دانتوں تلے انگلی دبانے سے محرومی اور شوق وشغل میں پان چبانے سے محرومی وغیرہ قسم کے نازک احساسات سوہان روح بن جاتے ہیں۔ ورنہ عہد شباب میں محبوب کی خاطر ان کا یہ عمل قابل حسرت ہے۔ جے بیشتر شعرائے کرام نے مختلف سیاق وسباق میں خوب برتا اور اپنی طبع آزمائی سے دانت کی ادبی حیثیت بھی منوا لی ہے۔

بقول مولانا حسرتؔ موہانی

تجھ سے ملتے ہی وہ کچھ بیباک ہو جانا مرا　　اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

بقول ناظم انصاری، ناگپور

میرے اظہار محبت پہ ارے باپ رے باپ　　دانت میں انگلی دباتے ہو کیا کرتے ہو

بقول ہدایت اللہ ہادیؔ، ناگپور

جو اٹھاتے تھے مرے حال پہ کل تک انگلی　　آج وہ دانت میں خود انگلی دباتے ہیں ناں

بقول شاعر

دانتوں کے چوکھٹے میں زباں بند ہے　　جب سے گرے ہیں دانت، پان بند ہے
بتیسی کے دم سے تھی صورت زیبا خوبرو　　دانتوں کے گر جانے سے دکان بند ہے
چہرہ ہے پوپلا مرا، گفتار مطلق بے اثر　　منہ میں ہوا کی حرکت کا میزان بند ہے

www.urduchannel.in

۷۵۔ بڑھتی کا نام داڑھی

مثل مشہور ہے کہ چلتی کا نام گاڑی اور بڑھتی کا نام داڑھی۔ بغیر کھاد اور پانی کی داڑھی کی یہ فصل بغیر محنت کے چاہے نہ چاہے روزانہ تیار ہو جاتی ہے۔ مردانہ چہرے بشرے کی زینت اور شان داڑھی ہے۔ اگر چہرے پر داڑھی یا اس کے آثار نہ ہوں تو رخ زیبا کو دیکھ کر بعض اوقات جنس کی تخصیص مشکل امر ہو جاتا ہے۔ اگر خیال خام میں آپ کو کچھ تامل ہو تو ببر شیر کو بغیر داڑھی کا (کلین شیو) تصور فرما کر تجربہ کر سکتے ہیں۔ بکروں کے چہرے پر داڑھی نہ ہو تو مردانہ وجاہت اور بکریوں کے رخ زیبا سے خوف و دبدبہ جاتا رہتا ہے۔ داڑھی بھی عمر کے ساتھ رنگ روپ تبدیل کر لیتی ہے۔ ابتدا میں سیاہ ہوتی ہے پھر کھچڑی بن جاتی ہے بلآخر پک کر سفید ہو جاتی ہے۔ سفید داڑھی جہاں بزرگی کی علامت تصور کی جاتی ہے وہیں زمانہ شناس افراد اس میں تنکے کا وجود ڈھونڈ لینے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ داڑھی کو ہاتھ لگا کر میٹھے میٹھے بول کی آمیزش سے خوشامد اور مطلب براری کے کارہائے نمایاں انجام دئے جاتے ہیں۔

داڑھی اور مونچھوں کو دیکھ کر شخصی تاثر اخذ کیا جاتا ہے۔ اندازوں کے تجربات کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر داڑھی بظاہر احترام، تقدس، پاکیزگی، بزرگی اور برگزیدگی کی علامت تصور کی جاتی ہے۔ بعض افراد داڑھی کے ذریعئے خدا کا قرب تلاش کرتے ہیں۔ لہٰذا داڑھی کو خدا کا نور کہہ کر اس پر بڑے ناز و ادا سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور برسبیل تذکرہ اپنی شان وتوقیر میں اضافہ کر لینے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تب خواتین کو اس نور خدا سے کیونکر محروم کر کے تاریکی کی سزا دی گئی۔ یہ بھی نکتہ بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔ بلکہ بعض ماہرین مذکورہ بالا صفات کی حامل داڑھی اور چوغے کی آڑ میں فریبیوں کو تاڑ کر یہ تک کہنے سے باز نہیں آتے ہیں کہ جتنی لمبی داڑھی ہوتی ہے

اس سے لمبا خطرہ ہوتا ہے۔ یوں بھی خواتین کو دیکھ کر یہ دکھ ضرور ہوتا ہے کہ جب ان کی اکھ پر دھبہ لگ جائے تو اسے چھپانے کے لئے وہ داڑھی نہیں رکھ سکتیں۔ یہ مراعت بھی دیگر تمام سہولیات بالادستی کے ساتھ صرف مجازی خداؤں کو حاصل ہے۔ جس شخص کی ہوشیاری، کرتوت یا ذہانت سامنے نظر نہ آئے اسے پیٹ میں داڑھی ہونے کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ ہر مذہب کے مذہبی پیشواؤں میں داڑھی بڑھانے کا رواج عام ہے۔ حالانکہ اکثریت اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ داڑھی رکھنا خالص اسلامی شعار ہے۔ جب کہ پاپائے روم، سارے فادر (پادری)، سادھو سنت، باریش ہوتے ہیں۔ سناتن دھرم میں شیواجی مہاراج، رابندر ناتھ ٹیگور، سوامی پرم ہنس، سوامی دیانند سرسوتی، راجہ دشرتھ، راجہ جنک، بھگوان برہما کو بھی داڑھی تھی۔ حتی کے کمیونسٹوں کے ہاں بھی داڑھی یکساں مقبول رہی ہے۔ اکثر دہریئے اور مدعیٔ خدا بھی باریش ہی پائے گئے۔ تمام سائنس داں اکثریت سے باریش ہوتے ہیں۔ لہٰذا داڑھی کے جملہ حقوق صرف مسلمانوں کے نام محفوظ کرنا سراسر کوتاہ بینی بلکہ عصبیت ہوگی۔ داڑھی کو سیکولر کہا جائے تو مخصوص طبقے کی انا پر ضرب ہوگی۔ لہٰذا ہم اس امر سے سردست پرہیز کرتے ہیں۔

البتہ داڑھی کی ساخت اور تراش خراش اکثر ذات وقوم، مذہب ومسلک، علاقے اور لسانی اکائیوں کی ترجمان ہوتی ہیں۔ اس میں مسائل اور اس کے تعلق سے رسائل بھی موجود ہیں۔ حجاموں کو جملہ اقسام کی داڑھیوں کو تراشنے کا تجربہ بلاشرکت غیرے ہوتا ہے۔ یک مشت داڑھی، دومشت داڑھی، خشخشی داڑھی، فرینچ کٹ داڑھی، خط والی داڑھی، بغیر خط والی داڑھی، جٹادھاری داڑھی، گرہ والی داڑھی، ربر لگی ہوئی داڑھی، آزاد داڑھی، پابند داڑھی، کپڑے میں لپٹی ہوئی سکھوں کی داڑھی وغیرہ وغیرہ۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر عقل ضرور عطا کی ہے کہ وہ داڑھی کو دیکھ کر اپنے دماغ میں داڑھیوں کی درجہ بندی کر کے اس کی شناخت ضرور کر لیتا ہے۔

www.urduchannel.in

مثل مشہور ہے کہ کرے دھرے مونچھوں والا، پکڑا جائے داڑھی والا من وعن یہی صورتحال آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ و برطانیہ میں سکھوں کی داڑھی کے سبب اور سر پر تربان باندھنے کی وجہ سے ہوئی۔ جہاں انہیں طالبان کے دھوکے میں نہ صرف زدوکوب کیا گیا بلکہ زندہ نذر آتش کرنے جیسے شدید ردعمل سے بھی واسطہ رہا ہے۔

کتنے ہی داڑھی کی اہمیت سے بیگانہ افراد کے صبح سویرے کے معمول میں بلیڈ کی مدد سے چہرے کو سمنٹ کے پلاسٹر کی طرح چکنا کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔ جس سے چہرے نکھرنے کی بجائے اس کے جملہ عیوب مزید نمایاں ہو جاتے ہیں خاص طور پر لٹکے ہوئے رخسار ہونٹ اور ٹھوڑی سے صحیح عمر کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ دوسرے ہی روز چہرے پر ارہر کے کٹے ہوئے کھیت کی طرح کھونٹیاں نکل آتی ہیں۔ جو رخ زیبا پر سیاہی مائل سائے کی رنگت کے سبب کم اور طبع نازک پر زیادہ گراں گذرتی ہے۔ بیشتر افراد داڑھی بڑھ جانے یا کلین شیو میں تاخیر کو یا تو خرابیٔ صحت یا پریشانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

۷۶۔آبیل مجھے مار

قصہ المختصر یوں ہوا کہ میرے گھر کے عین سامنے دو نوجوان آپس میں لڑ پڑے۔خیر لڑنا بھڑنا نوجوانی کا تقاضہ ہے بوڑھے یا تو دماغ لڑاتے ہیں یا آپس میں لڑاتے ہیں۔حسب روایت ان میں جو طاقت ور تھا فاعل کا یعنی پیٹنے کا کردار نبھا رہا تھا اور مفعول کمزور تھا جو پوری دیانت داری سے پٹنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ بظاہر یہ عمل بڑا دلچسپ تھا کیونکہ انسان بنیادی طور پر تخریب پسند ثابت ہوا ہے۔اس کا مزاج کسی کی تکلیف سے آسودگی کا نشاستہ کشید کرتا ہے۔ورنہ WWF کے پہلوان تو بھوکوں مر جائیں۔البتہ میں اپنی امن پسند فطرت سے مجبور کہ ظلم دیکھنا اور سہنا سخت نا پسند کرتا ہوں۔لہذا میرا خون شریانوں میں تیز گردش کرنے لگا کہ ظلم میری آنکھوں کے سامنے جاری رہے اور میں تماشائی بنا خاموش کھڑا رہوں؟ ابھی گرد و پیش کے ناظرین کی نظر میں اس عمل کا لطف اپنے عروج تک رسائی حاصل کر پاتا کہ اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔دونوں فریقین نے اپنے کردار آپس میں تبدیل کر لئے تھے۔آن کی آن میں کمزور مفعول نے پیچھے کی جیب سے چاقو بڑی پھرتی سے نکالا اور فاعل کے پیٹ میں گھونپ کر اڑن چھو ہو گیا۔

اچانک ذہن میں ایک چھناکا ہوا اور برسوں پہلے پڑھی ہوئی ایک کہانی یاد آ گئی۔جس میں ایک کمزور ادنیٰ ساخرگوش بھی کچھ اسی طرح اپنی تدابیر سے شیر کو مار گراتا ہے۔سارا محلہ سنسان ہو گیا منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔سارے تماشائی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکے تھے۔پاس پڑوس کے افراد دانستہ یا نادانستہ اپنے اپنے بستروں میں دبکے پڑے تھے۔ہر شخص اس سانحے سے انجان معصوم اور لاعلم نظر آنے کی اداکاری میں مصروف تھا۔میرے لاکھ سمجھانے بجھانے،

www.urduchannel.in

منت وسماجت کے بعد بھی کوئی پولس تھانے میں اس سانحے کی رپورٹ درج کروانے پر تیار نہ ہوا۔وہ تو میرے بھی خیر خواہ نکلے اور مجھے اپنی جان کی خیر منانے اور اپنے اقدام سے باز آنے کی تلقین کرتے رہے۔اس صورتحال میں میں اپنے ضمیر کی آواز کا ڈھول جو گلے پڑ چکا تھا اسے ہی ساری طاقت سے پیٹنے میں عافیت جانی کہ کہیں سابق فاعل اور حالیہ مفعول اپنا پتہ چپکے سے اس جہان فانی سے اس جہان لافانی میں تبدیل نہ کر لے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔میں نے قریب کے ٹیلی فون بوتھ سے ہی پولس کو اس سانحے کی اطلاع دے دی۔

حسب معمول قدرے تاخیر سے یعنی جتنی دیر میں دلہن تیار ہوتی ہے اس سے بھی قدرے دیر سے پولس کی ضعیف، سست رفتار، جیپ رینگتے رینگتے میرے غریب خانے کے سامنے رکی۔میرا سینہ احساس تفاخر سے اگرچہ گز بھر کا ہو گیا۔البتہ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سینہ گز بھر کا صرف کسرت سے ہی نہیں ہوتا۔گھر کے سامنے پولس جیپ دیکھ کر بھی سینہ چوڑا ہو جاتا ہے۔چونکہ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی پھنس جاتی ہے۔جیپ میں سوار کوئی بھی آئے ہمارے لئے وہ فرشتے سے کم نہیں ہوتا۔دو مریل سوکھے قحط زدہ پولس والے جیپ سے لاٹھیاں لئے برآمد ہوئے۔گویا خچر بردار ظالم کا مقابلہ ان لاٹھی برداروں کے بس کی بات ہو۔کچھ دیر بعد اسی جیپ سے ایک انسپکٹر بھی برآمد ہوا۔میں نے اپنی میزبانی کا فریضہ نبھایا ان کی آؤ بھگت کی۔انہیں گھر میں بلا کر بٹھا دیا۔سچ پوچھئے تو اس وقت اگر سائیکل پر میرے والد گرامی بھی تشریف لاتے تو شاید ہی میں ان کو پوچھتا۔چونکہ سائیکل جب بھی جیپ کے سامنے آتی ہے بڑی پھیکی پڑ جاتی ہے۔لہذا جیپ ہی انسان کی پستی یا بلندی کا پیمانہ ہے۔

انسپکٹر نے حسب معمول سخت لہجے میں سوال کیا۔"کیا ابھی تم نے ہی تھانے میں فون کر کے اس

کیس کی اطلاع دی تھی؟"

میں نے اس کے سخت استفسار پر جز بز ہوتے ہوئے جواب دیا۔"جی ہاں"

تب انسپکٹر نے دوسرا سوال داغا۔"کیوں؟"

میں نے سادگی سے جواب دیا۔"اس لئے کہ یہ واردات میرے گھر کے سامنے واقع ہوئی ہے دوسرا سبب یہ ہے کہ میرے علاوہ کسی اور میں اتنی ہمت نہیں کہ سچ کہہ سکے۔"

تب انسپکٹر نے اپنا ڈنڈا میں ہوا میں لہراتے ہوئے سوچا آہستہ سے اپنی نشست سے اٹھے پھر دریافت کیا۔"کیا تم بتا سکتے ہو کہ مقتول اور قاتل تمہارے ہی گھر کے سامنے کیوں لڑے؟"

انسپکٹر کا نفسیاتی حملہ بڑا طاقتور تھا مگر میں ان معنوں میں مجبور تھا میں دونوں سے لا علم تھا۔ اب ان دونوں نے نہ لڑنے کی اجازت طلب کی نہ لڑنے کا مقصد ہی بیان کیا اور نہ ہی اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔ اب میں پولس انسپکٹر کو کیا بتاتا؟ ہوسکتا ہے ان میں لڑائی کا سبب کوئی کنیا کنواری ہو؟ اب سوچئے کنیا وہ بھی بالکل کنواری ہو وہ تو اچھے اچھوں کو سات پردوں میں چھپ کر لڑوا دے۔ تب ان دونوں کی کیا اوقات ہے؟ ممکن ہے کہ یہ سانحہ بھی کسی حسین ومہ جبین کی خم ابرو کا کمال ہو۔ چونکہ لڑائی کے وہی جملہ تین بنیادی اسباب زر، زمین، زن ہوسکتے ہیں۔ جو شاید پولس انسپکٹر صاحب نہ جانتے ہوں۔

کچھ افراد فطرتاً فتور لے کر پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس دن ایسے افراد کسی سے لڑ بھڑ کر اپنی حیوانیت کی سیر حاصل تسکین نہ کرلیں ان کا ہاضمہ اور دماغ دونوں درست نہیں رہتا۔ میں بھی ایسے ہی ایک فتوری شخص سے واقف ہوں۔ پہلے وہ بہت صحت مند، کڑیل جوان مسٹنڈا تھا۔ البتہ ابھی کچھ دن پہلے ملاقات ہوئی تو سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ مانو غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ میں نے از راہ

www.urduchannel.in

مذاق سوال کیا۔"کیا سیدھا قبر سے اٹھ کر چلے آرہے ہو؟"

وہ جھینپ گیا اور مسکرا جواب دیا۔"ہاضمہ بہت خراب ہوگیا ہے۔"

میں نے دوبارہ سوال کیا۔"کیوں بھئی؟"

اس نے مایوسی سے کہا۔"کئی دنوں سے لڑنے کو ترس گیا تھا۔ جو مجھے دیکھتا ہے راستہ ہی تبدیل کر دیتا ہے۔"

میں یہ سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں یہ چھیڑ خوانی مجھے مہنگی نا ثابت ہو جائے اور یہ مجھ سے ہی نہ لڑ بیٹھے لہذا میں نے فوراً پتلی گلی میں مڑ جانے میں عافیت جانی۔

انسپکٹر صاحب بظاہر معقول شخص نظر آرہے تھے مگر ان کے سوال بڑے تعجب خیز تھے۔ انہوں نے مشکوک انداز سے میرے سراپے کا جائزہ لے کر شگوفہ چھوڑا۔ تم نے اپنا گھر ایسی جگہ کیوں بنوایا ہی کیوں جس کے سامنے لوگ آ کر لڑیں؟

میں نے سادہ لہجے میں کہا۔"یہ گناہ عظیم میرے دادا پردادا سے ہوگیا تھا میں واقعی بے قصور ہوں۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ مقتول اور فرار تمہارے ہی گھر کے سامنے کیوں لڑے؟"

میرے پاس اس پولس کے حربے کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ تھا۔ لہذا خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ انسپکٹر صاحب نے من بھر کا ہلتا ہوا سر نہیں دیکھا چھٹاک بھر کی بند زبان پر اعتراض کر بیٹھے۔

شاید انہوں نے میری خاموشی کو اپنے دل کی عدالت میں میرا اقرار تسلیم کرلیا ہوگا۔

تب انسپکٹر صاحب زور سے دہاڑا۔"مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ خون تم نے ہی کیا ہے۔"

انسپکٹر کا بے سر پیر کا الزام سن کر دن میں تارے نظر آ گئے۔ میں وقتی طور پر بوکھلا گیا بے قابو ہوگیا۔

میں نے بڑی مشکل سے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔" جی نہیں۔۔۔ یہ خون۔۔ میں نے نہیں۔۔۔

کیا ہے۔۔۔میں بالکل بے قصور ہوں۔''

انسپکٹر نے فلمی انداز میں ڈنڈا گول گول گھما کر دھمکانے کی کوشش کی۔'' میاں! جب پھانسی کی سزا ملے گی تو ساری بے گناہی جھڑ کر اتر جائے گی۔''

پھانسی کا نام سنتے ہی میرا گلا خشک ہو گیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔تب ان مریل ڈنڈا بردار پولس والوں میں ایک مریل نے نیکی کے فرشتے کی مانند قریب آ کر کانا پھوسی کی۔'' بات بن سکتی ہے۔تمہاری جان بھی چھوٹ سکتی ہے اگر کچھ اچھی رقم دے دلا دو معاملہ رفع دفعہ جائے گا۔''

سرگوشی اتنی واضح تھی کہ چاروناچار وہ انسپکٹر صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ ہی گئی۔موصوف یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔''کیوں برخوردار! اپنے باپ کو رشوت کا لالچ دیتے ہو؟

میں سخت گھبرا گیا اور کپکپانے لگا۔میری حالت مہا بھارت کی دروپدی کی طرح ہو رہی تھی۔انسپکٹر صاحب دریودھن کی طرح مجھے بے دردی سے سرعام برہنہ اور بے آبرو کئے جا رہے تھے۔بھگوان کرشن کے کردار میں مریل پولس والا اگر میری حمایت نہ کرتا تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔

مریل پولس والے نے گھگھیا کر کہا۔''چھوڑیئے حضور! غریب آدمی ہے۔نادان ہے۔آئندہ نہیں کرے گا۔جو دے رہا ہے لے لیجئے۔''

رقم کے تیقن کی نوید سن کر انسپکٹر کا تیور کچھ ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔اس نے قدرے نرم لہجے میں مریل پولس والے کے آگے سپر ڈالتے ہوئے کہا۔''تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔''

اب دوسرا مریل سپاہی جو کافی سست نظر آ رہا تھا اسے میرے سر پر تعینات کر کے ان دونوں کا رخ میرے ہمسائے کے گھر تھا۔دونوں نے بوٹ کی ٹھوکروں سے دروازے پر لشکری دستک

www.urduchannel.in

دی۔میرا ہمسایہ نیم خوابیدہ حالت میں اس طرح ہڑبڑا کر نمودار ہوا جیسے ملک الموت سے واسطہ پڑ گیا ہو۔اس نے معصومیت سے کہا۔''جی فرمائیے؟''

انسپکٹر سے سخت لہجے میں ڈانٹ کر دریافت کیا۔''جی فرمائیے کے بچے! یہاں نرم بستر میں سو رہے ہو،گھر کے سامنے واردات ہوئی پڑی ہے؟ پولس اسٹیشن میں اطلاع کیوں نہیں دی؟''

ایک دودھ کے دھلے خالص بھارتی شہری کی حیثیت سے ہمسائے نے کہا۔''واردات میرے گھر کے سامنے تھوڑی ہوئی ہے جو میں پولس اسٹیشن میں خبر دیتا۔''

تب پولس کو اوٹ پٹانگ جواب سن کر طیش آ گیا۔اس نے چیلنج کر سوال کیا۔''تم نے اپنا گھر ایسی جگہ بنوایا ہی کیوں جس کے آگے سسری کسی طرح کی کوئی واردات ہی نہ ہو۔''

ہمسایہ ایسے غیر متوقع سوال کے لئے تیار نہ تھا۔لہذا بوکھلا گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بزدلانہ حرکت کر کے اپنے برے ہمسائے ہونے کا پورا پورا ثبوت فراہم کر دیا۔''جی حضور! مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ دونوں نوجوان ان حضرت کے گھر کے آگے لڑیں گے یا کہیں اور مقام پر۔''

انسپکٹر صاحب نے اڑتے ہوئے سوال کیا۔''جب وہ دونوں نوجوان ان کے گھر کے سامنے لڑ رہے تھے تب تم نے انہیں اپنے گھر کے سامنے لڑنے کے لئے کیوں نہ کہا؟''

اب ہمسایہ منت سماجت میں نوٹنکی اور ڈرامے بازی دکھانے لگا۔اس نے روتی صورت بنا کر فریاد کی۔''اب کیا کہوں جناب؟ میری تو قسمت ہی پھوٹی ہوئی تھی۔''

انسپکٹر نے گرج دار آواز میں پولس والے سے کہا۔اماں قسمت کے بچے! خون تم نے کیا ہے۔اب میں سمجھ گیا ہوں۔حولدار ہمت سنگھ! اس قسمت کے مارے کو گرفتار کر کے ہتھکڑیاں پہنا دو۔''

ہمسائے کو بے دردی سے پولس جیپ کی طرف گھسیٹا جا رہا تھا اور وہ کنکھیوں سے کبھی مجھے اور کبھی پولس والوں کو گھور رہا تھا۔ اب انسپکٹر کی قہر آلود نگاہیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے اپنا تاوان انسپکٹر کے ہاتھ میں رکھ کر مٹھی گرم کر دی۔ تب اس کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔ انسپکٹر نے با آواز بلند کہا۔ ''آپ بھی تھانے چلئے جی۔ ایک اچھے فرض شناس شہری ہونے کے ناطے آپ کو گواہی دے کر پولس کی مدد کرنی ہے۔ میں سفارش کروں گا کہ اس سال کا ''پولس متر اصرف ایوارڈ'' آپ کو ہی دیا جائے۔''

اب انسپکٹر کا انداز تخاطب بزور رشوت گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل کر چکا تھا۔ اس نے میری ناچیز شخصیت کو عامیانہ انداز تخاطب 'تم' سے اچانک عزت و احترام کے لئے مخصوص تخاطب 'آپ' پر لا پٹخا تھا۔ لہذا آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ رشوت یا تگڑی رقم 'آپ' کہلانے کی بہترین سبیل ہے۔

انجام کار وہی ہوا جو عموماً ہوتا آیا ہے۔ ہمسائے پر قتل کا مقدمہ دائر ہوا، جرم ثابت ہوا اور سزائے موت بھی ملی۔ خدائے تعالیٰ اس کی روح کو سکون دے تاکہ وہ انسپکٹر سے اپنا انتقام لے سکے۔

۷۷۔ مجھے کیا برا تھا مرنا۔۔۔

ہمارے فخرو مرزا کی زندگی کی پٹری سے اتر گئی تو وہ بیچارہ ریل کی پٹری پر جا سویا۔ چشم زدن میں ایک تیز رفتار ریل نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے تن پرخچے اطراف میں ایسے بکھر گئے کہ صرف سر کٹی لاش ہی ہاتھ آئی۔ نہ جانے اسے کراہنے، دم توڑنے، اور آخری ہچکی کی نوبت بھی نصیب ہوئی یا نہیں۔ بے چارہ حرام موت مر گیا مگر اس کی موت کو حلال کرنے کا جتن اسطرح شروع ہو گیا کہ اس اس کی معصوم روح بھی پکار اٹھے گی کہ

؎ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یہ دراصل روازنہ کا معمول ہے ملک عزیز میں ایسے واقعات کی کثرت نے اپنی اہمیت خود مٹی میں ملا دی ہے۔ آئے دن خبر آتی ہے کہ کسی شخص کو مال سے بھری ہوئی ٹرک نے کچل دیا ہے مگر ڈرائیور فرار ہے۔ اخبار کے کسی گوشے میں چار سطروں کی خبر شائع ہوتی ہے جو دراصل ضائع ہوتی ہے۔ جو فرصت میں ہوتا ہے وہ تلاش کر کے پڑھ لیتا ہے جو مصروف ہوتا ہے اس کے پاس اپنی وجوہات موجود ہیں۔ درحقیقت دونوں کو اس خبر سے ذرو برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔

البتہ اس کی قسمت میں پس مرگ تشہیر لکھی تھی۔ خوبیٔ قسمت کہئے یا شومیٔ قسمت اس کا تعلق وزیر اعظم کے حلقۂ انتخاب سے تھا۔ یہ اطلاع اخبار کی خبر میں بھی درج تھی۔ وزیر اعظم کے کسی خیر اندیش کی رگ پھڑکی۔ اس نے وزیر اعظم کو موبائل سے مسیج روانہ کر دیا۔ پھر بھلا تاخیر کس بات کی تھی۔ سارا شہر ہائی الرٹ کر دیا گیا۔ بڑی آسانی سے رینگنے والی ٹریفک کے رخ موڑ دئے گئے اور انہیں مزید رواں دواں بنا دیا گیا ہے روزانہ جس پر قابو دشوار ہوتا ہے۔ ساری پولس جو اکثر تمباکو کے سرور

www.urduchannel.in

میں ڈوبی ڈیوٹی پرخواب خرگوش کے مزے لیتی ہے۔بہت چاق و چوبند ہوگئی۔عوام کی نظریں سڑک پر اپنے محبوب وزیر اعظم کے دیدار کے اشتیاق میں بے قابو ہوئی جارہی تھی جیسے کوئی عجوبہ وقوع پذیر ہوا چاہتا ہو۔سیاسی چونچلوں کا سلسلہ ازسرنو شروع ہوگیا۔اچانک کاروں کا قافلہ شور مچاتا گذرا۔سب کی نظریں سرخ بتی کی کار تلاش کررہی تھیں۔مگر کئی سرخ بتی کی گاڑیوں میں ان کی تلاش گویا کوئلے کی کان میں ہیرے کی تلاش ثابت ہوئی۔

سول اسپتال کے ڈیڈ روم کے سامنے وزیر اعظم دودھ کی سفیدی پہنے دودھ میں دھلے آہستہ سے کار سے نیچے اترے۔ان کے ایک ملازم نے پھولوں سے بنا ہوا چکر انہیں تھما دیا۔صحافی برادری تصویر کشی اور انٹرویو کے چکر میں ایک دوسرے پر گرے اور دھکے دئے جارہے تھے۔یہ کیا چکر ہے کچھ عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔وزیر اعظم نے سر جھکا کر مگر مچھ کے آنسو دودھ جیسے رومال میں جذب کئے اور پھولوں کا چکر ڈیڈ وارڈ میں پہنچ کر نعش کے سینے پر رکھ دیا۔ان کی تقلید میں تمام کار سے آئے سیاسی مہمانوں نے پھولوں کے ہار، گلدستے اور بوکے نعش کے سینے پر رکھ کر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔اب اسپتال کے ڈاکٹروں، نرسوں، ٹریڈ یونین، صفائی کامگار اور مالی برادری نے پھولوں کی بارش کردی۔نعش پھولوں سے اسقدر اٹ چکی تھی کہ کسی نووارد کے لئے پھولوں کے ڈھیر کے پیر نکل آنے کا نظارہ تھا۔

نعش کو ڈیڈ روم سے نکال کر کھلے برآمدے میں رکھا گیا۔اب عطر کی شیشیاں انڈیلنے کا سلسلہ دراز ہوا۔سارا ماحول معطر ہوچکا تھا۔جوں ہی یہ خبر وائرل ہوئی۔تمام وزیروں، رفاہی انجمنوں، سیاسی پارٹیوں کے سربراہان، عمائدین شہر کا رخ سول اسپتال کی طرف تھا۔ان میں گویا ریس شروع ہوگئی۔عجلت میں کئی کاریں آپس میں ٹکرا جانے اور مزید حادثات کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔شکر کہ

www.urduchannel.in

کوئی بڑی واردات نہ ہوئی۔صحافیوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں لمحہ بہ لمحہ خبریں نشر کی جارہی تھیں۔ وزیر اعظم کے بعد وزیر داخلہ نے نعش پر پھول ہار چڑھائے۔وزیر زراعت بیرون ملک کے دورے سے سیدھا سول اسپتال پہنچ رہے ہیں۔وزیر جنگلات اور وزیر کوئلہ وزیر صنعت، وزیر مالیات، وزیر معاشیات و وزیر دفاع نے دس منٹ کے وقفے میں نعش کو پھول چڑھا کر خاموش خراج عقیدت پیش کیا۔کپڑا وزیر ذرا تاخیر سے پہنچے، انہوں نے وزیر اعظم کے دفتر میں شکایت پہلے درج کروانا ضروری سمجھا کہ انہیں اطلاع تاخیر سے کیوں ملتی ہے۔پھر آہستہ سے کھسک کر وزیر اعظم کے پہلو میں آگئے اور سرگوشیوں میں دل کا غبار نکالا۔مخالف پارٹی کے سیاستداں بھی معمول کے مطابق ناراض تھے کہ وزیر اعظم نے اپنی پارٹی کے سیاسی لیڈران کو خبر دی مگر انہیں نظر انداز کر دیا۔انہوں نے پہلے اپنی شکایت شخصی طور پر خود وزیر اعظم سے کی۔جب اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو اگلے پچھلے تمام حوالوں کے ساتھ نہ صرف خط روانہ کیا بلکہ آر ٹی آئی بھی دائر کردی۔دیر سے سہی وہ بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام درج کروانے آگئے۔انہوں نے اتنا بڑا پھولوں کا گلدستہ پیش کیا کہ وزیر اعظم کے بعد سب سے بڑا خوبصورت اور قابل ذکر یہی خراج عقیدت ثابت ہوا۔مخالف لیڈر کے ایک نمائندے نے ان کے کان کے قریب منہ لگا کر کچھ کانا پھوسی کی۔انہوں نے تمام حاضرین کے سامنے اس بدنصیب مرحوم کی شان میں تعزیتی تحریک جو مخالف پارٹی کی جانب سے تحریر تھی اسے باآواز بلند پیش کیا گیا۔

''ہماری پارٹی شہید مرزا فخرالدین المعروف فخرو مرزا صاحب کی ناگہانی ریل حادثے میں موت پر اپنا گہرا افسوس ظاہر کرتی ہے۔مرحوم کے اہلخانہ کے لئے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔جب وزیر اعظم کے حلقۂ انتخاب کا کوئی شخص اس طرح ریل حادثے میں موت کے منہ میں جاسکتا ہے تو

اس بات کا تصور بھی مشکل ہے کہ ان کے حلقۂ انتخاب کے مکینوں اور ووٹروں پر کیا بیتا گذرتی ہوگی۔ جہاں سے برسرمخالف پارٹی کے لیڈران منتخب ہو کر ایوانوں میں پہنچتے ہیں۔

ہماری پارٹی شہید مرزا فخرالدین المعروف فخرو مرزا صاحب کے ناگہانی حادثے میں انتقال کر جانے پر ایک دن کے لئے پارٹی اپنا پرچم نیم سرنگوں کرے گی۔ ہماری پارٹی نے شہید کے اہلخانہ کو پانچ لاکھ روپئے بطور مدد دینے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ان کا جلوس جنازہ کل صبح گیارہ بجے ہماری پارٹی آفس سے نکلے گا۔ اس میں ہماری پارٹی کے ورکرس اور ووٹرس ہزاروں کی تعداد میں شرکت کریں گے۔

فخرو مرزا کے جنازے کو دس منٹ کے لئے وزیراعظم کی رہائش کے سامنے رکھا جائے گا تاکہ ملک کے ساتھ ساتھ اپنے حلقۂ انتخاب میں بلند بانگ دعوے کرنے والے وزیراعظم سے بھاری توقعات رکھنے والے ووٹرس کی آنکھیں کھل سکیں۔ ہماری پارٹی شہید فخرو مرزا کے نام ایک یادگار یا مجسمہ نصب کرے گی۔ ان کے نام سے ایک فلاحی ادارے کی بنیاد بھی رکھے گی، جس سے تمام غریب، مسکین اور خط غربت کے نیچے کی عوام کو بنیادی سہولیات دی جائیں گی۔ اس مد میں تمام اہل وطن سے درخواست ہے کہ اپنا مالی تعاون دراز کریں۔ جہاں شہید فخرو مرزا نے آخری سانسیں لی تھیں وہاں ان کی یادگار تعمیر کی جائے گی۔

شہید فخرو مرزا ایک نہایت ایماندار، محنتی، جفاکش اور سچے محب وطن انسان تھے۔ انہوں نے اپنے کاندھوں پر اینٹ ڈھو ڈھو کر کسب معاش کیا۔ برسراقتدار پارٹی کے لیڈروں کی طرح ملک کا خزانہ خالی کر کے اپنی تجوریاں نہیں بھریں۔ بھوکے پیاسے رہ کر سڑکوں پہ گذارا کر کے ملک کی تعمیری ترقی میں اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ ان کی دیانت داری جفاکشی اور وطن سے محبت

www.urduchannel.in

اٹوٹ تھی۔ دیش کو ان کی موجودگی کی بڑی ضرورت تھی۔ لیکن کچھ تو تقدیر کا دخل اور کچھ ہمارے وزیراعظم کی سخت لاپرواہی نے انہیں ہم سے چھین لیا ہے۔ ان کے جانے سے دیش کا جو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اس کا اتلاف کسی بھی صورت ممکن نہیں۔''

وزیراعظم نے ایک گہرا سانس کھینچا کہ مخالف پارٹی نے بساط سیاست پر اپنی چال چلنے میں بڑی چابک دستی برتی ہے۔ مگر موصوف بھی وزیراعظم یوں ہی نہیں بن گئے تھے۔ وہ اس سانپ سیڑھی کے کھیل کے کہنہ مشق کھلاڑی اور پرانے چاول تھے۔ وہ مخالف پارٹی کے سیاسی رہنما کو اس وقت سے جانتے تھے جب وہ خود بھی برسرمخالف لیڈر تھے اور ایسی پینترے بازی کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ البتہ یہ بات ان کے خواب وخیال میں نہیں بھی آئی تھی کہ اتنی عجلت میں اس ہمدردی کے واقعے کو سیاسی رنگ وروغن لگا کر پیش کر دیا جائے گا۔ وزیراعظم کا مدعا صاف تھا۔ انتخابات سر پر تھے۔ فخرو مرزا کی لاش پر پھولوں کا چکر چڑھا کر وہ ہمدردی اور انسانیت دوستی کا چکر چلانا چاہتے تھے تاکہ ان کے حلقۂ انتخاب کے ووٹرس ان سے متاثر ومرعوب ہو جائیں۔ البتہ اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وزیراعظم نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھوں ہونے والی پہل کو مخالف پارٹی نے ہتھیا لیا ہے۔ اس واقعے کا سارا فائدہ مدمخالف کی جھولی میں جا گرے گا۔ یہ تو قطعاً مناسب نہیں۔ یہ گوارا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب وزیراعظم کو اپنے داؤ پیچ چلنے کا موقع فراہم ہو ہی گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے وہاں جمع عوام سے فائدے کی سیاست کرنے والوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے اپنا موقف یوں پیش کیا۔

''شہید فخرو مرزا میرے حلقۂ انتخاب کے مخلص سیاسی ورکر تھے۔ (سفید جھوٹ) ان سے میرا تعلق بہت قریبی بلکہ برادرانہ تھا۔ ان کی اناگہانی وقت موت سے مجھے بڑا گہرا صدمہ پہنچا

ہے۔اسی تعلق اور رشتے کی بنیاد پر میں نے اسپتال پہنچ کر شہید فخرو مرزا کے تئیں اپنا خراج عقیدت پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔اگر مخالف پارٹی کے سیاسی رہنما ذمے دار ہوتے میرے اس قلبی تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔یہاں ایسا کوئی تنازعہ نہ پیدا کرتے جس پر سیاست کر کے اس غم کی گھڑی میں غیر ضروری دخل اندازی کی جاتی۔یہ لاشوں پر سیاست کرنے کا نہیں بلکہ ملک کو فلاح و بہبود، تعمیر و ترقی کی طرف لے جانے کا وقت ہے۔ہم اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں۔ان کاموں سے ہی گھبرا کر مخالف پارٹی اوچھے سیاسی ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔اس عمل سے عوام کے سامنے ان کا چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے۔

بہر حال آج صبح کی ہنگامی مجلس وزارت میں یہ فیصلہ لیا گیا ہے کہ شہید فخرو مرزا کے جنازے کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھان کے جسد خاکی کو پرچم میں لپیٹ کر کل شام چار بجے مرکزی قبرستان میں دفنایا جائے گا۔صبح تا دوپہر ایک بجے تک شہید فخرو مرزا کا جسد خاکی وزیر اعظم کی رہائش پر عوامی زیارت کے لئے رکھا جائے گا۔ان کے تئیں سرکار کی جانب سے اعزاز کیا جائے جو بے چارے ریل کی پٹریوں پر سوتے ہوئے اس طرح شہید گئے۔اس طرح سرکار نہ صرف شہید فخرو مرزا کا بلکہ ملک وقوم کے تمام غریب عوام کے تئیں سنجیدگی اور عزت و آبرو کی فکر کا اظہار کرتی ہے۔سرکار کے اس عمل سے ان کی عزت نفس، حوصلوں اور خود اعتمادی کو تقویت پہنچے گی۔جو غریب اینٹ گارا ڈھو کر ملک کی تعمیر میں بیش قیمت تعاون دیتے ہیں۔نیلے آسمان کی چادر تلے سو جاتے ہیں قربانی ایثار کی بہترین مثالیں پیدا کرتے ہیں۔

سارے ملک کی جانب سے شہید فخرو مرزا صاحب کے پس مرگ اس طرح اعزاز کرنے سے لاشوں پر سیاست کرنے والوں کے ہاتھ ایک سنہرا موقع جاتا رہے گا۔یہ سرکار عوام کے اٹوٹ

www.urduchannel.in

تعاون سے بنی ہے۔لہذا یہ اس قسم کی گھناؤنی سازش کی اجازت قطعی نہیں دے گی۔مجلس وزارت کی میٹنگ میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ شہید فخرو مرزا کے اہلخانہ کا کوئی بھی فرد تعلیم یافتہ پایا گیا تو اسے مناسب کاروبار یا سرکاری ملازمت دینے پر غور کیا جائے گا۔یہ بھی دیکھا جائے گا کہ کہیں کسی قانونی گنجائش کے تحت ان کے نام پینشن جاری کی جا سکتی ہے یا نہیں۔اگر شہید فخرو مرزا کے بچوں میں کوئی تعلیم کے لئے کوشاں ہو گا تو سرکار اس کی مفت تعلیم اور کتاب کاپیاں بھی مفت فراہم کرے گی۔اس طرح حکومت کی جانب سے دیگر سہولیات بھی وقتاً فوقتاً شہید فخرو مرزا کے اہلخانہ کو مہیا ہوں اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔"

وزیر اعظم کے اس موقف کے بعد شہید فخرو مرزا کی نعش پر ان کی پارٹی کا قبضہ ہو گیا تھا۔جب شہید فخرو مرزا کے اہلخانہ نعش آخری رسومات کے لئے آگے بڑھے اور تجہیز و تکفین کے بعد تدفین کو لے جانے لگے تو وزیر اعظم کی جانب سے نعش حوالے کرنے سے انکار کر دیا گیا۔مخالف پارٹی کے رہنما اور سیاسی اہلکار اس طرح برسر اقتدار پارٹی کے نعش پر قبضہ جمانے کے اس عمل پر برہم ہو گئے۔

مخالف پارٹی کے لیڈر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پوری طاقت سے گلا پھاڑ کر چیخ چیخ کر تقریر شروع کر دی۔"اپوزیشن نہیں! وزیر اعظم خود لاشوں کی سیاست پر اتر آئے ہیں اور الزام ہمیں دیتے ہیں۔وزیر اعظم کے عزت مآب عہدے پر بیٹھ کر ایسی اوچھی حرکت زیب دیتی ہے کیا؟ عوام خود فیصلہ کرے۔ہماری پارٹی اپنی بے داغ تاریخ میں ایک بھی ایسا گھناؤنا کارنامہ سر انجام دینے میں یقین نہیں رکھتی۔حقیقت یہ ہے کہ جوں ہی ہماری پارٹی نے شہید فخرو مرزا کی دردناک اور بے وقت موت کا نوٹس لیا۔وزیر اعظم نے فوراً مجلس وزارت کی ہنگامی میٹنگ طلب کی اور کچھ ایسے اہم

اور فوری فیصلے لئے کہ شہید فخر و مرزا کا اعزاز بھی ہو جائے۔ گاندھی کے تین بندروں پر مشتمل اس اندھی، بہری اور گونگی سرکار کی توجہ ملک کی غریب، سطح غربت کے زیریں طبقات کی طرف گیا۔ جو آئے دن بسوں، ٹرکوں وغیرہ کے نیچے کچل کر مرتی رہتی ہے۔ البتہ وزیر اعظم نے اپنی ذمہ داری کے تئیں کبھی انصاف نہیں کیا ہے۔ آج تو انہوں نے اس دردناک حادثے کو بھی سیاسی رنگ بھی دے دیا ہے۔ مخالف پارٹی وزیر اعظم کی اس سنگین تاناشاہی اور غیر انسانی برتاؤ کی پرزور الفاظ میں مذمت کرتی ہے۔"

مخالف پارٹی کے لیڈر نے لمحہ ٹھہر کر گردن کو گول گھما کر عوامی تاثرات کا جائزہ لیا۔ جب لیڈر کو یہ احساس ہو گیا کہ اس کی باتوں پر کان دھرے جا رہے ہیں تو دوبارہ اونچے سروں میں تقریر جاری رکھی۔

"اسی کے ساتھ شہید فخر و مرزا کے ذریعے کی گئی قومی و تعمیری خدمات کے تئیں ہم دوبارہ اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ آج بھارت ماں کو ایسے کروڑوں سپوتوں کی ضرورت ہے۔ اسی وقت ہم اس کی آنکھ کے اشکوں کی آخری بوند بھی صاف کر سکتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں فخر و مرزا کی خدمات کے سلسلے میں کہ سرکار کی جانب سے اٹھایا گیا قدم اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مثل ہے۔ ایسے موقعوں پر وزیر اعظم کو چاہئے کہ وہ فراخ دلی اور خلوص کا مظاہرہ کریں۔ البتہ یہاں انہوں نے سطحی اور کم درجے کی سیاست کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہماری پارٹی عوامی چندے سے مزید دس لاکھ روپئے جمع کر کے شہید فخر و مرزا کے اہلخانہ کی مدد کرے گی۔ لیکن یہ جان کر کہ وزیر اعظم فوراً اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم سے بڑی مالی امداد کا اعلان کی سیاسی چال چل دیں گے۔ مخالف پارٹی نے اپنا موقف تبدیل کر دیا ہے۔ ہم ذمہ دار اپوزیشن کے طور پر وزیر اعظم یا ان کی پارٹی سے مقابلہ

www.urduchannel.in

آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ وزیر اعظم کی گھناؤنی لاشوں کی سیاست میں شریک بھی ہونا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ہم شہید فخر و مرزا کی یادگار، مجسمہ سازی وغیرہ کے اعلان واپس لیتے ہوئے دکھ الم اور اندوہ کی اس گھڑی میں ہم شہید فخر و مرزا کی ناگہانی موت کے صدمے سے دو چار ہیں۔ ہم اپنی اعلانات سے محول خراب کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے ہمیشہ ملک کے مفادات کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہمارا مشن اب بھی وہی ہے۔

اب گیند وزیر اعظم کی کورٹ میں چلی گئی تھی۔ انہوں نے بھی دوبارہ اپنا موقف پیش کیا۔ "یہ بہت اچھی بات اور صحتمند سوچ ہے کہ اپوزیشن نے ہمارے دباؤ میں آ کر "لاشوں پر سیاست" سے گریز کر لیا ہے۔ اور اپنی پراگندہ سوچ کو مثبت اور ملک کے فائدے کی جانب موڑا ہے۔ اپنے گمراہ کرنے والے وعدے بھی واپس لئے۔ ہم ان اقدام کا خوش آئند استقبال کرتے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اپوزیشن اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے اپنے فرائض بخوبی انجام دے گی۔ دراصل اپوزیشن نے بڑی عجلت میں ایک حادثے کو سیاسی رنگ دے دیا تھا۔ کچھ حلقوں میں سرکار کی اس بات پر مذمت بھی کی جا رہی ہے کہ سرکار شہید فخر و مرزا کے اعزاز کی بجائے لاشوں پر سیاست جیسے گھناؤنے فعل میں پڑ گئی ہے۔ مگر ہم اسے ہرگز قبول نہیں کرتے ہم نے اپنے ابتدائی خطاب میں ہی اپنی آمد اور سرکار کے فیصلوں سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ پھر بھی سرکار کسی غیر ضروری تنازعے کا شکار نہیں بننا چاہتی۔ لہٰذا سرکار نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ شہید فخر و مرزا کے اہلخانہ کو ملنے والی تمام مراعات پر امتناع عائد کیا جائے۔ سرکار کو امید ہے کہ اب اپوزیشن بھی اس تنازعے کو سیاسی رنگ دینے سے باز آ جائے گی۔"

اس کے بعد سرکار نے پارلیمنٹ میں بل پاس کر کے ایک قانون کو حتمی شکل دے دی کہ

ریل کی پٹری پر تفریحاً، مجبوراً، خودکشی یا شرارت کی غرض سے سونے والوں کو دس ہزار نقد جرمانہ اور قید بامشقت کی سزا دی جائے تاکہ رات ہو یا دن ریل کی آمدورفت میں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ سرکاری املاک کی حفاظت کی جاسکے۔ مشت بھر ہی سرکاری خزانے میں اضافے کی سبیل نکل سکے۔ کسی حادثے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش ناکام بنادی جاسکے۔ مفت رقم تقسیم کرنے، یادگار یا مجسمے بنانے اور اسراف پر روک تھام کی جاسکے۔

www.urduchannel.in

۷۸۔ مردہ بدست زندہ

ہر شہر میں دو چار خودساختہ عظیم قسم کے افراد رہتے بستے ہیں۔ جن کے چہروں پر سدا مسکنت، تعزیت و رسوگواری کے آثار نظر آتے ہیں۔ جیسے بس ابھی آپ نے کسی مرحوم کا ذکر چھیڑا کہ آنسوؤں کا سیلاب ضبط کے باندھ کو توڑ کر سارے ماحول کو غم واندوہ کے سیلاب میں تہہ آب کردے گا۔ ہمیں ان کی دیگر عادات واطوار سے کوئی خاص سروکار نہیں۔ البتہ ان کی یہ عادت پر ضرور داد دینا مقصود ہے کہ وہ مرحوم کی تعزیت اور خراج عقیدت پیش کرنے میں بڑے ماہر بلکہ چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔ ادھر کسی کے اس دنیائے فانی سے کوچ کرکے آنجہانی ہونے کی خبر کی تصدیق ہوتے ہی یہ پہلے ان کے افراد خانہ سے تعزیت اور بعد میں جلسے، جلوسوں اور پروگراموں میں خراج عقیدت دینے کے لئے مرے جاتے ہیں۔ گویا

ادھر کوئی مرا کہ ادھر تقریب کا بہانہ ہوا

جس طرح بلڈ پریشر بڑھتے ہی انسان پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ اسی طرح وہ خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے چھٹپٹانے لگتے ہیں۔ کب وہ اسٹیج پر سوگوار، روتی بسورتی صورتیں بنا کر تھوڑا سا آنسو بہانے کی اداکاری کرکے سفید رومال سے فرضی آنسو خشک نہ کرلیں۔ ان کے سینے میں ٹھنڈک نہیں اترتی۔ مرحوم سے اپنے تعلق کے تصنع آمیز تعلقات اور ایک دو فرضی و حقیقی واقعات عوام کو سنا نہ لیں۔ انہیں چین میسر نہیں آتا چونکہ اس بات کا کامل یقین ہے کہ ان کے اس بیان کی توثیق یا تردید کے لئے اب مرحوم تو لوٹ کے آنے سے رہے۔ یوں بھی جانے والے کبھی نہیں آتے۔ جانے والوں کی تو صرف یاد آتی ہے بلکہ بہت ستاتی ہے۔ بس ان کی یہی ادائے معصومانہ سب سے متاثر کن اور اس تحریر کا محرک بھی ہے۔

جب ان حضرات سے اسقدر زور دے کے خراج عقیدت اور تعزیت کی توجیہات و محرکات دریافت کی گئیں تو ان میں سب سے کلیدی شخص نے بڑے تپاک سے کہا۔" دیکھئے جناب! کیا بھروسہ ہے زندگانی، آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ ہمارے دو ہی مقصد حیات رہ گئے ہیں۔ پہلا وطن عزیز کے مرحومین کو زیادہ سے زیادہ خراج عقیدت پیش کی جائے۔ دوسرا یہ کہ خواہ کسی کی بارات، شادی، استقبال، منگنی، ختنہ، بدائی، سگائی میں شریک ہوں یا نہ ہوں البتہ اگر کسی کی رسم تعزیت یا خراج عقیدت کا موقع ہو تو بغیر دعوت نامے کے بھی خلوص دل سے شریک ہونا چاہئے۔ نہ صرف شرکت کو یقینی بنانا چاہئے بلکہ سب سے پیش پیش یعنی آگے کی جانب بیٹھنا چاہئے۔ چونکہ دنیا میں خوشی تو ہر کوئی بانٹتا ہے مگر غم بانٹنا ہی عظمت اور دلیل انسانیت ہے۔" اس کام کے لئے انہوں نے ہار پھول والوں سے، شمع فروشوں، ماچس فروشوں سے، فوٹو فریم والوں سے، دعوت نامے شائع کرنے والوں سے سالانہ خرایداری کا تھوک کے نرخ سے سودا کرلیا ہے جس میں سب سے اہم مدعا کفایت کا ہے تاکہ روزانہ یا ہر مرتبہ نئے سرے سے دام چکانے میں محنت، رقم، وقت اور الفاظ کی فضول خرچی کو پس انداز کیا جاسکے۔ کئی سرکردہ افراد کا تو مذکورہ تاجروں اور دکانداروں سے ادھار اور سالانہ ادائیگی کا سلسلہ بھی دراز ہوتا ہے۔

ان دو عظیم ترین کاموں میں انہوں نے ساری حیات کا بیڑہ غرق کر رکھا ہے۔ یہ بھی ان کی خوش قسمتی کہ مرحومین کی تعداد میں اطمینان بخش اضافہ ہوا اور ان کی تعزیتی تقاریب و خراج عقیدت کے پروگراموں کو مہمیز مل جاتی ہے۔ ابھی ایک شخص کی ناگہانی وفات کے بعد اس کی تدفین سے فارغ ہو کر اس کی پر سوز تعزیت اور خراج عقیدت کے بعد گھر آئے ہی تھے۔۔ ہاتھ منہ دھو کر چین بھی نہ لیا تھا، پیٹھ بھی زمین سے نہیں ٹکائی کہ خبر کانوں میں پڑی کہ محلے میں ہمسائے کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب وہاں پہنچے تو علم ہوا کہ وہ ہمسائے بیرون ممالک میں برسر روزگار مقیم تھے

www.urduchannel.in

۔لہذا وہیں حرکت قلب بند ہو جانے سے آنجہانی ہو گئے۔ ادھر اپنے ہم وطن کی خراج عقیدت نمٹا کر ہی فارغ ہوئے کہ غیر ملکی مقیم ہمسائے کی خراج عقیدت تقریب کی تیاری میں سرگرداں ہو گئے۔ گویا سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ کبھی کبھی تو دوران خراج عقیدت ان حضرات کی زبانی ہی عوام کو علم ہو پاتا ہے کہ مرحوم اتنی ساری خوبیوں کے مالک اور اتنے قابل فخر کارنامے بھی نے انجام دئے تھے۔ جن کے پس مرگ یہ پیدا شدہ خلا ناقابل تلافی ہی ہوگا۔

قدرت نے اس عظیم خدمت کے اعتبار سے فخرو مرزا کو رنگ روپ، قد کاٹھ، آواز اور انداز سے بھی سرفراز کیا ہے۔ گویا وہ خراج عقیدت اور اظہار تعزیت جیسے اہم اخلاقی، انسانی، ملی، عائلی و قلبی خدمت کو انجام دینے کی خاطر ہی پیدا کئے گئے تھے۔ ان کی آنکھیں سدا ڈبڈبائی اور غم واندوہ کی ترجمان ہوتی ہیں۔ انہیں دیکھ لیں تو ان کے روہانسے چہرے سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ بس ابھی ہی رو پڑیں گے۔ عام شخص بلا تامل یہ رائے قائم کرنے میں
آزاد ہے کہ اسی شخص کے اہل خانہ میں ضرور کوئی چل بسا ہوگا جو بے چارہ سوگ و ماتم سے رو رہا ہے۔ اسے اس پیشہ ورانہ گرُ کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا انداز بیاں بھی خراج تحسین کے رٹے رٹائے زبان زد کلام پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ پچھلے عام انتخابات میں ہمارے محلے کے سرکردہ سیاسی رہنما بدقسمتی سے جیت نہ سکے لہذا ہار گئے۔ میں نے اسی گروہ کے سربراہ فخرو مرزا سے اتفاقی ملاقات میں یوں ہی سرسری طور پر انتخابات میں شکست کی وجوہات جاننے کے لئے رسمی سا سوال کیا تو عادت کے مطابق تصنع آمیز گمبھیر آواز میں مخاطب ہوئے۔" آدمی اچھا تھا لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ خدا ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور نیک اعمال کی توفیق بخشے (آمین)۔"
مجھے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط ہوئی۔ تب میں چٹکی لیتے ہوئے دریافت کیا۔" جناب اعلیٰ! آپ میں یہ تعزیت و خراج عقیدت پیش کرنے چسکہ کہاں سے اجاگر ہو گیا؟"

موصوف تنک کر کہنے لگے ۔”یہ تو ہمارا خاندانی پیشہ اور اخلاقی ذمہ داری ہے ۔ والد صاحب کی اس میدان میں اس قدر خدمات ہیں کہ جب تن انہیں بذات خود ان کی کسی کی موت کے خراج عقیدت اور تعزیت نامے کی تکمیل نہ ہو جاتی ۔ جب تک خود مرحوم کو بھی اس کی لذت تحریر کا لطف نہیں آتا ہے ۔ کرلیں انہیں موت بھی گوارا نہیں ۔ اسے اپنی موت بھی رائیگاں ہی محسوس ہوتی تھی ۔ جب میں چھوٹا تھا تو اپنے والد صاحب کے ساتھ ایسی نشستوں میں شریک رہتا تھا اور دو منٹ کی خاموشی سے یقین آ گیا کہ روحوں کو سکون پہنچانے کا یہی سب سے مختصر، مفت، مفید اور من پسند راستہ ہے ۔ خود اعتمادی مائل ہوتے ہی مذکورہ پیشے کا خاندانی تقاضے کے مطابق حق ادا کرنے میں سرگردان عمل رہا ہوں ۔

انہوں نے منہ کھول کر ایک طویل سانس زور سے کھینچا شاید آکسیجن کم پڑ گئی تھی مگر تشفی ابھی کہاں میسر؟

انہوں نے از سرِ نو کہنا شروع کیا ۔”میرے والد محترم کا ارشاد تھا کہ بیٹا! ہم غریب ملک کی غریب عوام ہیں ۔ یوں بھی ہم اپنی جانب سے سوائے خراج عقیدت اور تعزیت کے کچھ دے بھی نہیں سکتے اور شکیل بدایونی صاحب نے ہمارا کام یہ کہہ کر مزید آسان کر دیا ہے کہ جانے والے کبھی نہیں آتے ۔ جانے والوں کی یاد آتی ہے ۔ لہٰذا تم میرے مرنے کے بعد ہماری خاندانی روایت کو ہر حال میں برقرار رکھنا ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے عقیدت سے آنکھیں موند لیں اور دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اوپر اٹھائے اور بغیر آواز کے دعائیں کرنے میں مصروف ہو گئے ۔ جب وہ فراغت پا چکے تو میں نے استفسار کیا ۔” محترم! یہ آپ کیا کر رہے تھے؟“

انہوں نے کہا ۔”میں اپنے مرحوم والد کی روح کی تسکین کے لئے دعائیں کر رہا تھا ۔ انہیں کے

نیک مشوروں اور احسن روایات کے طفیل میرا نام آج کی وی آئی پی فہرست میں شامل ہے ۔ اخبارات میں میری تصاویر اور نام کے چرچے ہیں ۔ ورنہ چھوٹے موٹے تاجروں کو کون منہ لگاتا ہے؟ کسی روز مکان پر تشریف لائیے میں آپ کو کئی ڈائریاں دکھاؤں گا جنہیں میں نے خراج عقیدت پیش کرنے میں پہل کی ۔“

میری رگ ظرافت پھڑک اٹھی ۔ میں نے شرارتاً استفسار کیا ۔”آج کل دھندہ کیسا چل رہا ہے؟“

انہوں نے منہ بسور کے کہا ۔”بالکل مندہ ہے جی ۔۔۔ اب دیکھو ناں ۔۔ پچھلے دو مہینے سے کوئی قابل ذکر شخص مرا ہی نہیں ۔ اخبار میری تصویر کے بغیر سونے سونے معلوم ہو رہے ہیں ۔ کل تنگ آ کر سول ہاسپیٹل کے اور دیگر ڈاکٹروں کو بھی فون کیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب اگر ایسا کوئی ممکنہ کیس سیریس ہو تو مجھے پہلے اطلاع دے دینا ۔ پروگرام کی تیاری کے لئے کہیں وقت کم نہ پڑ جائے ۔ آج کل ہال اور دیگر انتظامات کے ساتھ پبلک کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے ۔ ڈاکٹروں کے جواب نے بڑا مایوس کیا ۔ کہنے لگے فخرو بھائی آج کل داد، کھجلی اور کالی کھانسی کی وبا پھیلی ہوئی ہے ۔ کسی کو مرنے تک کی فرصت میسر نہیں ہے ۔“

میں نے سنجیدگی سے سوال کیا ۔”فخرو بھائی! پھر کیا سوچا آپ نے؟“

فخرو بھائی نے ایک طویل جماہی لی جیسے مجھے ہی نگلنے کی تیاری میں ہوں پھر کان کھجاتے ہوئے کہا ۔”طبیعت میں بڑی گرانی سی آ گئی ہے ۔ سوچتا ہوں کہ اپنے آبائی وطن چلا جاؤں ۔ یوں بیٹھے بیٹھے تو مجھ پر بھی قنوطیت طاری ہو جائے گی ۔“

میں نے ان کی بات کو سہارا دیتے ہوئے کہا ۔”اردو ادب کی خدمت ہو یا تعزیت اور خراج عقیدت کی خدمات ان میں زیادہ فرق نہیں ہے ۔ اگر کام نہ ہو تو قنوطیت طاری ہو ہی جاتی ہے ۔“

انہوں نے اپنی بات مرغ کی ایک ٹانگ کے طور پر پھر درمیان میں رکھ دی اور کہنا شروع کیا ۔

"پچھلے ماہ کملا ایکسپریس پٹریوں سے اتر گئی تھی۔اجی کہنے کو بہت بڑا حادثہ تھا۔ہم بھی خبر سنتے ہی بھاگے کہ چلو بیٹھے سے بیگاری بھلی۔مگر الٹے بانس بریلی کو کی مصداق بیرنگ لوٹنا پڑا۔اس بھیانک حادثے میں کوئی بھی نہیں مرا۔سارا مہینہ اخبار کے صفحات پر نہ نام چھپا اور نہ ہی تصویر چھپی۔اگر یہی عالم رہا تو اپنا وی آئی پی اسٹیٹس خطرے میں ہے۔"

میں نے ٹکڑا لگایا "سرکار بھی تو ہر معاملے میں سیاست کرتی ہے۔کبھی مرنے والوں کی صحیح تعداد ظاہر نہیں کرتی۔"

فخرو بھائی نے جواب دیا "اجی صاحب! وقت یہ آگیا ہے کہ میں روزانہ ریلوے اسٹیشن جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کتنے افراد ممبئی جارہے ہیں ان کے نام اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیتا ہوں۔پھر شام کو یا دوسرے دن پتہ لگاتا ہوں کہ وہ تمام صحیح سلامت لوٹے یا نہیں؟ جانے کب انہیں تعزیت اور خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔میری شہرت اور وی آئی پی اسٹیٹس سے کئی حاسدین نے بھی یہی کام شروع کردیا ہے۔مقابلہ بڑا سخت چل رہا ہے۔ان پر سبقت لے جانے کی خاطر یہ ساری کوشش ہے۔اپنے ملک میں یوں بھی حیات اور موت کا کوئی اعتبار نہیں ہے پھر میں کیوں بے خبر رہوں؟"

میں ان کے نقطۂ نظر، جذبۂ خلوص، دیانت داری اور اولوالعزمی کا قائل ہوگیا کہ فخرو مرزا اپنے مقصد کے تئیں کتنے ایماندار اور کوشاں ہیں۔عظیم افراد کی یہی علامات ہوتی ہیں۔اگر یہی اوصاف ہماری سیاسی جماعتوں اور ان کے سیاسی رہنماؤں میں ہوں تو وطن عزیز کے مستقبل کی تابناکی میں کوئی دورائے نہیں ہوگی۔

میں نے کہا "فخرو بھائی! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک مشورہ دوں؟"

وہ خندہ پیشانی سے گویا ہوئے "جی بالکل دیجئے۔ہم برصغیر ہندوپاک کی قوم یہ کام بڑی فراخ دلی

www.urduchannel.in

سے کرتی ہے۔کوئی مانے نہ مانے ہم مشورہ دینے سے باز کہاں آتے ہیں۔اسے اپنا معاشرتی فریضہ جان کر مشورہ دل کے غبار کو نکالنے کی حد تک دیتے ہیں۔میں تو یوں بھی برا نہیں مانتا کئی افراد تو سیاسی رہنماؤں کی طرح ہمیں منہ پر سخت سست سناتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں لیکن اس کے مبادلے میں خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ان گالیاں دینے والوں اور لعن طعن کرنے والوں کی بھی تعزیت اور خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع فراہم کردے۔آمین"

میں نے کہا "وقت گذاری اور مقابل آرائی کے لئے آپ ایک کام کیجئے۔صرف میت کو خراج عقیدت پیش کرنے میں اگر مندے کا سامنا ہو تو اس شخصی خدمت کے سلسلے کو کئی اداروں اور انجمنوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں منعقدہ تعزیتی وخراج عقیدت کی مجلسوں تک دراز کرنے میں دلچسپی لیں۔اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ جب بھی خراج عقیدت کے موضوع پر تحقیق ہوگی تو آپ کی خدمات کا اعتراف بھی ہوجائے گا۔آپ اس میں صف اول کے خادم انسانیت تسلیم کئے جائیں گے۔"

فخرو بھائی نے سر کھجاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے۔میں سمجھ نہیں سکا۔کچھ مثالیں دے کر سمجھائیے ناں۔والد محترم ایسی پیچیدہ باتوں کو مثالوں کے ذریعہ ہی سمجھاتے تھے۔"

میں کہا "مثلاً اگر کوئی بڑا سرکاری افسر رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو آپ انتظامیہ کو خراج عقیدت پیش کیجئے۔جب کسی نئے ٹیکس کا اطلاق اور قانون کا نفاذ عمل میں آئے تو آپ سرکار کو خراج عقیدت پیش کیجئے۔اگر نس بندی کروانے کے باوجود بھی کوئی بچہ تولد ہوجائے تو آپ سول سرجن کو خراج عقیدت پیش کیجئے۔کوئی زنا بالجبر ہوجائے تو جائے وقوعہ کے قریب کے پولس اسٹیشن کو خراج عقیدت پیش کیجئے۔اگر کوئی ٹرین پٹری سے اتر جائے تو وزیر ریلوے کو خراج عقیدت پیش کیجئے۔جہیز کے سبب کسی نوبیاہتا عورت کی موت واقع ہوجائے تو آپ سماج کے ٹھیکداروں کو

خراج عقیدت پیش کیجئے ۔کوئی فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے تو آپ مذہب یا مذہبی رہنماؤں اور سیاسی رہنماؤں کو خراج عقیدت پیش کیجئے ۔اب اس کے بعد کہاں کہاں خراج عقیدت کی اہمیت وافادیت درکار ہوتی ہے یہ تحقیق بھی آپ کو ہی کرنی ہوگی ۔اس درمیان تو کوئی نہ کوئی مرتا ہی ہے ۔ لہٰذا قنوطیت اور بے کاری سے بچنے کی یہی ایک تیر بہدف ترکیب ہو سکتی ہے ۔''

وہ بڑے خوش ہوئے ۔ان کی باچھیں کھل اٹھیں ۔انہوں نے اپنی نشست سے اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور زور سے بھینچا پھر گویا ہوئے ۔''دوست ! آپ نے ترکیب بتانے میں پورے بیس سال کی تاخیر کردی ہے ورنہ مجھے اب تک تو پدم شری، پدم بھون بلکہ پدم وبھوشن، اشوک چکر بھارت رتن جیسے کئی خطابات مل چکے ہوتے ۔''

یہ لمحہ میرے لئے بھی نشاط وانبساط کا تھا کہ اردو ادب میں شعرا و ادبا کو ہمیشہ پس مرگ خدمات کا اعتراف، ایوارڈ یا تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے ۔مجھے جیتے جی کسی ایک مخلص شخص جسے وی آئی پی کا درجہ حاصل ہے اس کے ہاتھوں یہ اعزاز پالوں ۔ورنہ اپنے ہی وطن میں لائق، فائق، ذہین اور طباع ادبا کو جان بوجھ کر فراموش کیا جاتا ہے ۔جہاں سارے مکاتب فکر کے ماہرین کو درج بالا اعزازات سے نوازا جاتا ہے تو ہم ادیبوں نے وطن عزیز کا کیا بگاڑا ہے؟ کیا یہ جتانے کی مزید ضرورت ہے کہ ہم نے بھی خون جگر پیش کیا ہے کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے؟

www.urduchannel.in

۷۹۔لیڈر

معاف کیجئے یہ دلیپ کمار کی فلم لیڈر کا تذکرہ نہیں ہے ۔لیڈر ایک خاص قسم کا سمجھ دار، بردبار مگر عیار اور مکار جرثومہ ہے جو ہر ملک وملت میں عام طور پر پایا جاتا ہے ۔اسے قوم کے سر پر سوار ہونا، اقتدار کا مزہ چکھنا، داؤ پیچ کھیلنا، لفاظی کرنا اور جذبات اور بات کا بتنگڑ بنانا، توڑ جوڑ کا عمل، عوامی سوسائٹی کے میدان میں دوڑ لگانا بہت عزیز ہوتا ہے ۔اس کی شکل وصورت، جثہ، قد و قامت حضرت انسان سے بالکل مشابہ ہوتی ہے مگر یہ حضرت انسان سے بسیار خوری اور بسیار گوئی میں چار جوتے آگے کی چیز ہوتا ہے ۔موقع پرستی اور مفاد پرستی اس کی سرشت میں داخل ہے ۔اس کی نظر کمزور ہوتی ہے یہ مطلب نکل جانے کے بعد انسان اور اس کے احسانات کو باوجود کوشش تمام پہچان نہیں پاتا ۔بجائے تعاون کے نابینا، گونگا، بہرہ، لنگڑا، لولا، بن جانا پسند کرلیتا ہے ۔ورنہ لیڈر اخبارات اور جلسے جلوسوں میں ہوا باندھنے اور بیان بازی کے ذریعے پرامن حالات کی ساکت جھیل میں پتھر مارنے کی عادت کو عادت ثانویہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیتا ہے ۔اسے خواب میں وزارت کی کرسی، زندہ باد مردہ باد کے نعرے آدھی رات کے بعد نظر آتے ہیں ۔اپنے سیاسی میدان عمل میں مفاد کے پیش نظر یہ جرثومہ سیاسی پارٹیاں لباس کی طرح بدلتا ہے ۔مفاد کے معاملے میں اس کی دیانت داری اس کے ابن الوقت ہونے کی دلیل ہے ۔خواہ اقتدار، وزارت کرسی، جاہ ومنصب اور اختیارات کی بھوک ہو اسے نچلا بیٹھنے نہیں دیتی ۔ناپسند باتیں بھی خوشگواری سے جھیل جاتا ہے گویا

؎ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

یہ جرثومہ موسم گرما کی تمازت، حدت وشدت برداشت نہیں کرپاتا ۔لہٰذا موسم گرما کی ابتدا

ہوتے ہی یہ پہاڑی علاقوں یا مغربی ممالک کے لکژری ہوٹلز میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ مگر سرما میں وہ ان سے واپس لوٹ آتا ہے۔ بالخصوص انتخابات کے موسم میں سخت محنت و مشقت کرتا، بھاگتا دوڑتا نظر آتا ہے۔ دراصل یہ موسم اس جرثومہ کے لئے وعدوں کی خیرات تقسیم کرنے، دام فریب بچھانے نیز اشتہار بازی اور توڑ جور میں بڑا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ موسم انتخابات تولید اور فصل کے لئے بڑا سازگار ثابت ہوتا ہے جس میں نئی نسل کے جرثومے بھی اپنے سیاسی وجود کو منوانے کی جدوجہد میں دن رات کوشاں ہوتے ہیں۔

نئی تہذیب کی کچھ ایسی ہوا آئی　　جس کو دیکھو وہ ہے قیادت کا شیدائی

ورنہ عام دنوں میں یہ دریائی گھوڑے کی طرح آنکھیں موندے سستی و تساہلی سے عوامی مسائل کے سمندر کے ساحل پر مکمل غفلت کے ساتھ آرام کرتا نظر آتا ہے۔ جیسے روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ گو دیکھنے میں یہ جرثومہ نہایت سیدھا سادہ رعایا پرور، مہربان و خوش گو ہوتا ہے مگر دراصل ایسا بالکل بھی نہیں ہوتا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں یہ دھوکہ بازیگر اکثر کھلا

انہیں اشیائے خوردنی میں مرغن اغذیہ، سیب، سنترہ، ناشپاتی، انگور کیلے انار وغیرہ تو ٹھیک ہے مگر بیرون ملک کے پھل جیسے چیری، کیوی، کھجور اور زیتون وغیرہ جو بیش قیمتی اور کمیاب ہوتے ہیں ان کی پہلی پند ہوتے ہیں۔ موقع پڑنے پر گھریلو پکوان سے بھی لذت کام و دہن حاصل کرتا ہے مگر بادل نخواستہ۔ ہاں عوامی خون چوسنا اور بیت المال کے مال سے محبت کا عالم یہ ہے کہ تمام اخلاقی اقدار بالائے طاق رکھ چھوڑی ہیں تو کہنا غلط نہ ہوگا۔

کہنے کو تو لیڈر ایک جرثومہ سہی مگر اس میں خودداری کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیال کے مخالف نہ تو کچھ سن سکتا ہے اور نہ اپنی ساکھ بگڑتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ جس طرح

www.urduchannel.in

سرکاریں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے امن اور نظم و ضبط کا راگ الاپتی ہیں۔ اسی طرح لیڈر بھی اپنی تعریف و توصیف

اخبارات کے صفحات، بینروں، پوسٹروں اور دیواروں پر آویزاں دیکھنا چاہتا ہے

مجھ کو دیکھو گے جہاں تک　　مجھ کو پاؤ گے وہاں تک
راستوں سے کاروں تک　　اس زمیں سے آسماں تک
میں ہی میں ہوں، دوسرا کوئی نہیں

اپنے پیچھے زرخرید ورکر، چاپلوس، مدح سرا اور خوشامدی افراد کا وفد لے کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا گھومتا ہے۔ مگر خود جلدی کسی کی حاشیہ برداری اور حمایت کرنے سے گریز کرتا ہے۔

جس وقت اس عجائب الخلقت جرثومے کے جگر میں قوم کا درد اٹھتا ہے تو درد ملت میں بے چین اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ بے اختیار وہ تار گھر کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ کبھی ڈاک خانے کی سمت پیش رفت کرتا ہے۔ جب درد حد سے سوا ہوتا ہے تو وہ بھرے مجمعے میں ہاتھ ہلا ہلا کر تقاریر کرتا ہے، گلیوں میں عورتوں کی طرح کوسنا دیتا ہے۔ کبھی غصے میں ٹیبل پر ہاتھ مار، کر کبھی اسٹیج پیر پٹخ کر اپنے خلوص و محبت اور حب الوطنی و کڑھن کا اظہار کرتا ہے۔ دانت پیستا ہے، آنکھیں سرخ کر لیتا ہے، جذباتی ہو جاتا ہے۔ منہ بنانا، ہاتھ پیر چلانا، ادھر جھکنا، اُدھر گھومنا الغرض سامعین کو الو بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اس کی قابل رحم حالت پر اسی کے حمایتی، نمک خوار یا رحم دل عوام اسے پانی یا دودھ سے لبریز گلاس پیش کر کے اس کی دادرسی کر لیتے ہیں۔ اسے وہ چسکیوں سے گلے سے اتارنے کے بعد بھی باز نہیں آتا۔ حسب سابق چیخنے چلانے، دہاڑنے، غرانے الغرض آسمان سر پر اٹھا لینے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

کبھی کبھی اس جرثومے کی پریشانی خونخواری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو اس کے لئے

اس کی معیادمقررہ کے لئے اسے لال پھاٹک کے بڑے باڑے میں بند رہنا پڑتا ہے۔جو ہر بڑے جرثومے کی معراج ہوتی ہے۔بعض جرثوموں کو آغاز اور شہرت اسی لال پھاٹک سے گذر کر راس آتی ہے۔جہاں نہ حسب خاہش دانہ و چارہ ملتا ہے نہ مزے دار میدان ہی میسر آتا ہے۔اس دنیا میں داخلے کے بعد ناتجربہ کاری اور سیاسی طاقت کے زعم میں پہلے تو لیڈر گرجتا غراتا ہے۔مگر کچھ دنوں بعد ہی شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر مانوسیت کے ساتھ پانی پینے کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

اس جرثومے کے پیر نہایت کمزور ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ انتخابات میں کھڑا رہ جانے کی جسارت کرتا ہے۔وزارت کے لئے شدت کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔میدان سیاست کے علاوہ اپنی پارٹی میں پاؤں جمانا بھی ایک مسئلہ ہے ورنہ فی زمانہ کے مقابلہ جاتی اژدھام میں بے ثباتی اور متبادل کے انتخاب کا شکوہ عام ہے۔ان تمام عذر کے سبب جرثومے کے پیر اقدر کمزور ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے پیروں پر چلنا بہت کم پسند کرتا ہے۔اسے ہوائی جہاز کے نرم وگداز کشن، سرکاری گاڑیوں میں سفر، ریلوے کے فرسٹ کلاس اے سی کوچ کے گدُگدُے گدے اور موٹروں میں موجود نرم وملائم گدے اور تکئے دیکھ کر اس کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔اس کی ترجیحات میں ہوائی سفر میں دستیاب غذا سب سے متوازن اور مقوی ہوتی ہے۔لہذا وہ حیلے بہانے ہوائی سفر کا اہتمام ضرور کر لیتا ہے ارزاں یا کم قیمت کی سواریوں میں سفر ایک تو عزت نفس پر چوٹ کا خطرہ اس پر حرکت کسر شان تصور کی جاتی ہے۔

جرثومے میں ایک بڑی خصوصیت ہوتی ہے کہ اپنے مدعو کئے جانے ڈاک یا دعوت نامہ پا کر اس کی صحت یا تو انتہائی خراب ہو جاتی ہے یا پھر اسے ہنگامی میٹنگ میں شرکت کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔لہذا وہ عدیم الفرصتی کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔اسی لمحے دلی سے یا ہائی کمان سے کوئی

www.urduchannel.in

تار یا ایس ایم ایس موصول ہو تو وہ چست درست رخت سفر باندھنے کی فکر اور تیاری میں مصروف ہو جاتے ہیں۔خواہ دنیا ادھر کی اُدھر نہ ہو جائے اب ہوائی سفر کا نقصان کسی حال میں ممکن نہیں ہے۔اس طرح اپنی یقینی شرکت کی یقینی دہانی کا جواب آن کی آن میں دے دیتے ہیں۔تاکہ ہوائی اڈے پر ان کی آمد پر استقبال میں تازہ پھولوں کا ہار، انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کرنے والوں کا وفد پیشگی طور پر موجود رہے۔ورنہ یہ جرثومہ نہ صرف سختی سے پیش آتا ہے اور روٹھ جاتا ہے، بدک جاتا ہے۔کبھی کبھی تو لوٹ کر اپنے گھر جانے کی بجائے کسی دوسری سیاسی پارٹی کے در پر دستک دے کر من چاہی مراد یعنی منصب، عہدہ اور وزارت بھی پا لیتا ہے۔

گویہ جرثومہ ہے مگر سڑی گلی بوسیدہ کرم خوردہ عمارتوں اور انگریزوں کی متروکہ بھوت بنگلہ نما حویلیوں میں بسیرا نہیں کرتا۔اسے اول درجے کی جدید سہولیات سے آراستہ پختہ عمارت کے بغیر اسے چین نہیں آتا، نہ نیند ہی آتی ہے۔گو خود کسی جھونپڑی میں گلی محلوں میں عام بچوں کی طرح پلا بڑھا ہو۔یہ جرثومہ عام دنوں میں باتیں کرنے میں بھی بڑا کنجوس واقع ہوتا ہے۔چھوٹے لوگوں یا عوام الناس کے تو پاس پھٹکنے نہیں دیتا ہے۔ہاں اگر کچھ بڑے لوگ جو کئی مرتبہ اس کے دروازے سے بیرنگ لوٹ گئے تھے۔ان سے گھڑی دیکھ کر نپی تلی گفتگو ناپسند کرتا ہے۔

جس قدر بھیڑئیے کو بھیڑ سے محبت، رغبت اور انسیت ہوتی ہے۔اسی کے مترادف لیڈر بھی بیت المال کی مال و دولت سے محبت کرتا ہے۔حساب دہی، حساب فہمی اور حساب رکھنے کے سوال پر نا صرف اپنی توہین محسوس کرتا ہے بلکہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔بیرونی دنیا میں لیڈر جتنا پر جوش اور بااعتماد نظر آتا ہے۔اپنی ذاتی خوابگاہ میں وہ ہرگز ایسا نہیں ہوتا۔چونکہ اس کی اندرونی و بیرونی دنیا میں خاصہ تفاوت پایا جاتا ہے۔جو بے چارے معصوم اور سادہ لوح افراد اس فرق کے امتیاز سے واقف نہیں ہیں وہ دام فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔بلآخر تکلیف اٹھاتے

ہیں۔

اس جرثومے سے میل ملاقات کے بھی بعض آداب ہوتے ہیں۔کسی سے وہ کھلکھلا کر 'شیک دم' کرتا ہے۔کسی کے نصف ہنسی پر ہی اکتفا کر لیتا ہے۔کسی کے آگے سنجیدگی، اداسی اور نمائشی مایوسی کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔کسی کے ساتھ منہ پھلا کر بھنویں چڑھا کر اپنے تجربات کو نمک مرچ کی آمیزش کے ساتھ تاثرات پر مکمل قابو رکھتے ہوئے یوں پیش کرتا جیسے بچے آپس میں ایک دوسرے کو فلم کی کہانی اور مخصوص سین کی اہمیت اور شدت دکھاتے ہیں۔جس کی تقدیر میں جو رقم کیا ہوتا ہے وہ ویسا ہی پھل پاتا ہے کہ مصداق سیدھے سادے افراد کی شکلوں، خطوط اور معاملات کو گھول کر پی جانا ان کے سوالوں کو ہضم کر جانا لیڈر کی خاص خصوصیت سمجھنی چاہیئے۔

لیڈر کی وضع قطع، لباس کی تراش خراش بھی منفرد اور جداگانہ ہوتی ہے تاکہ وہ دوسرے نمایاں اور قابل شناخت ہو۔حالات کے اعتبار سے اسے رنگ، مزاج، بیان، پارٹی، احباب اور افکار کو نہ صرف تبدیل کرنے میں اسے مہارت حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کی بہتر توجیہات اور تاویلات پیش کرنے میں لیڈر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔جب تعیش اور پیشۂ سیاست کا فیض اٹھانے کا موقع ہوتا ہے تب وہ بہترین لباس اختیار کرتا ہے۔جب غربا و مساکین اور پارٹی میٹنگ اور جلسے، جلوس، دھرنے اور ہڑتال ہوں تو کھدر پہن کر احتجاج کرنے والے غربا کا ہمراز دمساز بھی بن جاتا ہے۔مختلف مواقع پر نہ صرف عینک تبدیل کر لیتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ نظریہ بھی تبدیل کرنے میں ماہر ہوتا ہے۔اسی طرح مواقع کے مناسبت ولحاظ سے کلائی پر گھڑیاں بھی تبدیل کرتا رہتا ہے۔جب امرا و روسا کے ہاں پارٹی (دعوت) میں جانے کا موقع ہو تو حلیہ امیروں جیسا اور اگر اپنے حلقۂ انتخاب کی میلی کچیلی بستیوں میں جانے کا اتفاق ہو تو حلیہ ان کے عام مزاج اور نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے تبدیل کر لیتا ہے۔اس خصوصیت میں موصوف گرگٹ کی قوم سے دو جوتا آگے کی سوچ

رکھتے ہیں۔جہاں ہر طبقے کی عوام انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتی نظر آتی ہے۔

لیڈروں کی پذیرائی، شہرت، مقبولیت، ہر دلعزیزی اور امارت کو دیکھتے ہوئے لیڈروں کی سی عادات و اطوار ہر شعبۂ حیات کے سرکردہ افراد نے اپنا لی ہیں۔کوئی سیاسی میدان میں اپنی لیڈری کا سکہ جما رہا ہے۔کسی نے بلالحاظ تقدیم و تاخیر مذہبی امور اور قومی شعبے میں لیڈری کے جلوے دکھائے۔کسی کو معاشرتی مسائل میں اپنی لیڈری کی قلانچیں بھرنا بہت راس آ گیا۔کسی کو ذات پات، برادری واد اور طبقہ واریت کے ضمن میں اپنی لیڈری کو چمکانے میں عافیت جانی۔کچھ افراد نے تعلیمی شعبے میں لیڈری کا خمار نکالا، کچھ افراد کو معصوم محنت کش مزدور اور کاریگروں کی لیڈری کا شوق چرایا۔اس طرح یہ شوق ہزاروں شعبہ ہائے حیات پر محیط کر گیا ہے۔اگر کشاکش حیات نے فرصت مرحمت فرمائی۔موقع غنیمت میسر رہا تو ہوائی قلعے کے پھینکم پھاک میدان میں رات کے ٹھیک ساڑھے تین بجے ان لیڈروں کی از سر نو یونین بنا کر انہیں توپ کے دہانوں پر باندھ کر آخری سلام ضرور دیں گے آپ سے شرکت کی عاجزانہ درخواست ہے کہ خس کم جہاں پاک۔

www.urduchannel.in

۸۰۔تماشہ کرسی کا

بنی نوع انسان ایسا سماجی جانور ہے جسے روز ازل سے خیال خام اور خوش فہمی میں گذر بسر کرنے کی عادت، خصلت اور جبلت وراثت میں میسر آئی ہے۔انسان اکثر و بیشتر اسی خوش فہمی کے گمان میں غلط فہمی کا شکار ہوتا رہتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہی نہیں فوق البشر کے عہدے پر فائز ہو چکا ہے۔انسان خواہ مخواہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی عزت وتکریم، توقیر وتعظیم کی بنیاد اس کی اپنی ذاتی صلاحیت، حیثیت، اوصاف کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔جبکہ اس کی خوش فہمی کی بنیاد کرسی کے چاروں پیروں پر ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔جب تک کرسی اور اس سے وابستہ کروفر، اقتدار و اختیار، عزت و وقار کا لطف بھی میسر ہے۔یہ ایک عارضی، نہایت وقتی حیثیت اور جائے امتحان کی متقاضی ذمہ داری ہوتی ہے۔جن پر براجمان اکثر و بیشتر حضرات اس کے حق ادا کرنے کی صلاحیت اور استعداد کی صوابدید نہیں رکھتے۔ہر کس و ناکس کرسی کی طلب میں زبان لٹکائے پھرتا ہے مگر کرسی ہر کسی کے قابو میں آجائے یہ ناممکن ہے ورنہ یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ میں بھی رانی تو بھی رانی کون بھرے پن گھٹ سے پانی۔بہر کیف صاحب جوں ہی کرسی سے اترتے یا اتارے جاتے ہیں۔اس سے ماقبل ان کی از خود عزت اتر جاتی ہے۔صاحب کرسی کو عام آدمی کی جون میں از سر لوٹ آنا پڑتا ہے۔ان کی زبان اسی احساس کی ترجمانی میں رطب اللسان ہوتی ہے کہ

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کرسی دراصل ایک علامت ہے شان و شوکت، عزت و وقار، اقتدار و اختیار کی۔جس کی فطرت میں وفا کم اور بے وفائی زیادہ ہے۔کرسی کا اپنا نشہ وخمار، سرور و غرور اور قصور بھی ہوتا ہے۔عہد ماضی میں کتنے ہی بے جگرے شہزادوں نے اپنے عاشق طبع والد گرامی کو پہلے احتراماً تخت پر بٹھایا اور جوں ہی بات مزاج کے خلاف گذری کہ اپنے والد کا تختہ اور بساط بھی الٹ دینے میں مہارت رکھتے ہیں۔جب تختہ الٹ دینے پر بھی صبر اور اکتفا میسر نہیں ہوتا تو انہیں شہادت کے درجے پر فائز کر دیتے ہیں تاکہ آواگون کی غلط فہمی میں کہیں متوفی، جنتی، شہید اور مقتول کے عہدے سے لوٹ کر آجانے کی گنجائش بھی باقی نہ رہے۔کل ملا کر کرسی جیسے غیر متنفس چوپائے کے لئے متنفس دوپائے کا خون ناحق بھلا کہاں تک جائز ہے؟ راقم الحروف کی نظر میں کرسی دراصل انسان کے ظرف اور اوقاف کو تولنے کا پیمانہ یا آلہ بھی ہے۔کرسی کی چاہ میں انسان راہ بھول جاتا ہے۔رشتوں میں کھٹاس مٹھاس، بُراس اور ستیہ ناس جیسی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔کرسی کے لئے سلام و پیام، قیام و اہتمام کیا جاتا ہے۔کرسی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد تو کوئی اپنا تو کجا بیگانہ بھی نہیں رہ جاتا، کوئی بھی پرسان حال نہیں رہ جاتا ہے۔

یوں تو کرسی کا نشہ وخمار، اختیارات اور دائرۂ کار کے سبب ہوتے ہیں۔مگر اسی عالم رنگ و بو میں ایک کرسی ایسی بھی ہے جہاں انسان راضی بارضا اپنی مرضی سے بیٹھتا ہے۔اس کا خاطر خواہ معاوضہ اور مخصوص بخشش بھی دیتا ہے مگر وہاں نہ تو اپنی مرضی اور اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مجاز قرار پاتا ہے۔وہ عظیم الشان کرسی ہے نائی یا حجام کی کرسی جس پر مو تراشی کی غرض سے بیٹھنے کے بعد سر مو بھی حرکت اپنی مرضی سے کر بیٹھنے کے بعد کوئی عجب نہیں کہ آپ بھی عجائب الخلقت مخلوقات میں شمار ہوں۔لہٰذا ہر حال میں آپ کو نائی یا حجام کی مرضی یا حکم یا مکلف و پابند ہونا لازمی امر ہے تاکہ آپ کی صورت زیبا نکھر آنے اور زیب و زینت میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔حضرت انسان تو یوں بھی صلح جو اور معاملہ فہم ہوتا ہے۔بالخصوص جہاں مہلک ہتھیاروں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔پھر نائی کے ہاتھوں میں رواں استرے، تیز دھار خواتین کی زبان کی طرح چلنے والی تیز رفتار قینچیوں کے آگے یوں بھی پتہ مار کے، دم سادھ کے اور نائی کی ہاں میں ہاں ملا

www.urduchannel.in

کر یہ کٹھن مرحلہ حسن تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے۔ ورنہ حجام سے شوخی کا سودا مہنگا اور بعض اوقات نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ لہذا وہ کرسی انسان کی محکومیت اور مسکنت کا مقام ہوتی ہے۔ اخیر میں وہاں جیب بھی ہلکی ہوتی ہے اور سر بھی ہلکا محسوس ہوتا ہے۔

کرسی کہیں بھی ہو اس کا عارضی ہونا اس کی اپنی بنیادی سرشت میں داخل ہوتا ہے۔ جب تک آپ چوک چوراہوں، گلیوں کوچوں کے چائے خانوں اور کافی ہاؤس (ہوٹلوں) کی کرسیوں پر براجمان ہوتے ہیں تب تک چائے کی چسکیوں کے ساتھ جیب اور طبیعت بھی ہلکی ہوتی رہتی ہے۔ جوں ہی پیسہ ہضم، کھیل ختم ہوجاتا ہے۔ وہ کرسی جس پر ابھی آپ اپنی شایان شان تمکنت کے ساتھ براجمان تھے۔ وہی کرسی اگلے چائے نوش گاہک کو پیش کردی جاتی ہے۔ جو وہاں اصراف کا خواہاں ہو۔ گویا کرسی کا قصہ اور قضیہ اسی قدر مختصر ہے کہ جب تک تھال میں بھات، تب تک تیرا میرا ساتھ۔ کل ملا کر ہر دوسرے شخص کو آپ کی شخصیت سے زیادہ آپ کی قوت صارفیت سے انسیت اور محبت ہوتی ہے۔

بارہا یہ خیال بھی ذہن میں در آتا ہے کہ کرسی کی ایجاد سے ماقبل انسان اپنی بالا نشینی اور شان وشوکت کے لئے کہاں نشستن برخاستن کے فریضے انجام دیتا ہوگا۔ یہ تصور بھی محال اور خیال بھی عنقا ہی ہے۔ البتہ فی زمانہ کرسی کی ساخت، قدر و قیمت، اختیارات و دائرۂ کار کے ساتھ ان کی اقسام کے مطابق ملاقات و مدارات، سوغات و سہولیات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہمسائے ملک میں تخت اور تختے کی کشمکش بزبان امجد اسلام امجدؔ ملاحظہ کیجئے کہ کرسی کے لئے بارہا جان کا مذرانہ بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔

زندگی کے میلے میں خواہشوں کے ریلے میں　　تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں

وقت کی روانی ہے، بخت کی گرانی ہے　　سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے

ہجر کے سمندر میں تخت اور تختے کی ایک ہی کہانی ہے۔

کرسی کے فیوض و برکات کے ساتھ بقول علامہ اقبال

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

کے مترادف کرسی جہاں عزت و شان کی مستحق ہوتی ہے۔ وہیں صاحب کرسی اس پر براجمان ہو کر صاحب کرسی اقربا پروری، مذہبی، ملی، مسلکی و علاقائی عصبیت، رشوت ستانی، بدعنوانی، ناانصافی، حق تلفی، ظلم و استبداد جیسی علتیں جو کرسی کے پائے سے منسلک ہوتی ہیں ان میں ٹخنوں سے لے کر گلے گلے ڈوب جاتا ہے۔ کرسی پر براجمان صاحب اقتدار یہ مطلق فراموش کر بیٹھتا ہے کہ کرسی بذات خود اپنے چوپائیوں پر انحصار کر کے زمین پر ہی ٹکی یا ایستادہ ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جنازے کے بھی چار ہی پیر ہوتے ہیں مگر اسے آخری سفر اغیار کے کاندھوں پر اٹھا کر اخیر منزل تک لے جایا جاتا ہے۔ یہی نہیں روز محشر بھی حساب و کتاب عرش کی کرسی کے مقابل ہی دینا ہوگا۔ جو کل کائنات عالم کا خلاق ہے۔

www.urduchannel.in

کوائف مصنف

ذاتی کوائف (من آنم کہ من دانم)

نام	**انصاری شہزاد بخت خورشید احمد انجینئر**
قلمی نام	شبؔ انصاری
جائے ولادت	مالیگاوں، ضلع ناسک مہاراشٹر
تاریخ ولادت	۷ جولائی ۱۹۷۳
والدین	انصاری خورشید احمد محمد بشیر سردار، عابدہ عبدالرحمان سردار
شرف تلمذ	حضرت آصفؔ بختیار سعید صاحب ابتدائے سخن: ۲۰۰۷
	(مشہور کمرشیل آرٹسٹ، ڈرامہ نگار، ادیب الاطفال، شاعرالاطفال ومزاح نگار)
تعلیمی لیاقت	ماسٹر آف ٹیکسٹائل ٹکنالوجی (فرسٹ کلاس) سال ۱۹۹۸
جامعات	سوامی راماناند تیرتھ مرہٹواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ
ملازمت	بطور پروڈکشن منیجر اور سینئر مارکیٹنگ منیجر
پیشہ	رئیل اسٹیٹ، لینڈ ڈیولپمنٹ
مقامات ملازمت	انقرہ (ترکی)، شارجہ ومصفی ابوظہبی (متحدہ عرب امارات)، کویت ومبئی۔
ادبی مشاغل	طنز ومزاحیہ مضمون نگاری، افسانہ نگاری، مقالہ نگاری، تنقید وتبصرہ، علمی وادبی مضامین نویسی
دیگر مشاغل	کلاسیکی موسیقی، گائیکی، مطالعہ، سیاحت، خطاطی وطغرہ نویسی
مستقل پتہ	۲۳۸، معاملتدار گلی، نیو وارڈ، مالیگاؤں 423203 (ناسک) مہاراشٹر
مواصلاتی روابط:	موبائل وواٹس اپ نمبر ۰۹۳۲۶۵۹۵۷۵۳

Shahzad.bakht@gmail.com, shahzad_bakht@yahoo.com

www.urduchannel.in

تصانیف

ہوئے جی کے ہم جو رسوا	مطبوعہ	مضامین طنز ومزاح وانشائیے	۲۰۱۲
نمک پاشیاں	مطبوعہ	مضامین طنز ومزاح وانشائیے	۲۰۱۵
ایک تبسم کیلئے	مطبوعہ	مضامین طنز ومزاح وانشائیے	۲۰۱۶
مردم گزیدہ	زیرترتیب	افسانوں کا مجموعہ	۲۰۱۸
لن ترانیاں	زیرترتیب	مضامین طنز ومزاح وانشائیے	۲۰۱۸
اٹکھیلیاں	زیرترتیب	مضامین طنز ومزاح وانشائیے	۲۰۱۷
شب نوردیاں (کلیات شب انصاری)	زیرترتیب	کلیات شبؔ انصاری	۲۰۱۷
تذکرۂ سخنوران مالیگاؤں	زیرترتیب	تاریخ تحقیق وترتیب	۲۰۱۷
زبان یارمن ترکی	زیرترتیب	ترکی کا سفرنامہ	۲۰۱۷

اعزازت وانعامات

"ہوئے جی کے ہم جو رسوا" 'مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ' برائے ۲۰۱۲

"ہوئے جی کے ہم جو رسوا" 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی' نے ۲۰۱۳ میں تھوک کتب خریداری اسکیم کے تحت دوسو کاپیاں خریدیں

'نمک پاشیاں' 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی' نے ۲۰۱۵' میں مسودے کیاشاعت کے لیے مالی تعاون فراہم کیاہے

'ایک تبسم کے لئے' 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی' نے ۲۰۱۶ میں مسودے کی اشاعت کے لیے مالی تعاون فراہم کیاہے

"قومی ایکتا ایوارڈ" مرہٹی روزنامہ "بالے قلعہ" کی سلور جوبلی کے موقع پر ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا

"سنمان پتر" ضلع پریشد تحتانوی مدرسہ، ایگت پوری نے پرادبی خدمات کے اعتراف میں عطا کیا

ریڈیائی نشریات

آل انڈیا ریڈیو (آکاش وانی) جلگاوں سے مزاحیہ مضمون خوانی ''زن مریدی''بتاریخ ۱۸ اگست ۲۰۱۵ء

مقالہ خوانی

''مادری زبان بطور ذریعۂ تعلیم واصلاحات'' بموقع یوم تعلیم ر ۲۰۱۳ زیر اہتمام انجمن ناموس ادب، مالیگاؤں

''اردو زبان کی نمو پر داخلی وخارجی عوامل کے اثرات''بموقع رسم اجرا کتب زیر اہتمام انجمن ناموس ادب

''اردو غزل پر مختلف تحریکات کے اثرات''بموقع رسم اجرا، سہ ماہی عکس ادب وسیمینار ومشاعرہ، اورنگ آباد

''ہندی صحافت کا عصبی رویہ''بموقع ماہانہ نشست ادارۂ نثری ادب، مالیگاؤں

''شخصیت سازی۔۔۔تربیت اطفال کا اہم جزو''بموقع ماماہانہ نشست ادارۂ ادب اسلامی، مالیگاؤں

'' موجودہ تعلیمی نظام کے تناظر میں اساتذہ کی ذمہ داریاں''بموقع ماماہانہ نشست ادارۂ ادب اسلامی، مالیگاؤں

''ڈاکٹر نخشب مسعود۔فن،شخصیت اور خدمات کا اجمالی جائزہ''بموقع رسم اجرا، وزیر اہتمام انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن آف انڈیا، مالیگاؤں

''جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے''ندا فاضلی کی خدمات پر مضمون بموقع ماماہانہ نشست انجمن ترقی پسند مصنفین، مالیگاؤں

انٹرنیٹ میں جکڑا ہوا انسانی معاشرہ اور ہماری تہذیب ہدیٰ ٹائمز کی اشاعت کے لئے خصوصی مضمون

مقامی ادبی انجمنوں سے وابستگی

ادارۂ نثری ادب،	انٹرنیشنل افسانچہ فاونڈیشن،	انجمن محبان ادب،
بزم سخن	انجمن ترقی پسند مصنفین،	انجمن ارتقائے ادب،
ادارہ ادب اسلامی،	انجمن ناموس ادب	اسکس لائبریری
اردو لائبریری	فنکار اکیڈمی	

بینک کی تفصیل

SHAHZAD BAKHT KHURSHEED AHMED ANSARI

BANKER: DENA BANK BRANCH: MALEGAON CITY

A/C NO 004810027976 IFSC NO. BKDN 0520048

www.urduchannel.in

کلیات شب انصاری
شب نور دیار